عصری علوم
شرعی حیثیت وفضیلت
مسلمان ماہرینِ فنون، واقعات وکارنامے
مفتی محمد ابوبکر جابر قاسمی
مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی
Faisal

عصری علوم ۔ مسائل اور حل

روحانیات و مادیات کا موازنہ، مروجہ سائنس کی تباہ کاریاں، علم کا حقیقی مفہوم، حکم ''اقرأ'' کا پیغام، عصری علوم کا شرعی مقام، لڑکیوں کی عصری نصاب و نظام میں مطلوبہ تبدیلیاں، مسلم قضاۃ، اُطباء اور سائنسدانوں کے کارنامے اور ان کے دینی رجحانات و انسانیت نوازی ، امانت و دیانت کا مفصل و ایمان افروز تذکرہ

مصنّفین

مفتی ابوبکر جابر قاسمی

مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی

ناشر

مدرسہ خیر المدارس، بورابنڈہ، حیدرآباد

پہلا ایڈیشن: ۱۴۳۵ھ = ۲۰۱۴ء

نام کتاب : عصری علوم - مسائل اور حل

مصنّفین : مفتی ابوبکر جابر قاسمی، 09885052592
مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی، فون: 09542235137

صفحات : 410

کمپوزنگ : حافظ محمد حسام الدین حنیف، فون: 07386561390

تصحیح وسیٹنگ : قبا گرافکس، حیدرآباد، فون: 09704172672

ناشر : مدرسہ خیر المدارس، بورابنڈہ، حیدرآباد

ملنے کے پتے

- مدرسہ خیر المدارس، بورابنڈہ، حیدرآباد، فون: 040 - 23836868
- دکن ٹریڈرس، پانی کی ٹانکی، مغلپورہ، حیدرآباد، فون: 040 - 66710230
- فضل بک ڈپو، جامع مسجد ملے پلی، حیدرآباد، فون: 9440039231 - 40 91+
- ہندوستان پیپر ایمپوریم، مچھلی کمان، حیدرآباد، فون: 040 - 66714341
- ہُدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، پرانی حویلی، حیدرآباد، فون: 040 - 24514892
- مکتبہ کلیمیہ، یوسفین ویڈنگ مال، نامپلی، حیدرآباد

فہرست مضامین

عصری تعلیم
اسلامی نقطۂ نظر

عصری تعلیم کا نظام ونصاب

مسلم سائنسدان اور ان کے امتیازات وخصوصیات

مسلمان اطباء اور ان کے کارنامے

مسلم قضاۃ کے عادلانہ فیصلے

مسلمان حکمرانوں اور قضاۃ کے دیگر عدل گستری اور صدق وامانت کے واقعات

مسلم سائنسدانوں کے کارنامے

علم فلکیات میں مسلمانوں کے کارنامے

علم ریاضی میں مسلمانوں کے کارنامے

انجنیئرنگ میں مسلمانوں کے کارنامے

عظیم مسلمان فلاسفر

کلماتِ تحسین

حضرت الاستاذ جامع المنقول والمعقول مفتی عبداللہ صاحب مظاہری دامت برکاتہم
بانی ومہتمم جامعہ مظہر سعادت ہانسوٹ، ضلع بھروچ، گجرات

Estd. 1405 A.H. / 1985 A.D. Regd. No. B-914
التأسیس: ١٤٠٥ھ/١٩٨٥م - رقم التسجیل: B/٩١٤

جامعۃ مظہر السعادۃ ہانسوٹ
JAMIAH MAZHAR-E-SA'ADAT
HANSOT-GUJARAT
DARUL ULOOM
HANSOT

از: مفتی عبد اللہ المظاہری
۲۲/ جمادی الاولیٰ / ۱۴۳۵ھ
۲۴/ مارچ / ۲۰۱۴ء

محترمی مفتی ابوبکر ومفتی رفیع الدین صاحبان زید مجدہما!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

بعد تسلیمات! امید ہے کہ مزاج گرامی بعافیت ہوگا!

قال اللہ تعالیٰ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس - امت مسلمہ خیر امت ہے جو لوگوں کیلئے برپا کی گئی ہے - اس امت کا امتیاز یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی اس شان کو ہر میدان ومجال میں قائم رکھا ہے - عدلیہ وقضاء ہو کہ فلسفہ وحکمت ہو، فن طب، علاج ومعالجہ ہو، سائنس وٹیکنالوجی ہو، فن تعمیر، ہندسہ وفنون ریاضی ہو - تاریخ کے اوراق میں مسلمان ہی رہبر ورہنما، قائد وسالار نظر آتے ہیں - قیادت وسیادت میں آگے مسلمان ہی رہے ہیں - دیگر امتیں مسلمانوں کی خوشہ چیں اور رہین منت رہی ہیں - اس یادِ ماضی کو یادِ رفتگاں کی شکل میں اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے "وذکر فان الذکری تنفع المؤمنین"

بقول علامہ اقبال: ؏ تھے تو وہ آباء تمہارے ہی مگر تم کیا ہو - ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا ہو۔

اسلام کسی بھی علم کے حصول کا مخالف نہیں ہے - اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا "الحکمۃ ضالۃ المؤمن حیث وجدھا فھو احق بھا" بس اسلام حدود وقیود متعین کرتا ہے - جو ضروری بھی ہے -

عصری علوم مسائل وحل "یہ کتاب نوجوانانِ اسلام کیلئے عبرت وسبق بھی ہے - فخر وتشکر بھی ہے - اور بننے بنانے کا نسخہ بھی ہے - احساس عمل پیدا ہو جائے، غیرت وحمیت کے ساتھ نوجوان اپنا مستقبل روشن کرنے کیلئے کمر کس لیں تو کام بنے ؏ عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں - نظر آتی ہے انکو اپنی منزل آسمانوں میں

ص ۲۰۲ شیخ حسین میں نیچے تحریر ہے سو سال کی عمر میں تمام مروجہ علوم سے فراغت حاصل کی - تصحیح فرمائیں -
ص ۲۰۳ تصنیف وتعلیم کو شغل بنایا - تصنیف کے ساتھ تالیف کا جوڑ ہے -
ص ۲۰۴ کا اندازہ اس سے پندرھویں صدی میں - تصحیح کرلی جائے - والسلام

اللہ تعالیٰ کتاب کو مقبولیت عطا فرمائے - مرتبین کو جزائے خیر عطا فرمائے - آمین

الداعی
عبد
(مفتی) عبد اللہ المظاہری
۲۲/ جمادی الاولیٰ / ۱۴۳۵ھ ۲۵/ ۳/ ۱۴ بسیر

At & Po **Hansot**, Dist. Bharuch, **PIN** : 393 030 Gujarat (India) **Tel** : +91-2646-262 050 / 262 031
Fax : +91-2646-262927 **E-mail** : muftipatel@yahoo.com **Website** : saadathansot.com
જામિઆ મઝહરે સઆદત હાંસોટ
ડી.ભરૂચ-ગુજરાત.૩૯૩૦૩૦.(ઇન્ડિયા)

محترمی مفتی ابوبکر ومفتی رفیع الدین صاحبان زید مجدکما

السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته

بعد تسلیمات ! امید ہے کہ مزاج گرامی بعافیت ہوگا !

قال اللہ تعالیٰ "كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ" (سورۃ آل عمران:۱۱۰)۔امت مسلمہ خیر امت ہے جولوگوں کے لئے برپا کی گئی ہے۔اس امت کا امتیاز یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی اس شان کو ہر میدان ومجال میں قائم رکھا ہے، عدل وقضاء ہو کہ فلسفہ وحکمت ہو، فن طب، علاج ومعالجہ ہو، سائنس وٹیکنالوجی ہو، فن تعمیر، ہندسہ وفن ریاضی ہو، تاریخ کے اوراق میں مسلمان ہی رہبر وقائد وسالار نظر آتے ہیں۔قیادت وسیادت میں آگے مسلمان ہی رہے ہیں۔دیگر امتیں مسلمانوں کی خوشہ چیں اور رہین منت رہی ہیں۔اس یاد ماضی کو یادِ رفتگاں کی شکل میں اس کتاب میں پیش کیا گیا......"وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَىٰ تَنفَعُ الْمُؤْمِنِينَ" (نصیحت کیجئے، نصیحت کرنا مومنین کے لئے نفع بخش ہوتا ہے)، بقولِ علامہ اقبال:

تھے وہ آباء تمہارے ہی مگر تم کیا ہو
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا ہو

اسلام کسی بھی علم کے حصول کا مخالف نہیں ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: "الحكمة ضالة المؤمن حيث وجدها فهو أحق بها" ......بس اسلام حدود وقیود متعین کرتا ہے، جو ضروری ہے۔

''عصری علوم مسائل وحل'' یہ کتاب نوجوانانِ اسلام کے لئے عبرت وسبق بھی ہے، فخر وشکر بھی ہے اور بننے بنانے کا نسخہ بھی ہے، احساسِ عمل پیدا ہوجائے، غیرت وحمیت کے ساتھ نوجوانانِ اسلام اپنا مستقبل روشن کرنے کے لئے کمر کس لیں تو کام بنے۔

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

اللہ تعالیٰ کتاب کو مقبولیت عطا فرمائے۔مرتبین کو جزائے خیر عطا فرمائے۔آمین۔

۲۲/جمادی الأولی/۱۴۳۵ھ، پیر (مفتی) عبداللہ المظاہری

مقدمہ

حضرت مولانا سید احمد ومیض ندوی صاحب دامت برکاتہم

دور حاضر میں عصری تعلیم کی ضرورت وافادیت سے کس کو انکار ہوسکتا ہے، صنعت وحرفت اور اقتصاد ومعیشت میں ترقی عصری تعلیم کے بغیر ممکن نہیں، نیز مختلف عصری میدانوں میں باصلاحیت افراد کی فراہمی بھی اس کے بغیر ممکن نہیں، موجودہ سائنس وٹکنالوجی کی حیرت انگیز ترقی کے دور میں عصری تعلیم سے دوری نے مسلمانوں کو ہر شعبۂ زندگی میں غیروں کا دست نگر بنا کر رکھ دیا ہے، ملتِ اسلامیہ کو قابل اور باصلاحیت ڈاکٹروں کی ضرورت ہے اور قانون کے ماہر وکلاء کی بھی، تعلیمی میدان میں کام کرنے کے لئے مسلمان ماہرین تعلیم درکار ہیں اور مختلف علوم وفنون ہی پیشہ وارانہ صلاحیت کے حامل عظیم اسکالر ہیں، امتِ مسلمہ اپنی ہمہ جہت ترقی کے لئے ماہرین معاشیات کی بھی محتاج ہے اور سائنس وٹیکنالوجی پر عبور رکھنے والے افراد کی بھی، الغرض امتِ مسلمہ کے عصری علوم کی ضرورت ایک مسلم حقیقت ہے، جس سے انکار نہیں اور علماء امت نے مسلمانوں کو عصری علوم کی تحصیل سے بھی منع نہیں کیا اور نہ انہیں شجرِ ممنوعہ قرار دیا؛ البتہ عصری علوم کے ساتھ آنے والے الحاد وبے دینی اور مخلوط نظامِ تعلیم کے اثراتِ بد سے ضرور آگاہ کیا ہے۔

گذشتہ نصف صدی کے عرصہ میں امتِ مسلمہ میں عصری تعلیم کے تعلق سے جو غیر معمولی شعور بیدار ہوا ہے، اس سے انکار ممکن نہیں؛ لیکن اس کے ساتھ عصری تعلیم اور مغربی ثقافت کے تعلق سے مرعوبانہ ذہنیت میں بھی اضافہ ہوا ہے، عصری علوم سے مرعوبیت کے جہاں اور اثرات مرتب ہوتے ہیں وہیں ایک اثر یہ ہوا کہ قرآن وحدیث

میں جہاں کہیں علم اور اہل علم کی فضیلت وارد ہوئی ہے، عصری تعلیم کو اس کا مصداق قرار دیا جانے لگا اور تمام آیتوں کو جو خدا کی معرفت تک پہنچانے والے حقیقی علم کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہیں عصری علوم پر منطبق کیا جانے لگا، اسکولوں اور عصری تعلیم گاہوں کے پروگراموں میں فضیلتِ علم پر دلالت کرنے والی آیتیں دھڑلے سے پڑھی جان لگیں اور اس بے باکی سے ان کا استعمال ہونے لگا گویا وہ آیات اس کے خاطر نازل ہوئی ہیں، قرآن وحدیث عصری علوم کے مخالف نہیں ہیں؛ لیکن آیاتِ قرآنیہ اور احادیث نبویہ کی من مانی تشریح یا انہیں ان کے حد درجہ مرعوب اس قسم کی من مانی تشریحات پر اصرار کی حد تک زور دیتا ہے، یہ طبقہ جب علماء کرام سے تبادلہ خیال کرتا ہے تو یہ تأثر دینے کی کوشش کرتا ہے کہ علماء نے عصری تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کرنے والی آیات کا مطلب سرے سے سمجھا ہی نہیں، اس طبقہ کے افراد اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لئے بالعموم آیاتِ قرانیہ کو ان کے سیاق وسباق سے کاٹ کر پیش کرتے ہیں مثلا خواندگی تعلیم کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ قرآن کی سب سے پہلی وحی کا آغاز ''اقراء'' سے ہوا؛ لیکن آیت کے آگے ٹکڑے ''باسم ربك الذی خلق ''کو بالکل نظرانداز کردیا جاتا ہے، جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ مطلق علم قابل ستائش نہیں؛ بلکہ وہ علم لائق حوصلہ افزائی ہے جو رب کے نام کے ساتھ مربوط ہو، قرآن وحدیث میں علم نافع کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے، نبی رحمت ﷺ کی منجملہ دعاؤں میں ایک دعا یوں ہے'' اللھم إنی أسئلك علما نافعا ''اے اللہ! میں آپ سے علم نافع مانگتا ہوں، آپ نے ''غیر نافع'' علم سے پناہ مانگی ہے، چنانچہ آپ ﷺ پوری دعا یوں فرماتے'' إنی أعوذ بک من علم لاینفع'' میں ایسے علم سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں جو نفع نہ پہنچاتا ہو، انسانیت کے لئے حقیقی معنی میں وہی علم نافع ہوسکتا ہے جس کے ساتھ رب کا نام جڑا ہوا ہو، ورنہ نرا علم جو وحی الٰہی کی روشنی سے محروم ہو انسانیت کے لئے تباہی کے سوا کچھ نہیں، مغربی مما لک نے وحی الٰہی کی روشنی سے محروم ہو کر انسانیت کی تباہی کے سوا کچھ نہیں کیا، مغربی مما لک نے وحی الٰہی سے بے نیاز ہو کر علم میں ترقی کی تو آخر ان کے علوم نے پوری انسانیت کے لئے ایسے تباہ کن ہتھیاروں کی

سوغات پیش کردی جو لمحوں میں ساری دنیا کو تہس نہس کر کے رکھ دیتے ہیں، قرآن مجید ان اصحابِ علم کی دھجیاں بکھیرتا ہے جن کے علم کا مقصد محض چندروزہ دنیوی زندگی ہو، ارشاد ربّانی ہے:

"فَأَعْرِضْ عَن مَّنْ تَوَلّٰی عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ○ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ" (۱)

''آپ ان پر توجہ نہ دیں جو ہماری یاد سے منہ پھیرتے ہیں اور بس دنیوی زندگی کی چاہت میں لگے ہوئے ہیں، یہی ان کے علم کی رسائی ہے''

جو علم انسان کو صرف چندروزہ دنیا میں جینے کے اسباب کی رہنمائی کرتا ہے، قرآن اسے ظاہری علم سے تعبیر کرتا ہے، ارشاد ہے: "وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ○ يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا" (۲) لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں، یہ بس دنیوی زندگی کے ظاہری پہلو کو جانتے ہیں، قرآن حقیقی اہل علم ان لوگوں کو قرار دیتا ہے جن کا دل خشیتِ الٰہی سے معمور ہوتے ہیں، ارشاد ہے:" إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ" (۳) اللہ سے اس کے بندوں میں سے اہل علم ہی ڈرتے ہیں، یہ آیت واضح طور پر دلالت کرتی ہے کہ اسلام کا مطلوب علم وہ ہے جو انسان کے قلب میں خشیتِ الٰہی اور خوفِ خداوندی پیدا کردے، قرآنی نقطۂ نظر سے علم کی بنیاد اور اس کا محور اللہ رب العزت کی ذات ہے، چنانچہ قرآن صاف اعلان کرتا ہے"فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ"(۴) اس علم کو دل میں بٹھالو کہ اللہ کے علاوہ کوئی لائق عبادت نہیں۔

اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ علماء، محققین وائمہ مفسرین کی تحقیقات کے حوالہ سے قرآن وحدیث میں ذکر کئے علم کے حقیقی مصداق کو واضح کیا جائے، اس سلسلہ میں ہونے والے مغالطوں کا ازالہ کیا جائے، اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے مفتی ابوبکر جابر قاسمی ومفتی رفیع الدین حنیف قاسمی کو کہ علمی اور تحقیقی کاموں کا حوصلہ رکھنے والے ان

---

(۱) النجم:۲۹-۳۰ (۲) الروم:۶-۷

(۳) الفاطر:۲۸ (۴) محمد:۱۹

نوجوان فضلا نے اس طرف توجہ فرمائی اور کتاب وسنت کے نصوص اور ائمہ تفسیر وحدیث کی تشریحات کے حوالہ سے مسئلہ کو بے غبار کردیا، قریب ۴۰۰ صفحات پر مشتمل زیر نظر کتاب میں اس تعلق سے جو کچھ مواد اکٹھا کیا گیا ہے، اس مسئلہ سے متعلق کسی قسم کی تشنگی نہیں رہتی، کتاب میں مسلمان سائنس دانوں کی علمی خدمات پر خوب روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ موجودہ دور میں یورپ جس سائنس وٹیکنالوجی پر ناز کرتا ہے، اس کے اصل بانی ہمارے اسلاف ہیں، دورِ حاضر میں سائنسی ترقی اور بے دینی کو لازم وملزوم سمجھ لیا گیا ہے اور یہ تأثر دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ دین کے تقاضوں کی پاسداری کرتے ہوئے عصری علوم میں ترقی ممکن نہیں، فاضل مؤلفین نے اس مفروضہ کو بھی غلط ثابت کیا ہے، دونوں نوجوان فضلاء تصنیف وتالیف کے میدان میں نو وارد نہیں ہیں، اس سے قبل بھی ان حضرات کی کئی ایک وقیع علمی کتابیں اشاعت پذیر ہوکر علمی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کرچکی ہیں، امید ہے کہ ان کی اس کتاب کو بھی قبولِ عام حاصل ہوگا، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جواں سال مفتیان کرام کے علم میں مزید برکت عطاء فرمائے اور ان کے علمی کاموں کا سلسلہ اسی طرح جاری وساری رہے۔ آمین یا رب العالمین .

۲۹ / ربیع الأول / ۱۴۳۵ھ

۲۰۱۴/۱/۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلی بات

موجودہ زمانہ میں امتِ مسلمہ کی اٹھانوے فیصد نسل کالجوں اور اسکولوں میں زیرِ تعلیم ہے؛ ظاہر ہے کہ ہمیں اپنے اسکول قائم کرنا چاہئے اور کررہے ہیں؛ لیکن یہ کام بہت زیادہ حساس اور نزاکت کا حامل ہے، ایک طرف یہ تقاضا ہوتا ہے کہ عصری تعلیم معیاری ہو، دوسری طرف تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ حدودِ شریعت کی پامالی نہ ہو اور مغربی نظامِ تعلیم اور اسلام مخالف عقائد ونظریات کے جراثیم منتقل نہ ہونے پائیں، یہی وجہ ہے کہ اسکولی میدان میں بہت کم لوگ ہیں جو اس سلسلہ میں کامیاب ہیں، یہ معنوی تحریف ہوتی جارہی ہے کہ علمِ الٰہی، علمِ قرآن وحدیث کے معانی کو عصری فنون پر چسپاں کیا جارہا ہے اور خود عصری علوم سے متعلق شرعی فضائل، فقہی مقام بتلانے والا مواد اوجھل ہوتا جارہا ہے، اسکول وکالجس کے منتظمین اور بعض جگہوں پر اس کے سرپرست علماء کرام کو یاددہانی کی ضرورت ہے کہ نصاب ونظام میں کہاں کہاں احکامِ شریعت کو ذبح کیا جارہا ہے، ایسے طریقۂ کار اور حل کو تلاش کرلیا جائے جس سے معیارِ تعلیم بھی باقی رہے اور اوامرِ الٰہی بھی نہ ٹوٹیں، اس سلسلہ میں جو تجربات عالمی سطح پر ہوئے ہیں اس سے انہیں آگہی ہو، ورنہ دیکھا گیا کہ ہر آدمی اپنے اسکول کو ازسرِ نو تختۂ مشق بنارہا ہے۔

۱۔ نظام اسلامی کے ساتھ نصاب کو بدل دیا جائے اور دین ودنیا کے علم کی تعریف ختم کردی جائے ''وحدتِ علم'' اولین دور کی طرح عالم اور وکیل، عالم اور ڈاکٹر، عالم اور سرکاری ملازم پیدا کئے جائیں۔

۲۔ نصابِ تعلیم تو مروجہ ہو یا اس کو بتدریج اسلامی مزاج کے ساتھ تدوین کیا جائے؛

لیکن خالص عصری فنون سائنس، انگلش، جغرافیہ، ریاضی کے ساتھ دینیات کی تعلیم بھی نصاب کا لازمی حصہ بنایا جائے، البتہ ماحول نہایت دینی ہو۔

۳۔ کالجوں اور یونیورسیٹیوں میں پڑھنے والے بچوں کے لئے دینی اقامت گاہوں کو قائم کیا جائے، ایسے ہاسٹل تعمیر کئے جائیں یا کرایہ پر لئے جائیں، جہاں کوئی مربّی عالم دین ان طلبہ کا نگران ہو۔

مسلمانوں کی ترقی کا اصل راز ایمان وعمل ہے؛ لیکن مادّی فنون سے انہوں نے صرفِ نظر نہیں کیا، اس کے بعد ایمانی صفات بھی مضمحل ہوگئے، پھر سائنس وٹکنالوجی کی طرف سے توجہ ہٹ گئی، مغرب نے سیاست وتعلیم، معاشیات وتمدن پر بالادستی حاصل کرلی، یہ انقلاب خیر سے شر کی طرف تھا، اس سے انکار نہیں کہ ان کی ترقیات حیران کن، محیّر العقول ہیں، مسلمان سائنسدان، اطباء، قاضی جتنے خدا ترس، انسانیّت نواز، با اخلاق تھے، اتنے ہی مغربی اقوام خُدا ناترس، معدہ پرست، خود غرض ہیں، آج ہمارے نوجوان کو یہ مسلم اطبّاء، قاضیوں کی صفات اور بلند کردار کو جاننے کے ساتھ موجودہ مغربی نظریات کی ہر اعتبار سے تباہ کن ہونا سمجھنا ضروری ہے، ان ہی سب عناوین پر بڑی عرق ریزی سے مواد جمع کیا گیا ہے، احقر کو خوشی ہے کہ حضرت الاستاذ جامع المنقول والمعقول مفتی عبداللہ صاحب مظاہری دامت برکاتہم بانی ومہتمم جامعہ مظہر سعادت ہانسوٹ، ضلع بھروچ، گجرات کی ہمت افزائی شامل حال رہی اور میرے رفیق درس وتدریس مولانا مدثر حسین رضوان صاحب قاسمی باریک بینی کے ساتھ تصحیح فرمائی۔ اللہ جلّ جلالہ اپنے فضل سے قبول فرمائے۔

ابوبکر جابر قاسمی

استاذ مدرسہ خیر المدارس، بورابنڈہ، حیدرآباد

۸ر جمادی الاولی ۱۴۳۵ھ

۷ر مارچ ۲۰۱۴ء

ذیل میں ذکر کردہ اقتباس جس میں اسلام اور سائنس کا موازنہ کیا گیا ہے، آگ، پانی، ہوا اور دل وروح کی تاثیر کو بتلایا گیا ہے، یہ حضرت محمد قاری طیب صاحب علیہ الرحمہ کی کتاب ''مذہب اور سائنس'' کی تلخیص ہے، اگرچہ بحث دقیق ہے؛ لیکن اہل علم کے لئے بہت زیادہ مفید ہے، مادیات کا تاثر اور مرعوبیت کا خاتمہ ہوجاتا ہے، اگر آدمی اس مضمون کو سنجیدگی سے سمجھ لے۔

سائنس کا خلاصہ عناصر اربعہ

سائنس دراصل یہ عناصر اربعہ (آگ، پانی، ہوا، مٹی) کے امتزاج واختلاط، ان کے آثار وخاصیات کا عملاً رل مل جانا اور کیمیاوی طریق پر ان کی تخلیق وترکیب کے تجربات سے ہی سائنس کا وجود ہوتا ہے، نئ نئ اشیاء اور ایجادات پردۂ ظہور میں آتی ہیں، گویا پوری سائنس اور سائنس کی یہ رنگ برنگی تعمیرات اور نت نئ ایجادات اور محیّر العقول اور حیرت انگیز چیزوں کا ظہور یہ انہیں عناصر اربعہ کا کھیل ہے۔

عناصر اربعہ کی خصوصیات

پھر یہاں یہ سمجھنا ہے کہ عناصر اربعہ کی خصوصیات کیا ہیں؟ اور کس کو کس پر کس قدر تفوّق وبرتری حاصل ہے؟ اور وجہ برتری کیا ہے؟ ذرا غور فرمائیں تو محسوس ہوگا کہ ان چاروں عنصروں کے خواص وآثار اور ذاتی عوارض یکساں نہیں، بلکہ ان میں بڑی حد تک تفاوت اور فرق ہے، نہ صرف عوارض وآثار میں فرق ہے، بلکہ خود ان کی جوہری طاقتیں بھی ایک درجہ کی نہیں ہیں، ان میں کوئی عنصر ضعیف ہے، کوئی قوی تر ہے اور کوئی اقوی تر ہے، ان کی طاقت کا اصل منبع ان کی لطافت ہے، جس عنصر میں جس قدر لطافت ہوتی ہے، اسی قدر اس کی طاقت بڑھتی ہے، جس قدر لطافت کم ہوکر کثافت آتی ہے تو اس عنصر میں کمزوری آتی ہے۔

خاکی عنصر

عناصر اربعہ میں سب سے کثیف عنصر مٹی ہے، یہ نہ صرف کثیف ہے، بلکہ کثافت آور بھی ہے، ساری چیزوں میں اگر کثافت اور غلاظت آتی ہے تو اس مٹی کے بدولت آتی ہے، آگ نے آج تک کسی بھی چیز کو گندہ نہیں کیا، ہاں یہ ضرور ہے کہ کسی چیز کے آگ

پر پکانے سے اس چیز میں غلظت آتی ہے، یہ غلظت آگ کی وجہ سے نہیں ؛ بلکہ آگ اس کا جو ہر لطیف کھینچ لیتی ہے، اصل مادۂ غلیظہ باقی رہ کر نمایاں ہوتا ہے۔

اسی طرح پانی کسی چیز کو بھی گندہ نہیں کرتا، بلکہ اس سے کدورت اور غلاظت صاف ہوتی ہے، اس کی اصلیت پاکی اور صفائی ہے۔

ہوا بھی کسی چیز کو مکدّر نہیں کرتی، یہ الگ بات ہے کہ ہوا میں غیر محسوس طور پر اجزائے ارضیہ رلے ملے چلے آتے ہیں، اور کسی چیز کو مکدر کر دیتے ہیں...... یہ اس قدر کثیف اور کمزور ہے کہ ہوا اسے اڑائے پھرتی ہے، پانی اسے بہالے جاتا ہے، آگ اسے جھلسا دیتی ہے، مگر آگ ذرا زور نہیں دکھاتی، یہ زمین رات ودن روندی جاتی ہے مگر چوں تک نہیں کرتی۔

ہاں البتہ زمین کا ایک جزو پہاڑ ہے جن کی مٹی اور ریت نے بنسبت غبار اور مٹی کے صفائی اور ستھرائی قبول کر کے کدورت اور غلاظت سے اپنے آپ کو دور کرلیا ہے، زنگ البتہ جھاڑ دیں تو بکھر جاتا ہے، پانی ڈالیں تو کیچڑ نہیں بنتا، پہاڑ اور اس کا مادہ اور اس کا غبار زمین کی بنسبت لطیف ہے اور طاقتور بھی ہے، زمین سے کہیں زیادہ اس میں شدت وصلابت ہے۔

پھر لوہا پہاڑوں کی بنسبت زیادہ شدید اور طاقتور ہے، اپنی لطافت کی وجہ سے، لوہے کے اجزاء میں پتھروں اور پہاڑوں کے اجزاء سے زیادہ صفائی اور ستھرائی ہوتی ہے، ریت اگر پانی میں پڑ جائے تو کس حد تک پانی کو مکدر کر دیتی ہے، لیکن لوہے کا یہ مادہ پانی میں ڈال دیں تو تب بھی اس کے دباؤ اور رفت وسیلان پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

لوہے کو صیقل کریں تو وہ چاندی کی طرح چمک اٹھتا ہے، لیکن پتھر اس قدر پالش اور صفائی کو قبول نہیں کرتا۔

آتشی عنصر (آگ)

لیکن یہی طاقتور لوہے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دیتے ہیں، اگر اس لوہے کو آگ میں جھونک دیں یا لوہار کی بھٹی میں ڈال دیا جائے تو اسکا یہ سارا زور ختم

ہوجاتا ہے، آگ پہلے اس کا رنگ روپ بدل دیتی ہے، پھراس کی ذاتی خصلت اور حقیقی صورت بھی برقرار نہیں رہ پاتی، آگ اس لوہے کے جگر تک کو رنگ آتش میں تبدیل کردیتی ہے، اس کو اگر لوہے کی بھٹی سے کچھ اور دیر کے لئے نکالیں تو وہ گل کر پانی کی طرح بہہ جاتی ہے، بہرحال لوہے کے مقابلے میں اسکی طاقت کا سرچشمہ بھی یہ آگ کی لطافت ہے، لوہا اگر کسی وقت صیقل کرنے سے چمکتا ہے تو آگ کی لطافت اس قدر ہے کہ آگ میں خود شعاعیں پھوٹتی ہیں، خود بھی روشن ہے اور تاریک چیزوں کو بھی روشن کرسکتی ہے، پھر صیقل شدہ لوہا جس کو آئینہ کہتے ہیں یہ اپنی صورت کی لطافت کے باوجود اس قدر ثقیل ہے کہ اس پر ہاتھ مارو تو وہ ٹکرا کر وہاں سے واپس آتا ہے، لیکن آگ کے جسمانی لطافت کا یہ عالم ہے کہ اس کے جسم سے لوہا آرپار ہوجائے، تب بھی اس کا جسم نہیں ٹوٹتا۔

آبی عنصر (پانی)

لیکن آگ کا یہ کروفر اور اس کا یہ رعب داب اس وقت تک ہے جب تک اس کے آس پاس پانی کا نام ونشان نہ ہو، اگر پانی کے چند قطرات بھی اس پر گریں تو آگ کا یہ کروفر ختم ہوجائے گا، بہرحال پانی کی طاقت آگ پر بھاری ہے، پانی کی طاقت کا سرچشمہ بھی اس کا لطیف جسم ہی ہے، پانی کی یہ صفت ہے کہ ہر چیز اس سے آرپار نکل جاتی ہے، یہ صفت آگ کو بھی میسر ہے؛ لیکن آگ کا چہرہ اتنا لطیف نہیں ہے کہ وہ اشیاء کے عکس کو بھی قبول کرے، مگر پانی عکس اور اصل دونوں کو اپنے اندر سموتا ہے، آگ کا اثر اگر اسے کسی محدود مکان میں روشن کیا جائے، اسی مکان کی چہار دیواری تک محدود رہے گا، لیکن پانی جس مکان میں محدود و مسدود رہے؛ بلکہ اس سے باہر اور دور دور تک اسکی نمود اور رطوبت کے آثار پھیلے ہوں گے، شہر کے اردگرد تالاب اور نہریں ہوتی ہیں تو آب وہوا ہی نہیں لوگوں کے مزاج تک مرعوب ہوجاتے ہیں، یہ سب اس کی لطافت کے کرشمے ہیں۔

عنصر ہوا

پانی جو آگ کو سرد کرتا ہے، ہوا کے سامنے بالکل عاجز وناتواں ہے، وہ چلتی ہوا میں سکون سے رہنا چاہے تو نہیں رہ سکتا، ہوا کے جھکڑ جب چلتے ہیں تو تالاب اور جھیلیں

ہی نہیں بڑے بڑے سمندر تہ و بالا ہو جاتے ہیں، ٹھہرا ہوا پانی ہے تو اسے خشک کر ڈالتی اور اُڑا دیتی ہے، اسکی طاقت کا سرچشمہ اس کے تمام عناصر کے مقابل لطیف وشفاف ہیں، اس کی لطافت کا یہ عالم ہے نگاہ جیسی لطیف چیز بھی اس کی لطافت کے سامنے کثیف ہے، جو اس پر جم نہیں سکتی اور ہوا کو دیکھ نہیں سکتی، پھر اسکے اثر کا یہ عالم ہے فوق تحت گوشہ کو، اور ایک ایک منفذ میں موجود جہاں آگ اور پانی نہیں پہنچ سکتے ذرا بھی کہیں خلا پیدا ہو جائے تو جانے میں اس کو دیر نہیں لگتی۔

انسان جامع العناصر

لیکن انسان ان تمام عناصر کا جامع ہے، وہ ان تمام عناصر پر غالب اور متصرف ہے، یہ تمام عناصر اپنی کارگذاری میں اسکے محتاج ہیں، عناصر کی ایک دوسرے کی نسبی طاقت جو ایک دوسرے کے مقابل ہونے سے کھلتی ہے، اپنے ظہور میں انسان کی محتاج ہے، لوہا خود بخود پتھر کو نہیں کچلتا پھرتا، آگ جگہ جگہ خود لوہے کو گرماتی اور پگھلاتی نہیں پھرتی، پانی خود بخود آگ بجھانے نہیں جاتا، ہوا کی یہ جزوی متضاد حرکات خود بخود نہیں جاتیں؛ بلکہ یہ سارے کام انسان کے کیئے ہوئے ہیں، وہی کدالیں بناتا ہے، پتھر توڑتا ہے، وہی بھٹیاں بناتا ہے اور لوہے کو تپاتا ہے، وہی مشکیزے اور ظروف میں پانی لاتا ہے اور چولہے ٹھنڈے کرتا ہے، وہی ہوا کو قید کرتا ہے اور سیالات کو اُڑاتا ہے۔

یہ عناصر کی مغلوبانہ کاروائی بہت حد تک انسان کے دست نگر ہے، اس لئے وہی ان سب عناصر پر غالب ہے۔

عناصر میں انسانی تصرفات وایجادات

نہ صرف یہ کہ انسان عناصر کی باہمی طاقتوں کے اجاگر کرنے کا سبب ہے؛ بلکہ یہ تمام طاقتیں بھی لے کر نتیجۂ تصرف وتسخیر میں جاتا ہے۔

زمین کا قلب وجگر چاک کر دیا، کنویں بنائے، راستے بنائے، تہہ خانے تیار کیئے، ارض معدنیات، سرمہ، ہڑتال، سونے چاندی، اور پیتل وغیرہ کے خزانے اس سے چھین لئے، پہاڑوں کو تراش کر تہہ بتہہ مکانات بنائے، پہاڑوں کی ٹھنڈی اور برفانی چوٹیوں کو

جہاں درندوں کو بھی پناہ نہ ملتی تھی اپنی بستی بنا کر ان میں سے راستے نکالے انہیں برما کر سرنگیں بنائیں، ان پر اپنی سواریاں دوڑائیں۔

پانی کو زمین کی تہہ میں سے کھوج نکالا، کنویں کھود کر ڈول اور رسی کے جال سے اسے پکڑ کر سینکڑوں فٹ نیچے سے اوپر کھینچ نکالا، دریاؤں کے ٹکڑے ٹکڑے کردیئے، نہروں اور نالیوں میں بہا کر کھیت سیراب کئے، مکانات بنائے، پی کر کلیجے ٹھنڈے کئے، جمنا اور گنگا ماری ماری جگہ جگہ پھرتی ہیں، اسے واٹر ورکس کے ذریعے گھر گھر رسوا کیا، پانی جیسا عنصر نلوں میں قید، ٹینکوں میں بند اسے انسان ۹۰، ۱۰۰ منزلہ مکانوں میں اوپر چڑھا لیجاتا ہے، اور پھر اسے پٹخ دیتا ہے، کبھی برف بنا کر اسے جما دیتا ہے، کبھی بھاپ بنا کر اڑا دیتا ہے، کبھی آگ دکھا کر اسے گرما دیتا ہے...... پانیوں کا سب سے بڑا گڑھ سمندر اعظم جسکی عظمت وہیبت کا یہ عالم ہے کہ وہ دنیا کے تہائی حصہ پر قابض ہے، جس پر کوہ پیکر موجوں کا لگا تار سلسلہ خشکی کے کناروں پر اس طرح حملہ آور محسوس ہوتا ہے کہ گویا ابھی کرۂ ارض کو لے کر جائے گا، لیکن یہ عظیم اور اتاہ سمندر بھی انسان کے دست و برد سے نہ بچ سکا انسان نے سمندر کے جگر چاک کر ڈالے اس میں جہاز چلائے، تار دوڑائے، آبدوز کشتیوں سے اسکی گہرائیوں پر قبضہ کیا، اس کے مدفون موتیوں کے خزانے اگلوائے، اس کی تہہ میں چھپی ہوئی چیزیں بازاروں میں بک رہی ہیں، خود سمندر کے نمک اور پانی کو بھی تحلیل کر ڈالا، نمک الگ کر دیا، رطوبت الگ......غرض اس سے عظیم اور ذلیل ہر طرح کے کام کئے جاتے ہیں، نجاستوں کا دھونا ظروف صاف کرنا، میلے کپڑے پاک کرنا وغیرہ، پانی عنصر انسان کے ہاتھ میں ایک غلام اور قیدی بنا ہوا ہے۔

آگ جیسے بھیانک اور خونخوار عنصر کو بھی اس نے اپنا غلام بنالیا، وہ لوہے اور پتھروں میں جا کر چھپتی ہے تو انسان لوہے اور پتھر کو رگڑ کر آگ کی مخفی چنگاریاں کھینچ لیتا ہے، وہ آفتاب میں چھپی ہے تو انسان آتشی شیشوں کے ذریعہ سے قید کرلیا، اور جب اسے خود چھپانے پر آیا تو اسے دیا سلائی کے سرے پر رتی برابر مسالہ میں قید کر دیا کہ جب چاہا دیا سلائی کا سر رگڑا اور اس قیدی کو باہر نکال لیا، غرض وہ آگ جو اپنا سر نیچے نہ کرتی تھی،

انسان کے سامنے تنکے چننے لگی، اس کی برتری اور بلندی خاک میں مل گئی، کہیں چولہوں میں انسان کی خدمت کرتی ہے کہیں انگھیٹیوں میں محبوس ہے، کہیں اسکا تزکیہ کیا تو گیس بنادیا جس کا دھواں سب ختم ہوگیا، غرض آگ عنصر بھی انسان کے ہاتھ میں کھلونا بن گیا۔

ہوا جو بہت زیادہ لطیف اور مخفی تھی جس پر انسان کی نگاہ تک فتح نہ پاسکتی تھی، مگر اس کی پردہ نشینی بھی انسان کی زد سے محفوظ نہ رہ سکی، ہوا کی فضا میں انسان کے جہاز اڑ رہے ہیں، اور ہوا اپنے کاندھوں پر انہیں سوار کرائے پھر رہی ہے، ہوا کیا ہے انسان کا ایک ہوائی گھوڑا جس پر اس نے بے لگام سواریاں کر رکھی ہے۔

فون انٹرنیٹ اور جدید مواصلاتی نظام بھی یہ ہوا کی لہروں پر موقوف ہے، گویا انسان کا پیغام رساں اور چٹھی رساں ہے، جو بلا اجرت یہ کام انجام دے رہا ہے، ادھر انسانوں کا پسینہ خشک کرنے کے لئے برقی پنکھوں کے سامنے ناچ رہی ہے، پھر انسان اس کے قید کرنے پر آیا تو اسے موٹروں کے پہیوں میں بند، سائکلیوں کے ٹائروں میں قید.....غرض یہ نادیدہ طاقت جس نے سمندر کو تہہ وبالا کر دیا تھا یہ انسان کے ہاتھ میں ایک قیدی بن کر رہ گئی۔

انسان نے نہ صرف ان عناصر کو ان کی حالت پر باقی رکھ کر ان سے کام لیا؛ بلکہ اپنی ایجاد کے جذبے سے اس نے عناصر کو باہم لڑا کر نئی نئی چیزیں پیدا کیں، پانی آگ کو اڑا دینا چاہتا ہے، دونوں کے غیظ وغضب سے انسان نے اسٹیم کی طاقت پیدا کی، انجن چل رہا ہے، مشینیں کام کر رہی ہیں، لاکھوں ٹن لوہا اس بھاپ کے مخفی طاقت پر ناچ رہا ہے، مِل چل رہے ہیں، مشینیں گھوم رہی ہیں، مشینوں میں غلہ اور زمین کی پیداوار پس رہی ہیں، گویا ساری کائنات چلی جارہی ہے، پھر پانی سے پانی کو ٹکرایا تو برقی اور بجلی پیدا کردی گویا پانی میں آگ لگادی، پھر یہ بجلی جو منٹوں سکنڈوں میں ملکوں میں خبر لے جاتی ہے، اسے تانبے اور جست کے ایک پتلے میں اس طرح باندھ رکھا ہے کہ وہ اپنے زور پر گرفت سے باہر نہیں جاسکتی، پھر ایک سوئچ میں اس کو ایسے مقفل کردیا کہ اسے نیچے ہلا دو تو بجلی آموجود اور اوپر اٹھادو تو غائب۔

پٹرول جیسی سیّال اور بہتی چیز میں آگ لگادی، آگ اور تیل لڑ رہے ہیں، جس

سے گیس پیدا ہوتا ہے، اور موٹریں، ہوائی جہاز اور کاریں چلتی ہیں......غرض اس انسان کی وجہ سے ساری کائنات کے ناک میں دم ہے۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندان مغرب
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغ کارزاری ہے

اصل انسانی طاقت روح

انسان کی اصل طاقت جس سے وہ عناصر اربعہ پر حکمرانی کرتا ہے، اس میں موجود عناصر اربعہ تو نہیں ہو سکتے، اس کے اندران عناصر اربعہ پر حکمرانی کرنے والی چیز اور غلبہ پانے والی قوت بلا شبہ ایسی ہونی چاہیے جو آگ اور پانی تو کیا، ہوا سے بھی لطیف تر ہو کہ ہوا جیسی غیر مرئی چیز کی ٹکر تو انسان کو محسوس ہوتی ہے، اس کی لطافت ایسی ہو کہ باوجود انسان کے رگ و پئے میں سمائے ہونے کے کبھی اسکا دھکا تک انسان کو نہ لگا ہو، وہ متصل تو انسانی جسم سے اس قدر ہو کہ اس کے بغیر اپنی ہستی قائم نہ رکھ سکے، منفصل اور الگ ایسی ہو کہ انسان کے کسی حصہ کی رسائی اس تک نہ ہو، وہ نہ صرف اپنے بدن پر بلکہ دنیا جہاں کے عناصر پر غالب ہے، ظاہر ہے کہ بدن کو چھوڑ کر انسان میں روح کے علاوہ کونسی ایسی چیز ہو سکتی ہے؟ روح کی طاقت کا اصل سرچشمہ بھی اس کی لطافت حسی اور نورانیت ہے۔

اگر صیقل شدہ آئینہ یا شفاف پانی صورتوں کا عکس اتار لیتا ہے تو انسان کی آنکھ کو روح نے ایسی چمک دے رکھی ہے جدھر اٹھ جاتی ہے تمام نقشے، فوٹو اپنے اندر اتار لیتی ہے، آئینہ کا فوٹو تو بے اصل ہے پشتِ آئینہ خالی ہے، لیکن آنکھ کا فوٹو بے اصل نہیں اس کے پیچھے یعنی جس میں اس کا پورا مصوّر عالم موجود ہے۔

اگر آگ سے تار شعاع پھیلتے تو آنکھ سے تارِ نگاہ منتشر ہوتے ہیں، تار شعاع سے تو چیز کی محض صورت آنکھوں کے سامنے روشن ہوتی ہے، تار نگاہ سے یہ سب چیزوں کے سامنے روشن ہوتی ہیں، جو ان کی حقیقت پر غور بھی کرسکتا ہے۔

اگر پانی اپنی لطافت اور باریکی سے اجسام میں نفوذ کر جاتا ہے سخت سے سخت جسم بھی اسکے سرایت کرنے سے نہیں بچتا تو روح بھی جسم کے رگ و پے میں سمائی ہوئی ہے حتی کہ سخت سے سخت ہڈیاں بھی اس کی تازگی کو لیے ہوئے ہیں، پانی اپنے سرایت کرنے سے اپنے محل کو محض ٹھنڈا کیئے رہتا ہے، روح اپنے دوران سے اپنے محل کو زندہ کیئے رہتی ہے۔

اگر ہوا غائب لطافت دکھائی نہیں دیتی تو روح بھی اپنی انتہائی لطافت کے آج تک دکھائی نہیں دی...... اگر عناصر کو حق تعالیٰ جزوی طور پر ایک دوسرے سے قوت دیا تو روح کو ان تمام عناصر کی مناسبت اور قوتیں یکجا حاصل ہیں، لہذا مادی طاقتوں پر روحانی طاقتوں کے فوقیت لے جانے کی یہی وجہ ہے کہ عناصر جزوی لطافتیں رکھتے ہیں اور روح ان تمام لطافتوں کی جامع ہے اگر عناصر اربعہ کو ذات خداوندی سے جزوی مناسبت ہے تو روح کو کلّی مناسبت ہے اوراس کے روحانی کمالات اصل ہیں۔

بہرحال اگر انسان آگ، پانی اور مٹی سے کہیں زیادہ قوی ہے تو وہ بدن کے بدولت نہیں کیوں کہ بدن ہی آگ اور پانی کا ایک مختصر سا مجموعہ ہے، یہ بے چارہ قلیل وحقیر بدن اپنے عظیم وکثیر مخزن پر کیسے غالب آسکتا ہے؟ بلکہ انسان کی یہ غیر معمولی قوت کا سرچشمہ اس کی روح ہے کہ روح کی لطافتوں کی کوئی حد نہیں۔

روحانی کمال اصل

لیکن ایک سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ روح نے اپنے باطنی کمالات صرف کرنے میں جس قدر بھی جدوجہد کی ترکیب وتحلیل کے ذریعہ آگ، پانی، ہوا، مٹی کے یہ جس قدر بھی عجائبات موالید ثلاثہ میں نمایاں کیئے، اس سے خود روح کو کیا نفع پہنچا؟ ہوائی جہاز اڑایا تو بدن کے لئے، روح جیسی لطیف چیز کو اڑنے کے لئے وزنی اور کثیف طیارہ کی کیا ضرورت؟ مرنے کے بعد نہ جانے وہ کہاں کہاں اڑتی ہے، اس طرح ریل اور موٹروں، اور ساری ایجادات کا نفع اگر ہوسکتا ہے تو صرف بدن کو نہ کہ روح کو، ریل وموٹر تو اپنی ایجاد میں روح کے محتاج، ریل وموٹر اگر منتقل کرسکتے ہیں تو بدن کو، برقی اور گیاس اگر ضیاء پاشی کرسکتے ہیں تو اجسام پر نہ کہ روح پر جن کے نور سے وہ خود ظہور رہے،

گراموفون، ٹیلی فون، موبائل انٹرنیٹ وغیرہ سے منتفع اگر ہو سکتے ہیں تو اجسام نہ کہ روح وہ اپنے پروردوں کی کیا محتاج ہو سکتی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ آگ پانی کی ایجادات کے ذریعے آگ پانی ہی کو نفع پہنچا؛ بلکہ بالفاظ دیگر آپ نے باہر کا آگ پانی لے کر اندر کے آگ پانی تک پہنچا دیا، اب روح کا یہ کام رہ گیا ہے کہ وہ اپنے علم وادراک کا سرمایہ آگ پانی پر خرچ کر رہی ہے، اور یہ بیرونی آگ پانی بدن کے آگ پانی کو دیتی رہی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ روح جو عناصر سے لطیف اور طاقتور تھی جوان پر حکمرانی کر رہی تھیں آپ نے دھوکا دے کر اسے جسم جیسے کثیف چیز یا بالفاظ دیگر عناصر کا غلام بنا دیا، یا یوں کہئے خود روح کو اسکی لطافت مٹانے میں استعمال کیا۔

اس کی مثال یوں ہے کہ ایک بادشاہ جس سے ملک وقوم کو بڑے بڑے منافع کی امید تھی جس کے حسنِ سیاست اور کمال تدبیر سے ملک کے رفاہ و بہبود کی ہزار ہا امیدیں وابستہ تھی، اسکے اس علم وفضل کے حامل ہونے کے باوجود ایک کمینے غلام کی باتوں میں پڑ جائے اور بادشاہ کو اپنے اغراض ومنافع میں استعمال کرنے لگے ملک کا پیٹ کاٹ کر اپنے تنور شکم بھرنے لگے، بادشاہ وزراء اور دیگر لوگوں کی باتوں پر اور ان کے نصائح پر بالکل توجہ نہ کرے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بادشاہ کی سلطنت چلی جائے گی، ملک وقوم پر دیوالیہ آ جائے گا اور خود یہ غلام اور بادشاہ سلطنت کے بدلنے کے قابل گردن زدنی ثابت ہوگی۔

روح بھی اس طرح ایک عالم فاضل فرماں روا ہے جس میں محسوسات، معقولات، واجزاء کے پاکیزہ ملکات ودیعت ہیں، جو نہ صرف کائنات بدن بلکہ کائنات دنیا پر بھی حکمرانی کر رہے ہیں، عقل اسکا وزیر اعظم اور نقل اسکا قانون ہے، ساتھ ایک کمینہ اور بذات اس کا خادم ہے جس کے واسطے سے اس کے شاہی احکامات جاری ہوتے ہیں، جس کو وزراء اور عمائدین روبہ عمل لاتے ہیں، وہ کمینہ خادم بدن ہے جو عناصر اربعہ محسود، کمینہ اس لئے کہ اس کے جو بھی اجزائے ترکیب ہیں سب بے شعور لایعقل جاہل اور بدتمیز ہیں، جس میں اچھے بُرے کی کوئی تمیز نہیں۔

کمینگی کا یہ عالم ہے کہ جواس سے زیادہ محبت کرے اسکا تقرب حاصل کرے اس کا سب سے زیادہ دشمن ہے۔

ایک انسان مٹی کی مورتیوں اور پتھروں کے وزنی بتوں کی ایک طویل مدت عبادت کرتا ہے، اگر وزنی مورت اوپر سے آگرے تو سب سے پہلے اس پجاری کا سر پھوڑے گی، اس کی وہ نہیں سنتی کہ یہ معاملہ میرے ساتھ نہ ہونا چاہیے تھا، دیگر غیر مقرب لوگوں کے ساتھ یہ برتاؤ ہونا تھا، اس طرح اگر کوئی شخص سینکڑوں برس دریا کے پانی کے سامنے ڈنڈوت کرے، ناک رگڑے، اور عابدانہ التماس کرے، لیکن جب بھی سیلاب کی رو آئے گی تو پہلے اسی کو غرق کرے گی جواس کے زیادہ قریب تر ہے، ایک مجوسی برسہا برس بھی اگر آتش کدہ میں سربسجود رہے، لیکن کبھی اس کی لپٹیں اسی مقرب کو پھونک دیں گی......آپ اس متمدن دنیا میں دیکھ رہے ہیں کہ جو زیادہ سے زیادہ مادیات کے عاشق ہیں وہی مادیات کے ہاتھوں تباہ ہو رہے ہیں، مشینوں کی لپٹ میں وہی زیادہ آتے ہیں جو رات دن مبتلائے عمل ہیں، ہوائی جہازوں سے وہی زیادہ تباہ ہوتے ہیں جوان سے زیادہ مقاربت اور مزاولت رکھتے ہیں، آلات جنگ، گیس، زہریلے ٹینک رائفل اور ریوالور سے وہی زیادہ ختم ہو رہے ہیں جوان کے عشق میں مبتلا ہیں۔

تعلیم پیر فلسفہ مغربی ہے یہ
ناداں جس کو ہستیٔ غائب کی ہے تلاش
پیکر اگر نظر سے نہ ہو آشنا تو کیا
ہے شیخ بھی مثال برہمن صنم تراش
محسوس پر بنا ہے علوم جدید کی
اس دور میں ہے شیشہ عقائد کا پاش پاش
مذہب جس سے آدمی کے تخیل کو ارتعاش

وہ روح جو کمالات ربانی کی حامل تھی، استغناء کی اعلیٰ شان رکھتی تھی، اور کسی کی محتاج نہ تھی وہ اپنے اس لایعقل ناسمجھ بدن کی محتاج ہوئی، وہ محل روح جس سے ان تمام

وسائل کا وجود تھا وہ اپنے ہر عمل میں خود ان وسائل کے ہاتھوں کھیلتی رہی۔

وہ روح جو کبھی مسجود ملائکہ بنی تھی اسباب کی غلام بنی اپنے ہی باندی اور غلاموں کو سجدہ کرنے لگی اور اس درجہ عناصر کی غلام ہوئی کہ اگر مادی وسائل اس کے ہاتھ میں نہ ہوں تو وہ بیکار اور اپاہج ہے۔

روح نے اپنی علمی طاقتوں سے مادہ منافع اور ایجادات کا ایک سلسلہ تو قائم کیا لیکن اپنے جوہری اور اصلی کمالات کو کھودی جو ہر دم اس کے ساتھ رہے گی وہ جنگل میں ہو یا شہر میں اسباب کے ہجوم میں اپنا جوہر دکھاتی لیکن یہ غلام روح اس قدر محتاجگی اور لاچارگی کی اس درجہ تصویر بنی کہ اگر شہر میں بجلی ہے تو وہ ریڈیو سے خبر دے سکتی ہے، ٹیلی ویزن اور ٹیلفون سے آواز پہنچا سکتی ہے، لیکن اگر بالکل جنگل و بیابان میں جہاں ان اسباب و وسائل کا دور دور تک پتہ نہیں یا شہر میں ہوا اور بجلی فیل ہو جائے یا دشمن آگے بڑھ کر تاروں کو کاٹ دے تو نکمی اور اپاہج ہے۔

روح کی طاقت تو وہ تھی جہاں بجلی نہ ہو، فون نہ ہو، اگر وہاں سے آواز لگائی تو وہ آواز مشرق سے مغرب تک پہونچ جاتی وہ اگر کسی بھی جگہ نقل وحرکت پر آتی تو جہاں ریل نہ ہو نہ موٹر نہ طیارہ تو سیکنڈوں میں ہزاروں میل کا فاصلہ طئے کرتی، اگر وہ دیکھنے پر آتی تو تنگ و تاریک کونے میں بیٹھ کر ساری دنیا کو ہی نہیں عرشِ عظیم تک کائنات کا معائنہ کرتی، زمین اسکے لئے سمٹ جاتی، ہوا اس کے لئے مسخر ہو جاتی، زمانہ اس کے لئے سمٹ جاتا، وہ سیرابی اور تری اور دریاؤں کے رحم وکرم کی محتاج نہ ہوتی، بلکہ دریا خود ہی اپنے پانی میں اس کے اشاروں کو دیکھتے، وہ جنگ وقتال میں لوہے اور ہتھیار کی محتاج نہ ہوتی، بلکہ جس چیز پر ہاتھ رکھ دیتی وہی اس کے لئے ہتھیار ہو جاتے، یہ مادی اور عنصری آلات اپنی طاقت اور لطافت پر یہ کام کر سکتے تھے تو روح نہ تو صرف ان لطافتوں کی جامع ہی تھی؛ بلکہ ان سے ہزار ہا گنا بڑھ کر تھی جو اپنے کسی کام میں وسائل کے محتاج نہیں، وسائل ہی اپنے وجود میں اس کے محتاج ہیں، آخر کیا وجہ ہے کہ بجلی تو پل بھر میں آسمانوں پر چڑھ جائے اور جو روح بجلی کو مسخر کرنے کی طاقت رکھے وہ زمین سے ایک انچ بھی کسی کی مدد کے

ذریعہ اوپر کو نہ اٹھ سکے؟ کیا وجہ ہے ٹیلیفون انٹرنیٹ کی رو تو ہزار ہا میل کی خبریں منٹوں میں لے آئے اور وہ انسان جو مشنریوں میں خود بجلی کی روح پھونکتا ہے ایک میل بھی ان وسائل کے بغیر اپنی آواز نہ پہنچا سکے۔

علامہ اقبالؔ نے سچ کہا ہے:

ڈھونڈ نے والا ستاروں کی گذر گاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم وپیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع وضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

روحانی طاقتوں کے محیّر العقول کارنامے

اسے کوئی خیالی بات یا محض علمی نظریہ نہ سمجھیں، روح جب بھی اصل فطرت پر چلی ہے تو اس سے بلا واسطہ اسباب ایسے ہی عجائبات کا ظہور ہوا ہے، اور اس نے مادوں سے اپنی غلامی کرا کرا نہیں اپنی روحانیت کے بل بوتے پر خوب نچایا ہے۔

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے منبر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر خطبہ پڑھتے ہوئے اچانک "یا ساریۃ الجبل" کی صدا مدینہ سے نہاوند کی پہاڑیوں تک عراق میں پہونچا دی حالانکہ اس وقت فون اور انٹرنیٹ کا زمانہ نہ تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مقامِ ابراہیم پر کھڑے ہو کر حج کی ندا لگائی تو وہ عالم کے گوشہ گوشہ میں گونجی؛ بلکہ ماؤں کے رحموں میں پرورش پا رہے بچوں کے کانوں میں بھی پہنچ گئی، حالانکہ وہاں کوئی مکبر الصوت آلہ نہیں تھا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آسمان کے ایک نئے دروازے کے کھلنے کی آواز زمین پر بیٹھے سنا جو کسی برقی آلہ کے ذریعہ نہیں تھا، آپ نے جہنم کے قطر میں ایک پتھر کے گرنے کا دھماکہ سنا جو ستر برس میں اس کی تہہ تک پہونچا تھا، یہاں کوئی آلہ نہیں تھا۔

حضور اکرم ﷺ نے حرم مکہ میں بیٹھ کر مسجد اقصیٰ کی محرابیں اور طاقیں دیکھ کر احد گن کر صحیح صحیح بتلا دیا؛ حالانکہ اس وقت دوربین کی ایجاد نہ ہوئی تھی۔

حضور ﷺ نے معراج کے موقع سے سارے آسمانوں کا سفر لمحوں میں طئے کیا؛ حالانکہ وہاں طیارہ تو کیا اس کا تصور بھی نہیں تھا، انبیاء علیہم السلام کے معجزات اولیاء رحمہم اللہ کے بے شمار کرامات جن میں مادی وسائل کا کوئی عمل دخل نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ روحانی طاقت زیادہ ہے مادی طاقت سے، اسی کو حدیث نبوی ﷺ میں فرمایا گیا:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

> ''جب اللہ تعالی نے زمین بنائی تو وہ حرکت کرنے لگی، چنانچہ اللہ نے پہاڑ بنائے اور انہیں حکم دیا کہ زمین کو تھامے رہو، فرشتوں کو پہاڑوں کی مضبوطی پر تعجب ہوا۔ تو انہوں نے عرض کیا: اے رب! کیا آپ کی مخلوقات میں پہاڑوں سے بھی سخت کوئی چیز ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہاں لوہا، عرض کیا ک لوہے سے زیادہ سخت بھی کوئی چیز ہے، فرمایا: ہاں آگ، عرض کیا: اس سے سخت؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا پانی، فرشتوں نے عرض کیا: اس سے سخت، فرمایا: ہوا، عرض کیا اس سے بھی سخت کوئی چیز ہے، فرمایا: ہاں اس سے بھی سخت ہے اور وہ ابن آدم ہے جو دائیں ہاتھ سے صدقہ کرتا ہو اور اس کے بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہوتی ہو'' (۱)

اعمال انسانی سے احوال عالم جڑے ہوئے ہوتے ہیں، مشینی ترقی سے احوال کا بدلنا یہ خدائی ضابطہ نہیں، احوال تو اعمال سے جڑے ہوئے ہیں، اعمال درست ہیں تو احوال بھی درست آئیں گے، اعمال خراب ہوں گے تو احوال بھی خراب ہوں، اس کا اندازہ اس حدیث سے لگایا جا سکتا ہے:

> ''عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالی عنہما سے روایت ہے کہ جو قوم غنیمت

(۱) ترمذی: باب، حدیث: ۳۳۶۹

کے مال میں چوری کرتی ہے تو ان کے دل بودے ہو جاتے ہیں، اور جس قوم میں زنا زیادہ ہو جاتا ہے ان میں موت بھی بہت زیادہ ہو جاتی ہے، اور جو قوم ناپ تول میں کمی کرتی ہے تو ان کی روزی بند ہو جاتی ہے، اور جو قوم ناحق فیصلہ کرتی ہے ان میں خون خرابہ زیادہ ہو جاتا ہے، اور جو قوم عہد توڑتی ہے ان پر دشمن غالب ہو جاتا ہے''(۱)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب مال غنیمت کو ذاتی دولت سمجھا جائے گا، امانت مال غنیمت بن جائے گی، زکوۃ ٹیکس سمجھا جانے لگے گا، علم کا حصول غیر دین کے لئے ہوگا، انسان اپنی بیوی کا مطیع اور ماں کا نافرمان ہو جائے گا، دوست کے ساتھ وفا اور باپ کے ساتھ بے وفائی کرے گا، مساجد میں آوازیں بلند ہونے لگیں گی، قبیلے کی سرداری فاسقوں کے ہاتھوں میں آجائے گی، ذلیل شخص قوم کا رہبر بن جائے گا اور کسی شخص کو اس کے شر سے ڈرتے ہوئے قابل تعظیم سمجھا جائے گا، گانے والی لڑکیاں اور گانے بجانے کا سامان رواج پکڑ جائیں، شراب پی جائے گی اور امت کے آخری لوگ گزرے ہوؤں پر لعن طعن کریں گے تو پھر وہ لوگ سرخ آندھی، زلزلے، خسف، چہرے کے بدلنے اور آسمان سے پتھر برسنے کے عذابوں کا انتظار کریں، اس وقت نشانیاں اس طرح ظاہر ہوں گی جیسے کسی پرانی لڑی کا دھاگہ ٹوٹ جائے اور (اس کے دانے) پے در پے گرنے لگیں''(۲)

عناصر اربعہ کے جبلی اخلاق

اگر ان عناصر اربعہ میں کچھ بھی شان استغناء ہو تو ان کی غلامی تھوڑی بہت اچھی لگتی، ان کی اصلی اور ذاتی صفت ہی محتاجگی اور محاویت ہے، اس کی غلامی سے استغناء کیا

---

(۱) مؤطا مالك : باب ما جاء فی الغلول ،حدیث:۵۹۲

(۲) ترمذی :باب ما جاء فی حلول علامة المسخ والخسف ،حدیث:۲۳۷۲

حاصل ہوتا؟ حاصل شدہ استغناء بھی فوت ہو جاتا ہے۔

چنانچہ مٹی ہی کو دیکھ لیں اسکی جبلی اور بنیادی خاصیت پستی اور معنوی باخلاق خاصیت قبض اور مخفی ہے، چنانچہ جو چیز بھی زمین میں رکھ دی جائے وہ اسے دبائے گی، اور جب تک اس کا جگر چاک کر کے اسے خود ہی نہ نکالیں نہ دے گی، اولاد آدم نہ جانے کتنے دفینے اپنے بطن حرص میں چھپائے رکھے ہیں، اس کا پیٹ چاک کر کے نکالے تو ٹھیک ورنہ خود اطلاع نہ ہوگی، اور جب یہی بخیل مادہ انسان کا جزو اعظم ہے اس لئے وہ مشت خاکی کہلایا۔

تو جبلی اور فطری طور پر نفس میں پہلا خلق بخل کا سرایت کر لینا ہے، چنانچہ پیدا شدہ بچہ کو ذرا ہوش آتا ہے تو وہ قبض اور بخل یعنی پینے اور ہضم کرنے کے لئے چیختا ہے، نہ کہ دینے اور ترک کرنے کے لئے، پس جبلی طور پر ایثار اور سخاوت کی طرف اس کی طبیعت ہوتی ہے، پھر بخل اور قبض حرص کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں، جو غلامی اور محتاجگی کی علامت ہے، غناء اور استغناء سے اسکا کوئی واسطہ نہیں چونکہ بخل اول تو اس چیز کا محتاج ہوا جس میں بخل ہو، پھر اس کا محتاج ہوا جس کی وہ چیز ہے، پھر اس کی عطا اور رہن کا بھی محتاج ہوا یہ خاکی انسان خاک میں رہتے ہوئے بخل کی خصلت میں مبتلا ہے، اگر اس میں بخل کے بجائے ایثار آ جائے تو اس کا فائدہ استغناء ہو گیا جو عزت کا باعث ہے اس میں دوسرے کی غلامی اور احتیاج نہیں۔

اسی طرح آگ کی خاصیت یہ ہے کہ سر نیچا ہی نہیں کرتی، ظاہر ہے انسان میں آگ کا بھی کافی حصہ رکھا گیا ہے، چنانچہ اس کی بدنی حرارت اور بخار کا ہیجان اس کی علامت ہے، اس لئے ہوش سنبھالتے ہی اس میں تعلیٰ، شیخی، اور انانیت کا جذبہ ابھرتا ہے، چنانچہ تعلیٰ اور شیخی سے مغلوب ہو کر اس میں غلیظ و غضب کی لہر دوڑ جاتی، اس کی رگیں پھول جاتی ہیں، اور چہرے میں آگ کی سرخی ہوتی ہے، تو اس میں بھی احتیاج اور ذلت ترفع اور بڑائی کے اظہار کے لئے دوسروں کی احتیاج اور ضرورت ہوتی ہے، اس ترفع اور بڑائی کا مدار دوسرں پر ہوتا ہے، اگر دوسرے نہ ہوں بڑائی نہ ہو، اس کے بالمقابل تواضع کی صفت ہے، جس کی حقیقت یہ ہوتی ہے کہ بلا مجبوری و پابندی محض اپنے مقصد

اور ارادہ سے کسی کے سامنے جھکنا جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم آپ کے اس خیال کے محتاج نہیں کہ آپ ہمیں کیا سمجھتے ہیں، آپ جو کچھ سمجھتے ہیں سمجھیں مگر ہم اپنی اصلیت پر ہیں، پس تواضع کا حاصل اور ترفع کا حاصل محتاجگی نکلا، اس لئے تکبر بھی کوئی اچھی صفت جو ذلیل وخوار کرتی ہے۔

اس طرح ہوا کی خاصیت انتشار اور پھیلاؤ ہے، وہ ہر جگہ موجود رہتی ہے، ہر جگہ گھس رہتی ہے، ہر جگہ بھری رہے ذرہ ذرہ اس سے وابستہ رہے، گویا اسے ہر کوئی پہچانتا ہے، انسان میں بھی ہوائی جز ہے، جیسے ریاح اور سانس وغیرہ سے نمایاں ہے، جو وہ بھی چاہتا ہے کہ ہر جگہ موجود رہوں، ہر جگہ گھسا رہوں، ہر زمان ومکان میں میرا وجود رہے مگر اس کا مادی نفس تنہا پھیلاؤ نہیں رکھتا کہ وہ خود ہر جگہ ہے اس لئے وہ انتشاریت، شہرت چاہتا ہے کہ لوگ جگہ جگہ اس کا چرچا کریں، پس اس شہرت کی خواہش میں بھی اسی ہوائی جز کا اثر ہے، چنانچہ اس شہرت پسندی کے جذبہ کا حاصل بھی وہی محتاجگی ہے، اس لئے کہ انسان کی یہ خواہش بھی اس کے بغیر نہیں ہوسکتی کہ پہلے دوسرے ہوں پھر وہ اسے پہچانیں اور اس کا پروپگنڈہ کریں، آپس میں بھی ذلت ہے کہ اپنے مقاصد کو دوسروں پر معلق کرتا ہے۔

اسی طرح پانی کی طبعی خاصیت عدم قرار ہے اور اسے اپنے آپ پر اعتماد کا کوئی شائبہ نہیں ہے، وہ اپنے نفس کو جب تک نہ روکا جائے نہیں رکتا، جہاں بند ٹوٹا ادھر بہہ گیا جہاں برتن پھوٹا بکھر گیا، ذرا نشیب آیا بہہ گیا، انسان میں بھی چونکہ پانی کا جز وموجود ہے جیسا کہ تھوک، سنک، بلغم پیشاب وغیرہ سے واضح ہے، اس لئے اس میں بھی ضبط نفس کا پیدائشی طور پر نشان نہیں ہوتا، ذرا کسی کی اچھی چیز دیکھی بکھر پڑے، کسی عورت پر نظر پڑ گئی گھورنے لگے، کوئی قبول صورت دیکھی اسکے پیچھے پیچھے ہولئے، کوئی عمارت اچھی دیکھ لی تو وہیں للچائی نظروں سے اسے دیکھنے لگے کہ کاش یہ بلڈنگ ہماری ہوتی، اس میں بھی احتیاج ہے۔

نفس کے رذائل وفضائل

اس طرح ان مادی اخلاق یا رذائل کے چار حصے نکلیں گے، قبض وبخل، تعلی وترفع،

شہرت پسندی وانتشاریت عدمِ ضبطِ نفس یعنی حرص وہوا جو آدمی کو سراپا احتیاج اور غلام بنا دیتی ہے۔ یہیں سے استغناء وخودداری کے اصول پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ وہ ان اخلاقِ چارگانہ کی ضد ہی ہو سکتے ہیں۔

چنانچہ قبض وبخل کی ضد سخاوت وایثار ہے، کبرت ونخوت کی ضد تواضع وفروتنی ہے، شہرت پسندی اور نام آوری کی ضد اخفاء وتستہ ہے، حرص وہوا اور بکھر پڑنے کی ضد ضبطِ نفس اور قناعت ہے، جب فضائل مادی اخلاق بھی نہیں کہا جاسکتا ہے تو یہ روح کے روحانی اخلاق شمار کئے جائیں گے۔

چنانچہ مادی اخلاق کے آثار پر جہاں تک غور کیا گیا ان کا حاصل بجز خودغرض اور خودطلبی کے اور کچھ نہیں، بخل وحرص، شہرت پسندی یا تعلیٰ سب کی بنیاد نفس کی خواہش پر ہے کہ مال وجاہ سب کا سارا کا سارا دنیا سے کٹ کر اس کے دامن ہوس میں سمٹ جائے، گویا ہر چیز دوسروں سے روک کر اپنے لئے خاص کر لیا ان نفسانی اخلاق کا تقاضا ہے، تعلیٰ وترفع میں ہر درجۂ کمال کو دوسرے سے منفی کر کے اپنے سے مختص کیا جاتا ہے، قبض وبخل میں اپنی مقبوضہ چیز اوروں سے روک دی جاتی ہے، اور شہرت پسندی اور نام آوری میں اوروں کی نمود روک کر صرف اپنا نام چاہتا ہے۔

ادھر روحانی حیثیت سے مادی اخلاق کی ضد ہے، اس لئے کہ طبعی اثرات ان کے ضد ہوں گے، مادی اخلاق کا اثر خودغرضی تھا روحانی اخلاق کا اثر بے غرضی ہے، چنانچہ ایثار وتواضع یا اخفاء قناعت اس میں کسی کی بھی بنیاد خودغرضی پر نہیں ہے، چنانچہ سخاوت میں اپنی چیز دوسروں کو دی جاتی ہے، قناعت میں دوسروں کی چیز انہیں کو چھوڑ دی جاتی ہے، تواضع میں اپنی عزت دوسروں پر نثار کی جاتی ہے، اور اخفاء میں دوسرں کی عزت کے لئے پورا میدان دیا جاتا ہے۔

بہر حال آدمی جب صدقہ کرتا ہے مادی نفس کے دو رذیلے بخل اور حرص نفس صدقہ ہی سے ختم ہو گئے تھے اور تین رذیلے تعلیٰ، نام آوری اور خود بینی اخفاء صدقہ کی قید سے ختم ہو گئے، اور ظاہر ہے کہ جب ایک شخص بخیل نہ رہا، سخی ہو گیا، جس کے معنی یہ ہیں کہ اسے

غیروں کی دولت کی بھی پرواہ نہ رہی، شہرت پسند نہ رہا، بلکہ عزت پسند ہوگیا، جس کے معنی ہیں کہ اسے لوگوں کی مدح وذم کی پرواہ نہ رہی، شیخی پسند اور خود بین نہ رہا، بلکہ خود گذار ہو گیا جس کے یہ معنی ہیں کہ اسے اپنے نفس کی پرواہ نہ رہی۔

تو اس کا صاف مطلب یہ نکلا کہ وہ ان روحانی اخلاق کی بدولت جو اس نے صدقہ سے حاصل کئے، عالم میں کسی کا غلام نہ رہا، اور اسے ہر چیز سے کامل آزادی اور حریت میسر آگئی اور یہ سب جانتے ہیں کہ ساری کائنات سے بے پرواہ ہوکر اب اگر اس کا رشتہ نیاز کسی سے جڑ سکتا ہے تو صرف اسی خالقِ کائنات سے جس کی طرف اس نے یہ اپنا مال، اپنی آبرو، اپنا نفس سب کچھ تج دیا تھا، اور جس کے رضا سے اسے یہ اخلاق حاصل ہوئے ہیں، اسی حالت میں اسے مناسبت پیدا ہوئی اس کے غنی سے۔

سائنس وسیلہ، اسلام مقصود

جب یہ معلوم ہوا کہ یہی مادی تصرفات جن سے احتیاج اور ذلتِ نفس کا ثمر پیدا ہوتا ہے، سائنس کا موضوع عمل ہیں اور یہی روحانی تصرفات یعنی صدقہ اور ایثار جس سے استغناء عزتِ نفس کا نتیجہ ظاہر ہوتا ہے، اسلام کا موضوع عمل ہیں تو یہ نتیجہ نکل آیا کہ سائنس تو انجام کار انسان کو ذلتِ نفس اور ہلاکت کی طرف لے جاتی ہے اور اسلام عزت اور فلاح دارین کی طرف بڑھاتا ہے، بہر حال یہ عناصر اربعہ اور اس سے بنا یہ محض ایک ڈھانچہ جس کی زندگی روح کے بدولت ہے، روح اسے زندہ رکھ رہی ہے، علوم وکمالات اسکے ذریعہ ظاہر کرتی ہے، اس لئے جسم حقیقت میں فاعل نہیں، بلکہ محض قابل ہے اور اصل نہیں بلکہ وسیلہ ہے، اور اس جسم کو مقصود کا درجہ دیا جاتا ہے، تو یہ فی الحقیقت بغیر روح کے ایک لاشہ محض ہے، جس کا انجام سڑنے اور گلنے کے سوا کچھ بھی نہیں، جب کہ سائنس کا موضوع محض یہ جسمانیت اور مادی چیزیں ہیں اس لئے سائنس کے تمام کرشمے بھی وسائل سے زیادہ قیمت نہیں رکھتے، جب کہ اسلام اصل موضوع اور روحانی افعال ہیں، اس سے پتہ چلا کہ جیسے بدن روح کے لئے وسیلہ عمل ہے، ایسے ہی سائنس اصولی طور پر اسلامی کارناموں کے لئے ایک وسیلہ اور ذریعہ، جس کی زندگی اور اسلامی اخلاق وافکار

اوراسلامی اقوال وافعال ہوں گے،اگر یہ روح اصل ڈھانچہ میں ہے تو یہ پوری سائنس اور اس کی تشکیل بے فائدہ ہوگی، جب یہ ثابت ہوا کہ سائنس محض وسیلہ ہے تو وسیلہ کو مقصود کی ضرورت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے،اوراسی قدر استعمال کیا جاتا ہے جس حد تک وہ مقصود کے لئے معین ومددگار رہوں۔

اس لئے یہ بات معلوم ہوئی کہ مقصود اصلی یعنی دین سے جدا رہ کر سائنس میں انہماک کرنا یہ عقل مندی کا کام نہیں، بلکہ اسے وسیلہ کی حد تک اورضرورت کی مقدار میں استعمال کیا جائے۔

اس لئے دنیا کے سائنس عناصر اربعہ کے تصرفات کواسی حد تک حاصل کرنے کی اجازت زبان نبوی سے دی گئی ہے جس حد تک مذہبی مقاصد میں ان کی ضرورت ہوارشاد نبوی ہے۔

[اعمل لدنياك مقدار بقائك فيها ، واعمل للآخرة بمقدار بقائك فيها]

”دنیا کے لئے اتنا کرو جتنا دنیامیں رہنا ہے اورآخرت کے لئے اتنا کرو جتنا وہاں رہنا ہے۔

علامہ اقبالؔ نے اس سائنس اوراس کی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے:

یورپ میں بہت روشنیٔ علم وہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائی تعمیر میں ، رونق میں ، صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے ، حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگ مفاجات
یہ علم ، یہ حکمت ، یہ تدبر ، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات

بے کاری وعریانی و مے خواری وافلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کی فتوحات
وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق وبخارات

دنیا مقصود اصلی نہیں، مقصود کے حصول کا ذریعہ ہے

یہ دنیا اور اس دنیا کی ساری جدوجہد بس ایک وسیلۂ آخرت سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، اسی کو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ:"إن الدنیا خلقت لکم وأنتم خلقتم للآخرة" (۱) بلا شبہ دنیا تمہارے لئے بنائی گئی ہے اور تم آخرت کے لئے پیدا کیئے گئے ہو۔

اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دنیا تمہاری آخرت کے لئے بنائی گئی ہے، یعنی وسیلۂ آخرت ہے، مقصودِ زندگی نہیں، مقصود زندگی تو قرآن کے بیان کے مطابق "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ" (۲) میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف عبادت کے لئے پیدا کیا ہے"

یعنی انسان اور جنات کو دنیا اور دنیا داری کی خاطر پیدا نہیں کیا، یہی کلمۂ حصر کا مفہوم ہوسکتا ہے اور جب دنیا غایتِ تخلیق نہیں تو لامحالہ پوری دنیا کا وسیلۂ عبادت ہونا ثابت ہوتا ہے، اور ایک جگہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:"اللھم أعنی علی دینی بالدنیا وعلی آخرتی بالتقوی "(۳) اے اللہ! میرے دین کو دنیا کے ذریعہ مدد دے اور میری آخرت کو پرہیزگاری سے"۔

بہر حال ان نصوص سے دنیا وسیلۂ دین ثابت ہوتی ہے اور عقلی اصول ہے کہ وسائل صرف تکمیلِ مقاصد کے لئے بقدر ضرورت اختیار کئے جاتے ہیں، اگر وہ ضرورت سے بڑھ جائیں یا ضد مقصود کے لئے وسیلہ ثابت ہونے لگیں یا مقصد فوت ہو کر محض وسائل ہی

---

(۱) الدر المنثور :۱۶۹/۸، دار الفکر، بیروت (۲) الذاریات :۵۶
(۳) کشف الخفاء :۱۸۵/۱

وسائل رہ جائیں گویا تخم تو گل جائے اور جڑ میں پانی ہی پانی رہ جائے جو تخم کے نشو ونما کا محض ایک وسیلہ تھا تو شرعاً ہی نہیں عقلاً بھی مذموم سمجھا گیا۔ گویا یہ تمام سامانِ دنیا بدن کی پرورش اور بقاء کا ذریعہ ہے اور بدن روح کے لئے مرکب اور سواری ہے جس پر سوار ہوکر وہ راہِ حق اور آخرت کی منزلیں طئے کرتی ہے؛ اس لئے ضروری ہوا کہ انسان روح کے اُس گھوڑے یعنی بدن کے لئے گھاس دانہ فراہم کرے؛ تاکہ وہ سفر کرنے کے قابل ہو، پس سفر سے مقصود منزل ہوتی ہے نہ کہ گھوڑا یا گھاس دانہ، اس صورت میں اگر مقصد سفر ہی سامنے نہ ہو تو سواری اور گھاس دانہ ہی کی ضرورت باقی نہیں رہتی؛ لیکن جس صورت میں مقصد سامنے ہو تو تحصیلِ مقصد کی حد تک سواری کا بندوبست کرنا ناگزیر ہوتا ہے، مگر وہ وسیلہ ہی رہتی ہے مقصد نہیں بن جاتی۔

بہر حال سماوات وارض کے عجائبات کی طرف متوجہ کرنے اور ان میں غور وفکر کا امر کرنے کا مقصد قرآنی ہدایات کی روشنی میں معرفتِ خالق، معرفت توحید، ذات وصفات اور معرفتِ توحید افعال سے نفسِ انسانی کی تکمیل اور اُسے فضائل علم واخلاق سے آراستہ اور مہذب بنانا ہے، ریل وتار، فون ولاسلکی، موٹر اور جہاز وغیرہ کے کارخانے کھلوانا نہیں، کیوں کہ یہ سب کچھ بننا نہ قرآن پر موقوف ہے نہ ختم نبوت کی لائی ہوئی معرفت وبصیرت پر، البتہ بطور وسیلۂ عبادت ان مادی اشیاء اور تمدنی صنائع سے کلیۃً الگ کر دیا جانا بھی مقصود نہیں؛ بلکہ بضرورت عبادت اور بضروت نفاذِ خلافت ان وسائل کی تحصیل بھی ضروری قرار دی گئی ہے، تاکہ معاش کی طرف سے مطمئن ہوکر ایک انسان معاد کی فکر کر سکے اور قانونِ الٰہی کو قوت سے دنیا میں پھیلانے اور رواج دینے سے کوئی چیز مانع نہ بن سکے۔

اس بات کے واضح ہو جانے کے بعد یہ جرأت نہ ہونی چاہئے کہ مقاصد عبودیت کو چھوڑ کر صرف ان فانی وسائل میں کھو جانے اور انہیں ہی مقصد زندگی ٹھہرا لینے کو خلافتِ الٰہی کہا جائے، کوئی بھی سنجیدہ عقل اسے تسلیم نہیں کر سکتی کہ جس خلافتِ الٰہی کے برپا کرنے کے لئے ہزارہا انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے، لاکھوں حواری اور صحابہ رضی اللہ عنہم، انبیاء علیہم

السلام پیدا کئے گئے اور کروڑوں نائبانِ انبیاء اور صلحاء ظاہر ہوئے اس خلافت کے معنی لوہے، پیتل، لکڑی اور پتھر وغیرہ کے مختلف معاشی سامان ڈھالنے اور ان سامانوں سے اسبابِ عیش ونشاط یا اسبابِ تباہی وہلاکت افراط کے ساتھ مہیا کر کے دنیا میں فساد مچانے کے ہیں، اگر یہی خلافت الٰہی تھی تو معاذ اللہ فرعون مصر، کسرائے فارس، قیصر روم، خاقان چین، راجائے ہند، نیز دوسرے اور بڑے بڑے عیش پسند یا جنگ جو سرمایہ دار؛ بلکہ تمام دشمنانِ انبیاء علیہم السلام جیسے قارون اور ہامان، نمرود اور شداد، ابوجہل اور ابولہب وغیرہ سب سے بڑے خلفائے الٰہی ہوتے، یا پھر بڑے بڑے صناع لوہ، بڑھئی، صراف اور سنار وغیرہ خلفائے الٰہی ثابت ہوں گے اور جب کہ ان فنون اور فن کاروں کے وجود کے لئے قرآن اور نبوت ہی کی ضرورت نہ تھی تو دوسرے لفظوں میں اس خلافت کے لئے بھی نہ نبوت کی ضرورت رہتی ہے نہ قرآن کی؛ بلکہ اس خلافت کے حق میں نبوت حارج نکلتی ہے۔

قرآن کا مقصد اصلی خلافت:

قرآن کا مقصدِ اصلی انسان کو اس حد کمال پر پہنچا کر اس کی انسانیت کی تکمیل کرنا ہے اور جب کہ کمال کا حقیقی سرچشمہ ذاتِ خداوندی کے سوا دوسرا نہیں ہوسکتا جس کے اوصاف وافعال سے اسی کے فرمان کے مطابق مشابہت پیدا کر کے ان کمالات کو بقدر استعداد وقابلیت اپنانا ہی انسانیت کی تکمیل ہے، خلیفہ اصل کا قائم مقام ہوتا ہے، اس لئے خدا برتر وبالا کا خلیفہ وہی ہوسکتا ہے جو خدائی اوصاف وکمالات کا پرتو ہو، اگر اللہ عزوجل کے لامحدود کمالات جن کے اجتماع سے آدمی کو خلیفۂ الٰہی قرار پاتا ہے، اصولی نقطۂ نظر سے تین نوعوں میں منحصر نظر آتے ہیں: (۱) کمالات علم وادراک (۲) کمالات وصف واخلاق (۳) کمالاتِ صنعت وافعال؛ چنانچہ کتاب وسنت میں جس قدر بھی اسماء وصفات اسم یا فعل کی صورت میں ذکر فرمائے ہیں وہ سب ان ہی تین انواعِ کمالات کی نشان دہی کرتے ہیں یا وہ علمی اسماء ہیں جن سے اللہ کے علمی کمالات کی نشان دہی کرتے ہیں اور علمی اسماء یہ ہیں، علیم، خبیر، سمیع، بصیر، مدرک، واجد وغیرہ، یا وہ اخلاقی اسماء ہیں جن سے اس کے جوہری اخلاق اور پاکیزہ ولطیف قوائے باطن پر روشنی پڑتی ہے جیسے صبور،

شکور، رؤف،غفور، رحیم، کریم،عفو، حلیم، وغیرہ یا افعالی اور صناعی اسماء ہیں جن سے اس کے صنعتی کمالات پر روشنی پڑتی ہے جیسے: خالق، باری، بدیع،مصور،مبدئ،معید، محیی،ممیت، نافع وضار وغیرہ بقیہ اسماء اس کے متعلقات ہیں۔

انبیائے علیہم السلام کی بعثت کا مقصد

انبیاء علیہم السلام جو کہ روئے زمین پر اللہ عزوجل کے اوّلین خلفاء میں سے ہیں، ان کی بعثت کی غرض وغایت بھی ان ہی تین کمالات ''علم وخلق وصنع'' سے بنی آدم کو آشنا بنانا اور عملی طور پر اس راہ پر چلانا ہے؛ تاکہ انسان خلیفۂ الٰہی بن کر اپنے منیب کی منشاء کے مطابق ان ہی تین کمالات کی روشنی میں اس کائنات کا انتظام کرے اور مالکِ کائنات کی مرضی پر خود چل کر اس کی رعایا کو چلائے۔

اس لئے سردار انبیاء علیہم السلام نے اپنی بعثت کی غرض وغایت ان ہی تین کمالات کی ترویج واشاعت ظاہر فرمائی، چنانچہ علمی کمالات کی ترویج کا فرضِ بعثت ہونا تو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا کہ: ''إنما بعثت معلما ''(۱)

اخلاقی کمالات کی ترویج کا غرضِ بعثت ہونا ان الفاظ میں ظاہر فرمایا: ''بعثت لأتمم مکارم الأخلاق ''(۲) میں بھیجا ہی اس لئے گیا ہوں کہ اعلیٰ ترین اخلاق کی تکمیل کردوں۔

عملی اور صنعتی کمالات کے غرضِ بعثت ہونے کے اعلان کے لئے شریعت غراء کی ترویج کو غرض بعثت ظاہر فرمایا جو ہر نوع کی حکمت عملی یعنی تہذیبی، منزلی، مدنی، تمدنی، اقتصادی، سیاسی اور صنعتی وغیرہ افعال کے فطری اصول پر مشتمل ہے اور جس کے مجموعہ کا نام شریعت ہے:

''بعثت بالحنفية السهلة السمحة البيضاء '' (۳)

---

(۱) ابن ماجة : باب فضل العلماء، حديث:۲۲۹

(۲) المغنی عن حمل الأسفار : فی فضيلة الألفة والأخوة :۴۶۳/۱

(۳) المعجم الكبير :صدی بن العجلان ، حديث:۷۷۱۵

''میں بھیجا گیا ہوں سیدھی، سہل روشن اور رعایتوں پر مشتمل شریعت دے کر''

اے تہی از ذوق وشوق وسوز ودرد
می شناسی عصر ما با ما چہ کرد
عصر ما، مارا زما بیگانہ کرد
از جمال مصطفے بیگانہ کرد

جب اللہ عزوجل نے حضرت آدم علیہ السلام کو خلافتِ ارضی سے نواز کر زمین پر بھیجنے کا ارادہ کیا تو پہلے انہیں ''علم الأسماء'' سے نوازا ''وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ''(۱) اس طرح دنیا میں آنے والے پہلے انسان کو اللہ عزوجل نے ان اشیاء کے ناموں کے ساتھ ان کی خصوصیات کا علم عطا فرما کر بھیجا جن کی تمدنی زندگی میں ضرورت پڑتی ہے، اسی طرح قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی چیزوں کی ایجاد پہلی مرتبہ حضراتِ انبیاء علیہم السلام ہی کے ذریعہ ہوئی، چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کو زرہ گری کی صنعت سکھائی گئی، حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی بنانا سکھایا گیا ''وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا''(۲) (حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے تانبہ کا چشمہ بہایا گیا، ان کے زیرِ نگرانی شیاطین وجنات بڑے بڑے مکانات اور دیگر چیزیں بنایا کرتے ''يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَاءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ ''(۳) حتی کہ امامِ حدیث شمش الدین الذہبی ''الطب النبوی'' میں روایت نقل کی ہے انسانی زندگی کے لئے جتنی اہم اور ضروری صنعتیں ہیں مثلاً: مکان بنانا، کپڑا بننا، درخت اور پودے لگانا، کھانے کی چیزیں تیار کرنا، حمل ونقل کے لئے پہیوں کی گاڑی بنا کر چلانا وغیرہ، سب اللہ عزوجل بذریعہ وحی اپنے نبی کو سکھلائی تھی۔(۴)

غور کرنے کی بات ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے قوم کو صنعت کاری کی دعوت نہیں دی، حضرت داؤد وسلیمان علیہما السلام نے ان فنون کی دعوت کو مقصد نہیں بنایا، پورا قرآن شاہد ہے کہ انہوں نے ایک خدا کی بندگی اور آخرت اور نبیوں کی اطاعت پر انہیں ابھارا۔

---

(۱) البقرة: ۳۱ (۲) هود: ۳۷
(۳) السبأ: ۱۳ (۴) معارف القرآن: ۷/۲۶۲

تحقیقِ کائنات وسیلۂ معرفت نہ کہ مقصد زندگی

جن تین کمالاتِ ربانی سے انسان کو مزین کرنے کے لئے انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے، جن کی تکمیل پر انسان خدا کا نائب اور خلیفہ بن کر دنیا کی زمام اور حکومت اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے، ان تین کمالات ربانی میں سے ایک علم وادراک ہے، یہ ایک ایسا ربانی اور الٰہی وصف ہے کہ وہ وسائل اور وسائط کا محتاج نہیں، وہ کسی کا نہیں؛ بلکہ خود اپنا ہے، وہ استدلالی نہیں؛ بلکہ ذاتی ہے کہ ماضی و مستقبل اور شاہد اور غائب سب اس کے سامنے بطورِ علم ضروری کے خود بخود حاضر ہیں، اسے حصول علم کے لئے استدلال کی حاجت نہیں کہ وہ قیاسات سے معلومات کے اندازے لگائے؛ کیوں کہ یہ جہل کی علامت ہے اور وہ جہل سے بری و بالا ہے، اسے ظن و تخمین سے نتائج تک پہنچنے کی ضرورت نہیں؛ کیوں کہ یہ لاعلمی کا عیب ہے اور وہ ہر عیب سے منزہ اور مقدس ہے، اسے کتابوں سے پڑھ کر اور استاذوں سے سیکھ کر معلومات حاصل کرنے کی ضرورت نہیں؛ کیوں کہ یہ ذات کا کمالات سے خالی ہونا اور تکمیل کو چاہنا ہے جو سراسر محتاجگی ہے اور وہ اس محتاجگی سے بری ہے، غرض اللہ عز وجل کے علم کے دائرہ میں پہلی چیز وہاں اسبابِ علم سے غنائے مطلق ہے؛ اسی لئے علم کے مبادی ہوں یا نتائج، ہیئت ہو یا حقیقت، صورت ہو یا ماہیت سب وہاں بیک دم حاضر ہیں، نہ اس کے اول میں محتاجگی ہے اور نہ اخیر میں، نہ ظاہر میں نہ باطن میں "هو الأول ليس قبله شيء وهو الآخر ليس بعده شيء وهو الظاهر ليس فوقه شيء وهو الباطن ليس دونه شيء" اس لئے علم الٰہی کی بنیاد استغناء ہے، چنانچہ علم کے دائرہ میں اللہ عز وجل کے حقیقی خلفاء وہی ہو سکتے ہیں جن کے علم کی شان یہ غنائے کامل ہو کہ وہ یا تو بلا کسب ومحنت اور بلا واسطۂ کتاب واستاد نیز بلا ریاضت ومجاہدہ، وہبی اور الہامی طور پر براہِ راست اللہ سے اس کا علم پائیں جس کا نام علم لدنی ہے، جو انبیاء علیہم السلام کی شان ہے، اگر وہ علم کسب ومحنت کے ذریعے حاصل بھی ہو تو انبیاء علیہم السلام ہی کے تعلیم کردہ اصول وضوابط کی اور انہیں کے پیش کردہ اسوہ کے مطابق ہو، اگر چہ یہ علم ابتداءً کسبی اور حصولی ہی کہلائے گا مگر آخر کار علم الٰہی سے ایک نسبت پیدا کر کے وہبی بن

جائے اور خود ہی قلب سے علم کا سوتا پھوٹ نکلے گا اور اس میں وہی استغناء کی شان آئے گی کہ پھر اس میں رسمی وسائط کی احتیاج وضرورت باقی رہے اور نہ کتاب واستاذ اور دوسرے وسائل کی۔

یہی صورت اخلاقِ ربانی کی بھی ہے کہ ان کا منتہا بھی یہی غنائے کامل ہے، جو اس اخلاق کی بنیاد ہے، اور ہر حسن خلق کی روح آخر میں غناء اور عدم احتیاج نکلتی ہے جیسا کہ ہر خلق بد کی روح اور انجام کار محتاجگی اور غیر کی غلامی اور اسیری نکلتی ہے۔

مثلاً تواضع کے معنی ہیں کہ ہم رسمی جاہ اور خودی سے کنارہ کش اور بے نیاز ہیں، سخاوت وقناعت کے معنی ہیں کہ ہم مال ومنال کی محبت وطلب سے آزاد اور بے پرواہ ہیں، صبر کے معنی ہیں کہ ہمیں فوت شدہ کا غم نہیں یعنی ہمیں اس کی احتیاج نہیں، شکر کے معنی ہیں کہ ہم اس نعمت سے اٹکے ہوئے نہیں؛ بلکہ نعمت دینے والے سے وابستہ ہیں جو بے نیازی کا سرچشمہ ہے، شجاعت کے معنی ہی جان سے بے نیازی اور استغناء کے ہیں، حیاء کے معنی حق کی خاطر نفس کی مرغوبات ومحبوبات سے بے پرواہ ہوجانے کے ہیں، ایثار کے معنی ہیں کہ دوسرے کے نفع کی خاطر اپنے منافع سے دست بردار ہوجائیں، حلم کے معنی ہی انتقام سے بے نیازی اور جذباتِ انتقام سے بالاتر ہونے کے ہیں۔

اس کے بالمقابل تواضع کے مقابل تعلیٰ ہے جس کے معنی ہیں غیر پر اپنی برتری ثابت کرنا جس میں سراسر غیر کا احتیاج ہے، سخاوت کے مقابلے میں بخل کا مطلب ہے کہ مالی محتاجگی کے ہیں نہ کہ اس سے غنی اور بے نیاز ہونے کے، بے صبری اور جزع وفزع کے معنی فوت شدہ سے اٹکاؤ اور اس کے غم میں گھل جانے کے ہیں، یہی محتاجگی ہے، شجاعت کے مقابل بزدلی کے معنی ہیں کہ سامنے والے کی طاقت سے مرعوب ہوکر اس کا محتاج ہوجانا ہے، ناشکری کا مطلب ہے منعم حقیقی سے کٹ کر اپنے نفس کے اسیر اور غلام ہوجانے کے جو سراپا بندۂ احتیاج ہے، حرص کے معنی ہیں دولت اور اسباب عیش وعشرت کے احتیاج کے ہیں۔

بس اخلاق کے سلسلے میں اللہ کا نائب وہی ہوسکتا ہے جو ان اخلاق حسنہ سے

متصف ہو کر غیر کی احتیاج اور ضرورت سے بے نیاز ہو جائے، بے نیازی اور بے احتیاجی اس کی ہر حرکت وسکون سے ظاہر ہو، پھر کیوں کر دنیا کے برق و بخار، آب و آتش یا خاک و باد کا محتاج ہو کر انسان خلیفۃ اللہ فی الأرض بن سکتا ہے۔

اسی طرح یہی نوعیت خدا کی صفت صناعی اور فعالی کی ہے کہ وہاں بھی احتیاج کا کوئی شائبہ تک نہیں، یعنی اللہ کا کوئی فعل اور نہ کوئی صنعت وسائل کی محتاج ہے، نہ اسباب کے تابع ہے، وہ خود ہی مسبب الأسباب ہے اور خود وسائل کو بناتا ہے، نہ اس کے لئے مادہ درکار ہے اور نہ مدت، خود اسی کی باطنی قوت ایک فعل کو ذہنی وجود دے کر اسے بیک دم خارج میں نمایاں کرتی ہے، جس کے لئے اسباب ومسببات کی کوئی احتیاج نہیں، بلکہ صرف ''کُنۡ فَیَکُوۡنُ'' کی لامحدود طاقت کافی ہے۔

اس لئے خدا کا نائب اور اس کا خلیفہ بھی وہی ہوسکتا ہے جس کے اندر ظاہری وسائل سے استغناء پیدا ہو جائے، اپنے صنع وعمل میں کسی غیر اللہ کا محتاج نہ رہے، خواہ وہ بے شعور وسائل ہوں یا باشعور اشخاص واعیان عناصر ومو الید ہوں یا فلکیات وارضیات، یہ تمام اشیاء نہ اس کی صنعت میں حارج ہوسکیں، وہ چاہے تو پرواز کے وسائل کے محض خدا کی طاقت کے بھروسہ اور اپنی قوت یقین سے آسمانوں تک پرواز کر سکے، اور چاہے تو بلا وسائل رصد گاہ اپنے اثرات فلکیات تک پہنچا دے، وہ چاہے تو بلا وسیلہ لاسلکی اور فون وانٹرنیٹ کے اپنی آواز مشرق سے مغرب تک پہنچا دے۔

اسی اعتماد علی اللہ اور استغناء وبے نیازی کی طاقت تھی جس کی بناء پر غزوۂ بدر میں ملائکہ مسوّمین ہزاروں کی تعداد میں آئے، تاکہ ان قلیل التعداد مسلمانوں کے دلوں میں جماؤ اور استقلال پیدا کریں، اسی کے تحت حضور ﷺ نے اعداء اللہ پر مٹھی بھر کنکریاں پھینک ماریں جو انہیں تیر وتفنگ ہو کر لگیں، تمام عرب مرتدین کے مقابلے صرف تنہا حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا قتال کے لئے کھڑے ہونا، اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا ساٹھ ہزار رومیوں کو صرف ساٹھ مسلمان صحابہ کے ساتھ شکست دینا یہ اسی قوت کی بنا پر تھا۔

ہاں اگر قوت یقین عین الیقین کے درجہ کا نہ ہو اور غناء وتوکل کا مادہ راسخہ قلب میں

جاگزیں نہ ہو تو بھی حق الیقین کے تحت غناء وتوکل کی بشاشت دل میں ہو، دل میں انشراح ہو، علم واخلاق اور صناعات ظاہرہ سے بے نیاز نہ ہو؛ لیکن اعتقاداً ان اسباب ووسائل کی اہمیت ووقعت دل میں نہ ہو، اسباب کے اختیار کرنے کے وقت دل میں یہ خیال ہو کہ یہ اسباب ہمارے ضعیف نفوس کو سہارا دینے کے لئے ہیں، خلافتِ الٰہی کے معنی علم وعمل اور صنعت وافعال میں مادی اسباب سے بالکل منقطع ہونے کے نہیں ہیں، جیسا کہ خود حق تعالیٰ شانہ نے باوجود اس غنائے مطلق کے اسباب بھی پیدا کئے، اور اپنی قوتوں کو عادۃً ان ہی کی ضمن میں پیدا فرمایا، اس لئے اسبابِ جنگ کے سلسلہ میں ہتھیار، اسباب وصنائع کے سلسلہ میں اوزار اور اسبابِ معاش کے سلسلہ میں کاروبار، اپنی اپنی جگہ رہیں گے؛ مگر دل میں ان وسائل کی اہمیت اور محتاجگی نہ ہوگی اور نہ عملاً ان وسائل کے اختیار کرنے میں مبالغہ سے کام لیا جائے گا۔

یہ معلوم ہونا چاہئے کہ پہلے کے لوگ بھی طاقت کی حقیقت وسائل سے بے نیازی کو سمجھتے تھے، وسائل کی محتاجگی کو نہیں، چنانچہ لوگ حسی مادوں کے بجائے زیادہ تر نفسانی اور معنوی قوتوں کی تسخیر کو کمال سمجھتے تھے اور زیادہ تر طلسمات، نجومیات، فلکیات اور خود نفسِ انسانی کی اندرونی طاقتوں پر ان کی توجہ مرکوز رہی ہے۔ ریاضیات مجاہدات کے ذریعہ نفس کی قوت کو مجتمع کیا اور اس سے بلا وسائل کام لیا، لیکن اسلام نے ان تمام طاقتوں کو جس میں مسمریزم، شعبدہ بازی، سحر وغیرہ شامل ہیں جس میں ظاہری اسباب کچھ نہیں ہوتے مگر مد مقابل زیر ہو جاتا ہے مخلوقاتی طاقتیں قرار دے کر ارضیات، فلکیات، نفسیات یعنی تمام سفلیات اور علویات سے آگے بڑھ کر الٰہیات کی لامحدود طاقتوں سے روشناس کرایا۔

بہرحال جو قوتیں رات ودن لوہے، لکڑی، اینٹ، پتھر اور عام مادی وسائل کی محتاجگی اور غلامی میں نہ صرف بسر ہی کر رہی ہیں، بلکہ ان مادیات کی بندشوں نے ان کے خیال تک کو اپنا اسیر اور قیدی بنالیا ہے، جس سے وہ روحانیت سے بیگانہ اور منقطع ہیں، نہ وہ غناء وتوکل سے عقیدتاً سرفراز ہیں نہ حالاً، تو انہیں خلافتِ الٰہی سے کیا تعلق؟ کیوں کہ خلافتِ الٰہی کا استحقاق ہی ان اشیاء سے استغناء پر ہے۔

تحقیق کائنات کو مقصد زندگی بنانے کے نقصانات:

قرآن یہ کتابِ ہدایت ہے، اسے تقوی وطہارت ، اخلاق وروحانیت ، زہد وعبادت ،خشوع وانابت ، اتباعِ سنت واقتضائے آثارِ سلف اور خلافتِ الٰہی کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کے بجائے عنصری بنیادوں ،فلسفہ وسائنس ،معاشیات ،اقتصادیات ،عمرانیات وسیاسیات ،تعیش وتفریح اور رسمی جاہ واقتدار یعنی ملوکیت وسلطنت اور موجودہ دنیا کے خالص مادی افکار ونظریات کے نقطۂ نظر سے دیکھنا کہ اس کی ہر آیت سے خالص مادیت کا ایک سیلاب اڈتا ہوا نظر آئے یہ بالکل زیب نہیں دیتا۔اگر قرآن کو بجائے کتابِ ہدایت کے مادی کھود کرید اور اس کے عناصرِ اربعہ دخان وبخار، گیس وبرق ، ریل وتار، طیارہ وسیارہ اور فون ولاسلکی وغیرہ پھر ان وسائلِ نقل وحمل اور اسبابِ علم وخبر کے وسیلہ سے ایک طرف اسباب زینت وتعیش کی توسیع سے دنیا میں ہوسنا کی ،عیاشی ،حرص وآزادی، بد اخلاقی وسیاہ کاری اور ہمہ اقسام فسق وفجور کی وسعت وکثرت ،دوسری طرف اسبابِ تباہی وہلاکت اور مہلک آلاتِ حرب وضرب، گن اور بم ،ایٹم اور گیس وبارود اور تیزاب وغیرہ کی تیاری سے استبدادی طور پر اقوامِ عالم پر زور آزمائی ،غلام سازی ،قتل وغارت گری ، اعلانیہ جور وجفا اور عالمی امن وسکون کی بربادی کی بہتات اور پھر یہ سب کچھ بنام امن وصلاح ،یعنی کھلی عیاری ومکاری ، ڈپلومیسی ، نفاق اور باہمی بے اعتمادی کی وسعت یہ سائنس کے نتیجے میں قرآن کا مقصود ٹھہرایا ہے؛ حالانکہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد اس جور وظلم کو مٹانا، ایمانداری اور شرافت کا سبق دینا تھا۔

یہ جدید سائنس کی دین جس کی تباہ کاریاں اور اس کے نقصانات عیاں اور بیاں ہیں بقول حکیم مشرق:

یہ عیش فرواں یہ حکومت ، یہ تجارت
دل سینۂ بے نور میں محروم تسلی
تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھویں سے
یہ وادئ ایمن نہیں شایان تجلی

اور ایک جگہ فرمایا:

حیاتِ تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا
رقابت ، خود فروشی ، ناشکیبائی ، ہوس نا کی

اگر قرآن کریم کو سائنس اور ہمہ جہت ترقی ، مادہ وعنصر پر محنت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مہلکات کا ذریعہ قرار دیا جائے جیسا کہ کتاب اللہ کو کائنات ارضی وسماوی پر غور وفکر اور اس غور وفکر کے ذریعے مختلف قسم کے نتائج اخذ کرنے کی کتاب بعض لوگ قرار دیتے ہیں، اگر قرآن کا مقصود یہی ہو تو اس کا خطرناک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسلام کا قرن اول اور صحابہ مقبولین کا طبقہ معاذ اللہ سب سے زیادہ ضعیف الایمان قلیل العلم اور محروم العمل قرار پائے گا، جس نے منشائے قرآنی کے مطابق جیسا کہ بعض لوگوں کا زعم ہے نہ ایک مشین بنائی، نہ ایک انجن ہی ایجاد کیا، نہ دخان و بخار سے چلائیں ، نہ خوبصورت چھری کانٹے ڈھالے، نہ کریم اور پاؤڈر تیار کئے ، نہ چہروں کو گلگوں بنانے کے لئے غازے اور لوشن بنائے نہ آرائشی سامانوں کی تخلیق کی ، نہ ہواؤں میں اڑتے پھرے، نہ پانیوں میں بہتے دکھائی دیئے، نہ کسی نے مہلک آلات ایجاد کر کے لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کا منٹوں میں صفایا کیا ، نہ استعماری اغراض کے ماتحت دنیا میں جبر واستبداد اور ظلم وستم پھیلایا، نہ سائنٹیفک آلات کی طاقت کے بل بوتہ پر قوموں کی غلام سازی کی ، نہ اپنی استعماری اغراض کی خاطر زیردستوں کے کچلے ہوئے جذبات کے ساتھ کھیلنے کی کوشش کی اور نہ ہی دنیا کا سرمایہ سمیٹ کر آلاتِ لہو ولعب ، باجے گاجے، سینما وتھیٹر، فواحش ومنکرات کے مناظر، بے حیائی اور نہ بے حجابی کے عریاں نقشے دنیا میں رائج کر کے اپنی تجارت کو فروغ دیا۔

اگر قرآن کو سائنسی علوم کا جویا قرار دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جس قدر یہ سائنٹفک ترقیات بڑھتی گئیں گویا علوم قرآنی ترقی کرتا گیا، فہمِ انسانی تیز تر ہوتا ہو گیا اور عمل بالقرآن کا ذوق بڑھتا گیا، گویا نبوت کے قرن سے بعید ہونا ہی امت کے حق میں رحمت ثابت ہوا کہ سمجھ اور فہم صحیح ہو گئے ۔ اور لوگ ایمانداری کا مفہوم صحیح صحیح سمجھنے لگے، معاذ اللہ قرن اول بلحاظ علم وعمل کے معاذ اللہ شر القرون ثابت ہو گیا، حالانکہ حضور ﷺ کی

زبان خدائی دعوی یہ تھا کہ:

"خیر القرون قرنی ثم الذین یلونهم ، ثم الذین یلونهم "(۱)

''زمانوں میں سب سے بہتر میرا زمانہ ہے، پھر وہ لوگ جو خیر القرون والوں سے متصل ہوں اور پھر جو ان لوگوں سے متصل ہوں''

اگر قرآن کو علمی قرآن اور سائنس اور کائناتی ریسرچ کو عملی قرآن قرار دیا جاتا ہے اور قرآن کو کائناتی کھوج و تحقیق کا ذریعہ بنایا جاتا ہے تو اس اصول پر تمام انبیاء علیہم السلام پر بھی حرف آتا ہے؛ کیوں کہ ان کے دور میں مادی اور تمدنی ترقیات تو کیا ہوتیں برپا شدہ ترقیات بھی فناء کے گھاٹ اتار دی گئیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کلدانیوں کی تمدنی ترقیات پر پانی پھیر دیا، جو بعض حیثیات سے آج کی تمدنی ترقیات سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر تھیں اور لوگوں کو پھر سے اسی سادہ تمدن کی دعوت دی جس میں تکلفات اور افراطِ عیش کا وجود نہ تھا۔

موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور فرعونیوں کا وہ ملکی اور شہری کرّ وفر ختم کر کے چھوڑا جس پر فرعون "أَلَيۡسَ لِىۡ مُلۡكُ مِصۡر وَهَذِهِ الأَنۡهَارُ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِىۡ" (۲) کہہ کر فخر کیا کرتا اور انہیں اسی بے تکلف سادہ تمدن پر لانے کوشش فرمائی۔

حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دور کے دو عظیم الشان مادی تمدنوں یعنی رومی اور ایرانی کروفر اور عمرانی عجائبات کو مٹا دینے کا اعلان فرمایا اور ان کے مٹ جانے کی پیشن گوئی فرمائی اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عین منشائے نبوی کے مطابق اپنی فتوحات سے ان تکلف آمیز تمدنوں اور ان سرپرست حکومتوں کو تہہ و بالا کر ڈالا، اور وہ سادہ تمدن قائم کیا جو مقاصد عبودیت کے لئے حارج اور رکاوٹ نہ ہو، کسریٰ کے وہائٹ ہاؤز کے بے نظیر سامانوں، مافوق العادت سیم وزر کے ظروف و تاج اور اعلیٰ اعلیٰ نمونوں کے انمول قالینوں وغیرہ کو دیکھ کر جو بسلسلۂ مالِ غنیمت مسجدِ نبوی میں لائے گئے تھے، فاروق اعظم رضی اللہ عنہ

(۱) بخاری : باب فضائل أصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، حدیث: ۳۴۵۰

(۲) الزخرف :۵۱

روپڑے اور فرمایا کہ یہی سامانِ تعیش ہے جس کی بدولت فارسی قوم آج مسلمانوں کی مفتوح بنی۔

بہرحال عیش ونشاط کے وافر سامان ہوں یا قوت وشوکت کے مضبوط دلائل، اسبابِ رزم ہوں یا وسائلِ بزم، دربار سے متعلق کروفر ہو یا بازار سے متعلق سیم وزر، جو آج کی نہیں ہمیشہ کی دنیا پرست اقوام کا سرمایۂ غرور رہا ہے، جو اقوام عالم کی اصل تباہی کا سبب بنا ہے، قرآن اسی تمدن اور اسی سامان عیش اور وسائل کو اختیار کرنے کا کیوں کر حکم دے سکتا ہے؟

چنانچہ قرآن کریم نے جگہ جگہ سابقہ اقوام کی تباہی کی مثالیں پیش کی ہیں کہ وہ وقتی عیش ولذت میں پڑ کر، تعیش کی افزائش کے لئے دماغی کاوشوں سے اختراعات وایجادات میں غرق ہو کر بڑی بڑی جابر قومیں آن کی آن میں کس طرح برباد کردی گئیں کہ آج ان کا کوئی نام ونشان بتلانے والا نہیں ہے، قوم نوح طوفان کے تھپیڑوں سے، قوم عاد آندھیوں کے جھکڑوں سے، قوم ثمود ہولناک گرج اور غیبی چنگھاڑ سے، قوم شعیب آسمان کی آتش باری سے، قوم لوط فضا کی سنگباری اور بستیوں کے الٹ دیئے جانے سے، قوم ابراہیم سلبِ نعمت وملک سے، قوم فرعون قلزم کی موجوں سے، اسطرح بے نشان کردیئے گئے کہ نہ ان پر آسمان رویا اور نہ زمین۔

مصریوں کی سائنٹفک ترقیات، بے نظیر باغات، خوشنما آبشار، سرسبز کھیتیاں، دلفریب سینیریاں، اسبابِ عیش ونشاط، فرعونی دماغ کے مجوزہ سر بفلک منارے جن کی مدد سے وہ آسمان کے دروازوں سے قریب ہو کہ موسیٰ علیہ السلام کے خدا سے مقابلہ کا حوصلہ کر رہا تھا، ان کے لئے کچھ بھی کارآمد ثابت نہ ہوئے اور یہی ساری سائنٹیفک ترقیات فرعون اور فرعونیوں کے حق میں موجبِ ہلاکت وتباہی بنیں، بالآخر نام اور کام اگر باقی رہا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا۔

عاد وثمود کو ان کی سائنسی ترقیات اور فن کاریوں کی بے مثال تعمیر وترقی قوم عاد کو فن انجنیئری کے تحت نادرِ روزگار تعمیرات سر بفلک بلڈنگیں اور قوم ثمود کو پہاڑوں سے تراشی ہوئی قلعہ بند عمارتیں اور منزل درمنزل تعمیریں اس عذابِ الٰہی سے نہ بچاسکیں جو نمائشی

بہاروں میں غرق ہو جانے کے سبب ان پر آیا، اسی لئے قرآن نے ان کے خالص مادیت کے شاہکاروں اور اخلاق وروحانیت سے ہٹے ہوئے کارناموں کو مقصود زندگی قرار دے لینے کو نفرت وحقارت سے یاد کیا ہے۔ یہ سارے مادی مشاغل ان کی نجات یا سراہنے کا ذریعہ نہیں بنے ؛ بلکہ ان مادی مشاغل میں لگ کر ان اقوام نے فرائض عبودیت کو ترک کر دیئے، اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کو ٹھکرا دیا تو قہر خداوندی نے انہیں نیست ونابود کر کے دنیا کو عبرت دلائی۔

جو مغربی فلسفہ کو قرآنی آیات پر منطبق کرنا چاہتے ہیں انہیں کے متعلق علامہ اقبال نے کہا تھا:

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

مقصود اصلی معرفت رب، خدمتِ انسانیت

بہر حال مسلمان کے لئے ان مادی سامان کے حصول کے لئے ترقی کے میدان میں گھس جانا اس کی مدح اور تعریف کا معیار نہیں ؛ کیونکہ مادیات کی دنیا میں گھس جانا ایمان داری وغیر ایمانداری اور اسلام وکفر کا معیار نہیں بن سکتا، مسلمان کے لئے معیار مدح وذم تو صرف علم واخلاق، تصرف روحانی اور اعلائے کلمۃ اللہ ہے، مادی تصرفات کو بقدرِ ضرورت اس کے لئے رکھے گئے ہیں، وہ فی نفسہ مقصود ومعیار نہیں۔

خلافت فی الأرض کا مقصود تلوار اٹھانا نہیں، بلکہ قانونِ حق کو نافذ العمل بنانا ہے، پہلے اپنے اوپر، پھر ماحول اور اس کے پس وپیش، اگر کسی قوم نے تلوار اٹھائے بغیر قرآن کو اپنے اور اپنے ماحول پر نافذ کیا تو وہ بلا شبہ آقا ہے ورنہ قطعی طور پر غلام ہے، خواہ نفس کا غلام ہو یا غیر کا، پیغمبر ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم مکہ کی تیرہ سالہ زندگی میں بھی آقا تھے، جب کہ تلوار ہاتھ میں نہ تھی اور مدینہ کی دس سالہ زندگی میں بھی ویسے ہی آقا تھے جب کہ وسائلِ

شوکت ان کے ہاتھ میں تھے، کتنے ہی انبیاء علیہم السلام کو جہاد وسیاست سرے سے دیئے ہی نہیں گئے، لیکن اوامر اللہ کی تنفیذ میں خلیفہ فی الأرض تھے۔

یہی دونوں حالتیں امت پر گذری ہیں، امت کے بعضے طبقے مکہ کی زندگی میں آگئے جس کا حاصل محض پٹ لینا اور صبر کرنا نہیں؛ بلکہ مار کھا کر اعلائے کلمۃ اللہ کرنا اور ترویج کلام اللہ کو برابر انجام دینا ہے جس کو قرآن کریم نے جہاد کبیر کہا ہے، اور بعض مدینہ کی زندگی میں آگئے، جس کا حاصل قوت سے استیصالِ فتنہ کر کے اشاعتِ دین کی راہیں ہموار کرنا اور شعائر اللہ کو اونچا بنانا ہے؛ تاکہ دینِ حق ہمہ گیر اور غالب ہو جائے، جس کو جہادِ صغیر کہا گیا ہے۔ دونوں کا مقصود وہی اعلائے کلمۃ اللہ، تبلیغ کلام اللہ اور تربیت خلق اللہ نکلتا ہے، پس "وأعدوا لهم ما استطعتم" جیسی آیاتِ کریمہ سے تیر وتفنگ جمع کر لینا، یا تکوین کائنات کی آیات سے بے محل استنباط کر کے صنعتی، تجارتی اور عسکری کاروبار پھیلانا فی نفسہ خواہ کتنا ہی ضروری ہو؛ مگر خود حریت وآقائی نہیں، آقائی قرآن کو نافذ العمل بنانا ہے، جس کے لئے یہ قوت کی تیاری محض ایک وسیلہ اور ذریعہ سے زائد نہیں جیسے وضو قرآن کی رو سے فرض وواجب سہی مگر ہے بہر حال محض نماز کی کنجی، بلکہ وہ نماز ہی کی وجہ سے ضروری ہے، فی نفسہ نہیں۔

پس اگر ایک قوم نے شوکت حاصل کر لی؛ لیکن اس کی شوکت دین کے حدود وشعائر قائم کرنے سے غافل یا عاجز رہی تو اسے حریت وآقائی کے دعوی یا تصور کا کوئی حق نہیں، وہ بدستور غلام ہے، دوسروں کی ہو یا اپنے نفس کی، زیادہ سے زیادہ دوسرے غلاموں اور اس میں فرق یہ ہوگا کہ ایک بے تلوار کے غلام ہوں گے اور ایک باتلوار؛ لیکن فی نفسِ غلامی میں کوئی فرق نہیں ہوگا، بلکہ تلوار سمیت غلامی زیادہ ننگ وعار ثابت ہوگی۔

بہر حال جو لوگ قرآن کی آیاتِ تکوین کی رو سے مادی وسائل زندگی اور مادہ کی توڑ پھوڑ یا ترکیب وتحلیل سے کچھ اسباب تعیش اور کچھ اسبابِ ہلاکت ایجاد کرتے رہنے اور بالفاظِ دیگر ان سے تاجرانہ طریق پر منتفع ہوتے رہنے ہی کو مقصد حیات اور اسلام کی اصل ترقی باور کرتے ہیں اور پھر ان پر قابو پالینے اور ان کے ذریعہ کچھ رسمی جاہ واقتدار حاصل کر لینے ہی

کا نام خلافت اور ایمانداری بتلاتے ہیں؛ حالاں کہ ان کا یہ دعوی غلط ہے:

(۱) آیاتِ تکوین کی رو سے صحیفۂ کائنات کا مطالعہ ضروری ہے؛ لیکن معرفتِ صانع کے لئے نہ کہ محض معرفتِ مصنوعات اور مادہ کی توڑ پھوڑ کے لئے۔

(۲) مادی اقتدار ضروری ہے؛ لیکن قانونِ فطرت کو نافذ العمل بنانے اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے نہ کہ استبداد و تعیش کے لئے۔

(۳) استخلاف فی الأرض ضروری ہے؛ لیکن مادی حوائج سے غنی بن کر کامل بننے اور بنانے کے لئے، نہ کہ وفورِ اسباب سے اپنی محتاجگی کو بڑھانے اور دنیا کی نقالی کرنے کے لئے۔

(۴) مدنیت اور تمدنی اکتشافات بقدر ضرورت ضروری ہیں؛ لیکن تعاونِ باہمی میں ازدیاد کے لئے؛ نہ کہ مادیت میں غلو اور فناء فی العیش ہو جانے کے لئے۔

(۵) تسخیر کائنات ضروری ہے؛ لیکن روحانی تصرفات کی مشق بہم پہنچانے اور صورتوں کے راستہ سے حقائق تک پہنچنے کے لئے، نہ کہ مادی تصرفات میں محصور اور محدود رہ کر صورت پرستوں اور مختلف الأشکال ڈیزائنوں میں غرق ہو جانے کے لئے۔

(۶) اللہ کے دشمنوں کو خوف زدہ کرنے کے لئے امکانی تیاری (اعداد مستطاع) ضروری ہے؛ لیکن دشمن کی نقالی یا اس کی طرح عدد اور عُدد پر کلیۃ اعتماد کے ساتھ نہیں؛ بلکہ فی الجملہ ان اشیاء کی رعایت رکھ کر، قوت قلب، حوصلہ یقین اور حکیمانہ تدابیر کی ضرورت کے ساتھ۔

(۷) اور بالآخر یہ تمام امور، تمدن، سیاست، امارت، تسخیر، تکوین وغیرہ ضروری ہیں، مگر رضائے الٰہی اور قربِ حق کے لئے، نہ کہ رضائے نفس اور رضائے غیر کے لئے۔

(۸) اور خلاصہ یہ ہے جب کہ ان تمام دینی مقاصد کی تحصیل بغیر اتباع نبوی کے ناممکن ہے، جو حقیقتاً عملی قرآن ہے، تو بطور تفنن طبع کے اگر تعدد قرآن کا نظریہ موزوں ہے تو ''تین قرآن'' کے عنوان کے ساتھ تاکہ کتاب اللہ علمی قرآن ہو، کائنات اللہ برہانی اور تمثیلی قرآن ہو اور رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس عملی قرآن ہو، نہ کہ

''دو قرآن'' کے نظریہ کے ساتھ، جس سے تمثیلی قرآن تو سرے سے حذف ہوجائے اور عملی قرآن باقی بھی رہے، تو تلبیس کے ساتھ اور غیر واقعی ہو کر، یعنی بجائے ذاتِ نبوی کے کائنات آجائے جس سے کوئی اسوہ اور عملی نمونہ اخذ نہیں کیا جاسکتا۔(۱)

سائنسی علوم اور علومِ الٰہی کی حقیقت میں فرق:

وحی اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کے علاوہ اور کوئی ایسا ذریعہ علم نہیں جس کے ذریعہ انسان حقیقت کا ادارک کر سکے، حقیقت کی معرفت ایمان اور دائمی شریعت پر عمل کیۓ بغیر کسی اور ذریعہ سے ممکن ہی نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ تمام روایتی اور مذہبی تہذیبوں میں علم کا منبع اور ذریعہ خارجی ہوتا ہے اور یقین کا فائدہ دیتا ہے، وحی اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات سے حاصل شدہ علم صرف مرئی اور طبعی دینا (physical world) تک محدود نہیں ہوتا؛ بلکہ غیر مرئی دنیا (یعنی موت، برزخ، آخرت) کا بھی علم فراہم کرتا ہے، اس علم سے انسان کو اس بات کا علم بھی ہوجاتا ہے کہ انسان کون ہے، کہاں سے آیا ہے؟ مرنے کے بعد کہاں جائے گا؟ اس کا خالق کون ہے؟ اس کا مقصد زندگی کیا ہے؟، اس علم سے انسان الٰہیات، ایمانیات، اعتقادیات، مابعد الطبعیات اور مادی دنیا سے ماوراء کائنات کا علم بھی حاصل کرتا ہے اس علم کا مقصد خدا کی تلاش، قربت، معرفت اور جستجو ہے، جب کہ اس کے مقابل سائنسی تصور علم اس سے بالکل منفرد ہے، سائنسی تصور علم میں یقین علم کی موت ہے، اس کا منبع انسان ہے، لہٰذا وحی کے ذریعہ حاصل کیا جانے والا علم صحیح معنوں میں علم کہلانے کا مستحق ہے؛ کیونکہ اس علم کی بنیاد انسان سے باہر ہے، یعنی خدا کی طرف سے ہے، سائنسی علوم تصور علم میں جس علم (knowledge) پر یقین ہو وہ سائنسی وفلسفے کی دنیا میں علم ہی نہیں کہلاتا، علم کی بنیاد پر علم کا آغاز اور علم کا انجام شک ہے، شک سے ماوراء علم بلا شک وشبہ دائرہ علم سے خارج ہے، جدید سائنس (moden science) در حقیقت وحی کے علم الرغم اور بغاوت پر مبنی علم کا نام ہے: جو یہ کہتا ہے

(۱) یہ سارا مضمون قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم کی کتاب ''ایک قرآن'' اور ''سائنس اور اسلام'' کا خلاصہ ہے۔

انسان ہی مرکز کائنات (cinter of he universe) ہے، معبود اور فاعل خود مختار ہے، خالق خیر وشر ہے، علم کی تشکیل وحی کے بغیر خالصتاً عقل کی بنیادوں پر کی جاسکتی ہے، عقل کو بنیاد بنا کر ایک ایسے علم کی تعمیر کی جاسکتی ہے جو نہ صرف آفاقی ہوگا؛ بلکہ ہر قسم کی ایمانیات، نظریات ومعروضات سے پاک ہوگا؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام دعوے جھوٹے ہیں، مغرب کا اہم ترین فلسفی (hume) اصول استقراء (induction) کی منطقی اور تجرباتی توجیہہ کو ناممکن تصور کرتا ہے کہ سائنس کو عقلی طور پر واضح نہیں کیا جاسکتا ہے۔(۱)

سائنس اور مذہب کی تعلیمات میں فرق

مذہب کی تعلیمات وحی پر مبنی ہوتی ہیں؛ جب کہ سائنس صرف عقل اور حواس ظاہرہ پر، حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی جو عقل ودانش ہوتی ہے، اس کی بہ نسبت سائنسدانوں کے علم وعقل پر حقیقی معنی میں علم وعقل کے الفاظ کا اطلاق نہیں ہوگا۔

مذہب کی بنیاد انبیاء کرام علیہم السلام پر موقوف ہوتی ہے اور انبیاء کرام علیہم السلام کا علم قطعی اور ان کے تمام نظریات وتحقیقات محکم اور یقینی ہیں اور فلاسفہ اور اہل سائنس کا علم مشکوک اور ان کی بہت سی نظریات وتحقیقات محکم اور یقینی ہیں اور فلاسفہ اور اہل سائنس کا علم مشکوک اور ان کی بہت سی تحقیقات ظنی اور تخمینی ہیں؛ کیوں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کا تعلق علم کے حقیقی سرچشمہ رب کائنات سے ہے، جس کا علم ساری کائنات کو محیط اور جس کے علم میں بھول چوک کا کوئی امکان ہی نہیں، قرآن کریم میں ہے کہ ''لا یضل ربی ولا ینسی'' دوسری جگہ ہے ''ألا یعلم من خلق وھو اللطیف الخبیر ''(۲)

بخلاف سائنسدانوں کے کہ ان کے علم کا تعلق یا تو ان کے افکار سے ہے یا تجربوں سے یا مشاہدات سے جن میں کسی ایک کو بھول چوک اور غلطی سے ماوراء نہیں قرار دیا جاسکتا ہے، حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور سائنس دانوں کے مابین ایک اور فرق یہ بھی ہے کہ

---

(۱) ذاکر نائک، ایک تجزیہ، ایک تحقیق: ۷۷، سمیع الحق، مکتبہ عمر فاروق، شاہ فیصل کالونی، کراچی

(۲) الملک: ۱۴

ہر آنے والا سائنس دان اپنے پیش رو کی تغلیط ومخالفت کو اپنی زندگی کا ایک اہم کارنامہ سمجھتا ہے؛ چنانچہ مشہور فلسفی عالم لطفی جمعہ کے بقول ارسطوطالیس نے اپنے ماقبل الٰہین کی پوری پوری تردید کی یہاں تک کہ ان سب سے برأت حاصل کرلی۔

اور حضرات انبیاء علیہم السلام کی شان یہ ہے کہ ہر آنے والا پیغمبر اپنے سابق پیغمبر کی کھلے دل سے تصدیق وتائید کرتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بات نقل کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُم مُّصَدِّقاً لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَمُبَشِّراً بِرَسُولٍ يَأْتِي مِن بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ" (۱)

"اور جب عیسیٰ ابن مریم نے فرمایا کہ: اے بنی اسرائیل میں تمہارے پاس اللہ کا بھیجا ہوا ہوں کہ مجھ سے پہلے تورات ہے، میں اس کی تصدیق کرنے والا ہوں، اور میرے بعد جو ایک رسول آنے والے ہیں جن کا نام احمد ہوگا ان کی بشارت دینے والا ہوں"

یہی فرق انبیاء کرام علیہم السلام کے دیئے ہوئے علم اور ان کے دیئے ہوئے نظریات وافکار کی غیر مشکوک اور تخمینی ہونے پر ایک بین دلیل ہے، ورنہ ایک سائنسدان دوسرے کی کس طرح تردید ومخالفت کرسکتا ہے؟ اور ظاہر ہے کہ جب تغلیط وتردید کر رہا ہے تو ضرور ایک نہ ایک غلطی پر ہوگا۔ (۲)

کیا سائنسی تحقیقات پر قرآن فہمی موقوف ہے؟

بعض لوگ جدید سائنس سے مرعوب ہوکر یہ راگ الاپ رہے ہیں کہ قرآن میں اتنی آیات کا تعلق سائنس سے ہے، قرآن کی کوئی آیت بھی جدید سائنس سے نہیں ٹکراتی، تو سوال یہ ہے کہ ان سائنسی تحقیقات پر قرآن کا سمجھنا موقوف ہے اور چاند، مریخ اور زہرہ پر کمندیں پھینکنے کی مساعی قرآن کریم کے تقاضے کو پورا کرتا ہے: اس کو سمجھنے کے لئے حضرت

---

(۱) الصف: ۶۰ (۲) حوالہ سابق: ۱۲۸

مولانا مفتی شفیع صاحب کا یہ اقتباس جو آیت قرآنیہ ''تَبَارَكَ الَّذِىْ جَعَلَ فِى السَّمَاءِ بُرُوْجًا'' کے ذیل میں مذکور ہے:

''حقائق کونیہ اور قرآن: - یہاں ایک بات اصولی طور پر سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن کریم کوئی فلسفہ یا ہئیت کی کتاب نہیں جس کا موضوع بحث حقائق کائنات یا آسمانوں اور ستاروں کی ہئیت وحرکات وغیرہ کا بیان ہو مگر اس کے ساتھ ہی وہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی کائنات کا ذکر بار بار کرتا ہے ان میں غور وفکر کی طرف دعوت بھی دیتا ہے۔ قرآن کریم کی ان تمام آیات میں غور کرنے سے واضح طور پر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ قرآن عزیز ان حقائق کونیہ کے متعلق انسان کو صرف وہ چیزیں بتلانا چاہتی ہے جن کا تعلق اس کے عقیدے اور نظریئے کی درستی سے ہو یا اس کے دینی اور دنیوی منافع ان سے متعلق ہوں۔ مثلاً قرآن کریم نے آسمان و زمین اور ستاروں، سیاروں کا اور ان کی حرکات اور حرکات سے پیدا ہونے والے آثار کا ذکر بار بار ایک تو اس مقصد سے کیا ہے کہ انسان ان کی عجیب وغریب صنعت اور مافوق العادت آثار کو دیکھ کر یہ یقین کرے کہ یہ چیزیں خود بخود پیدا نہیں ہوگئیں ان کو پیدا کرنے والا کوئی سب سے بڑا حکیم سب سے بڑا علیم اور سب سے بڑا صاحب قدرت وقوت ہے اور اس یقین کے لئے ہرگز اس کی ضرورت نہیں کہ آسمانوں کی اور فضائی مخلوقات اور ستاروں، سیاروں کے مادے کی حقیقت اور ان کی اصلی ہئیت وصورت اور ان کے پورے نظام کی پوری کیفیت اس کو معلوم ہو بلکہ اس کے لئے صرف اتنا ہی کافی ہے جس کو ہر شخص مشاہدہ سے دیکھتا اور سمجھتا ہے کہ شمس وقمر اور دوسرے ستاروں کے کبھی سامنے آنے اور کبھی غائب ہو جانے سے نیز چاند کے گھٹنے بڑھنے سے اور رات دن کے انقلاب سے پھر مختلف موسموں اور مختلف خطوں

میں دن رات کے گھٹنے بڑھنے کے عجیب وغریب نظام سے جس میں ہزاروں سال سے کبھی ایک منٹ ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آتا، ان سب امور سے ایک ادنی عقل وبصیرت رکھنے اولا انسان یہ یقین کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ سب کچھ حکیمانہ نظام یوں ہی خود بخود نہیں چل رہا، کوئی اس کو بنانے چلانے والا اور باقی رکھنے والا ہے اور اتنا سمجھنے کے لئے انسان کو نہ کسی فلسفی تحقیق اور آلات رصدیہ وغیرہ کی حاجت پڑتی ہے نہ قرآن نے اس کی طرف دعوت دی۔قرآن کی دعوت صرف اسی حد تک ان چیزوں میں غور وفکر کی ہے جو عام مشاہدے اور تجربے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ رسول کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آلات رصدیہ بنانے یا مہیا کرنے اور اجرام مساویہ کی ہئیتیں دریافت کرنے کا مطلقا کوئی اہتمام نہیں فرمایا۔اگر ان آیات کونیہ میں تدبر اور غور وفکر کا یہ مطلب ہوتا کہ ان کے حقائق اور ہئیات اور ان کی حرکات کا فلسفہ معلوم کیا جائے تو یہ ناممکن تھا کہ رسول اللہ ﷺ اس کا اہتمام نہ فرماتے، خصوصا جبکہ ان فنون کا رواج اور تعلیم وتعلم کا سلسلہ دنیا میں اس وقت موجود بھی تھا۔مصر، شام، ہند، چین وغیرہ میں ان فنون کے جاننے الے اور ان پر کام کرنے والے موجد تھے۔حضرت مسیح علیہ السلام سے پانچ سو سال پہلے فیشا غورس کا اور اس کے کچھ بعد بطلیموس کا نظریہ دنیا میں شائع اور رائج ہو چکا تھا اور اس زمانے کے حالات کے مناسب آلات رصدیہ وغیرہ ایجاد بھی ہو چکے تھے، مگر جس ذات قدسی پر یہ آیات نازل ہوئیں اور جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہ نے بلاواسطہ آپ سے ان کو پڑھا انہوں نے بھی اس طرف التفات تک نہیں فرمایا۔اس سے قطعی طور پر معلوم ہوا کہ ان آیات کونیہ میں تدبر اور غور وفکر کا وہ منشا ہرگز نہ تھا جو آج کل کے بعض تجدد پسند علما نے یورپ اور اس کی تحقیقات سے متاثر ہو کر اختیار کی ہے کہ

خلائی سفر، چاند اور مریخ و زہرہ پر کمندیں پھینکنے کی مساعی قرآن کریم کے تقاضے کو پورا کرنا ہے۔

بس صحیح بات یہ ہے کہ قرآن کریم نہ ان فلسفی اور سائنسی تحقیقات قدیمہ یا جدیدہ کی طرف لوگوں کو دعوت دیتا ہے نہ ان سے بحث کرتا ہے اور نہ ان کی مخالفت کرتا ہے۔قرآن کریم کا حکیمانہ اصول و اسلوب کائنات ومخلوقات سے متعلقہ تمام فنون کے بارے میں یہی ہے کہ وہ ہر فن کی چیزوں سے صرف اسی قدر لیتا اور بیان کرتا ہے جس قدر انسان کی دینی یا دنیوی ضرورت سے متعلق ہے اور جس کو انسان آسانی سے حاصل بھی کر سکتا ہے اور جس کے حصول پر تخمیناً اس کو اطمینان بھی ہوسکتا ہے فلسفیانہ دوراز کار بحثوں سے اور ایسی تحقیقات سے جو عام انسانوں کے قابو سے باہر ہیں اور جن کو کچھ حاصل کر لینے کے بعد بھی قطعی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ہی صحیح ہیں بلکہ حیرانی اور شکوک بڑھتے ہیں، ایسی بحثوں میں انسان کو نہیں الجھاتا۔ کیونکہ قرآن کی نظر میں انسان کی منزل مقصود ان تمام زمینی اور آسمانی کائنات ومخلوقات سے آگے اپنے خلاق کی مرضیات پر چل کر جنت کی دائمی نعمتوں اور راحتوں کو حاصل کرنا ہے۔ حقائق کائنات کی بحث نہ اس کے لئے ضروری ہے اور نہ اس پر پورا عبور انسان کے بس میں ہے۔ ہر زمانے کے فلاسفروں اور ماہرین فلکیات کے نظریات میں شدید اختلافات اور روزمرہ کے نئے انکشافات اس کی واضح دلیل ہیں کہ کسی نظریہ اور تحقیق کو یقینی اور آخری نہیں کہا جا سکتا۔ انسانی ضرورت سے متعلقہ تمام فنون، فلکیات، کائنات فضا، ابرِ باراں، خلا، طبقات الارض، پھر زمین پر پیدا ہونے والی مخلوقات، جمادات، نباتات، حیوانات سے اور عام انسان اور انسانی علوم وفنون، تجارت، زراعت صنعت وغیرہ ان سب میں سے قرآن حکیم صرف ان کی روح

اور مشاہداتی حصہ کو اس قدر لیتا ہے جس سے انسان کی دینی یا دنیوی ضرورت متعلق ہے، دوراز کار تحقیقات کی دلدل میں انسان کو نہیں پھنساتا؛ البتہ کہیں کہیں کسی خاص مسئلے کی طرف اشارہ یا صراحت پائی جاتی ہے۔

اس تمام تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ کائنات افلاک وفضااور کائنات اراضی میں غور وفکر اس حیثیت سے کہ انہیں پیدا کرنے والے کے وجود اور توحیداور اس کی بے مثال علم وقدرت پر استدلال کیا جاسکے عین مقصود قرآنی ہے اور قرآن جا بجا اس کی دعوت دے رہا ہے اور اس حیثیت سے کہ ان چیزوں سے انسان کے معاشی مسائل کا تعلق ہے وہ بھی ضرورت کی حد تک منشا قرآنی ہے اور قرآن اس کی طرف بھی دعوت دیتا ہے مگر اس فرق کے ساتھ کہ معاش اور معاشی ضروریات کو اصل مقصد قرار دیکر اس میں انہاک نہ کرے بلکہ اس موجودہ زندگی کو اصلی زندگی کی طرف ایک سفر کا درجہ قرار دے کر اس کے مطابق اس میں مشغول ہو اور تیسری حیثیت چونکہ انسانی ضرورت سے زائد بھی ہے اور اس کا حصول بھی مشکل ہے اس میں عمر عزیز صرف کرنے سے گریز کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہاں سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ موجودہ سائنس کی جدید ترقیات وتحقیقات کو عین منشا قرآنی سمجھنا بھی غلط ہے جیسا کہ بعض تجدد پسند علمانے لکھا ہے اور قرآن کو ان کا مخالف کہنا بھی غلط ہے جیسا کہ بعض قدامت پسند علمانے کہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن نہ ان چیزوں کے بیان کے لئے آیا ہے نہ یہ اس کا موضوع بحث ہے نہ انسان کے لئے ان کا حاصل کرنا آسان ہے نہ انسانی ضروریات سے اس کا کوئی تعلق ہے۔ قرآن ان معاملات میں ساکت ہے۔ تجربات ومشاہدات سے کوئی چیز ثابت ہو جائے تو اس کو قرآن کے منافی کہنا بھی صحیح نہیں۔ چاند کے

اوپر پہنچنا، رہنا بسنا اور وہاں کی معدنیات وغیرہ سے نفع اٹھانا وغیرہ سب اس میں داخل ہیں ان میں سے کوئی چیز مشاہد اور تجربہ سے ثابت ہو جائے تو اس کے انکار کی کوئی وجہ نہیں اور جب تک ثابت نہ ہو خوامخواہ اس کے تصورات باندھنا اور اس میں عمر عزیز کے اوقات صرف کرنا بھی کوئی دانشمندی نہیں۔ واللہ سبحانہ و تعالی اعلم" (۱)

جدید اور قدیم سائنس کا فرق

جدید اور قدیم سائنس کے تقابلی مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ سترہویں صدی تک سائنس نے کامل الحاد کا رنگ اختیار نہیں کیا تھا، کوپرنیکس، کیپلر، گیگلو، نیوٹن اور سائنس کے دوسرے علمبرداروں میں سے کوئی بھی خدا کا منکر نہ تھا، مگر یہ کائنات کے اسرار کی جستجو میں الٰہی نظریہ سے قطع نظر کر کے ان قوتوں کو تلاش کرنا چاہتے تھے، جو اس نظام کو چلا رہی ہیں، لیکن اس نظریہ نے جدید وقت میں ایک بے خدا سائنس تیار کرنے میں مرکزی کردار ادا کیا؛ کیونکہ سائنس کے نزدیک انسان کا کائناتی تسلط ہی اصل حقیقت اور مقصد انسانی ہے۔

(۱) قدیم سائنس میں فطرت کا مطالعہ برائے مطالعہ ہوتا تھا، جب کہ جدید سائنس میں تسخیر فطرت کے لئے ہوتا ہے۔

(۲) قدیم سائنس معاشرے کے لئے ایک خادم کی حیثیت سے کام کرتی تھی جب کہ جدید سائنس حاکمانہ تسلط قائم کرتی ہے۔

(۳) قدیم سائنس کا وجود حقیقت کے تصور سے نکلتا تھا، وہ جو حقیقت مطلق اور حقیقتِ ازلی ہے جیسے باری تعالی، اس کے برعکس جدید سائنس کا تصور حقیقت مطلقہ "خدا" سے انکار پر مبنی ہے۔

(۴) قدیم سائنس میں زندگی کا ایک مقصد اور نصب العین ہوا کرتا تھا، جب کہ جدید سائنس نے مادی ترقی کو فروغ دے کر انسان کو ہر گناہ میں مبتلا کر دیا، زندگی کا مقصد، لہو ولعب اور پر تعیش زندگی گذارنا قرار دیا، جس کے لئے ایجادات کا

---

(۱) معارف القرآن: ۶/ ۴۸۹، ۴۹۰

سیل رواں چل رہا ہے۔

(۵) جدید سائنس کا تعلق سرمایہ داری سے ہے، اگر جدید سے سرمایہ داری کو الگ کر دیا جائے تو جدید سائنس کی بنیادیں ہی متزلزل ہو جائیں گی، جدید سائنس اور سرمایہ داری لازم وملزوم ہیں۔(۱)

سائنس اور مفروضات

قیاس وگمان، مفروضات، اندازوں کے ذریعے سائنس کا سفر آگے بڑھتا ہے، کوئی سائنسداں سائنسی نتائج کو قطعی اور حتمی تسلیم نہیں کرتا، سائنسداں کہتے ہیں کہ ہم ایک وقت میں سب کچھ نہیں جان سکتے، ہم ایک وقت میں مادہ کا مقام جان سکتے ہیں یا اس کی رفتار، اسی طرح تمام سائنسی نظریات تجربات کے بعد قائم نہیں کرتے، بہت سے سائنسی نظریات قیاس وگمان، وجدان اور اندازے پر قائم کئے جاتے ہیں، جیسا کہ (yulawa) نے مختلف ذرات کے بارے میں پیشن گوئی کی تھی جو پوری ہوئی، مشاہدات اور تجربات ہونے کے بعد کوئی یہ صلاحیت نہیں رکھتا کہ وہ یہ ثابت کرے کہ یہ ٹھیک ہے، یا غلط۔

اس بحث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ بڑے بڑے سائنسی نظریئے پہلے صرف مفروضات کی سطح پر ہوتے ہیں، تجربات اور مشاہدات کے نتائج کی بنیاد پر اخذ نہیں کئے جاتے، جیسے آئن اسٹائن کا نظریہ اضافیت ۱۹۱۳ء میں منظر عام پر آیا تھا اور اس کی تصدیق وتائید ۱۹۱۹ء میں ہوئی تھی، مفروضات، قیاس، وجدان اور گمان سے بڑے بڑے نظریئے وجود میں آتے ہیں، اور بعد میں تصدیق وتوثیق ہوتی ہے، لہٰذا سائنس کو حقیقی علم کیسے کہا جاسکتا ہے؟ (۲)

جدید سائنس کے نقصانات

جدید فلسفہ اور جدید سائنس جس کی بنیاد ہی مذہبی قیود کی آزادی پر رکھی گئی ہے، ایک مدت سے بڑی آزادی کے ساتھ پھلنے پھولنے کے بعد اپنے ثمرات وبرکات دنیا کو

---

(۱) ذاکر نائک، ایک تجزیہ، ایک تحقیق، :۷۷، سمیع الحق، مکتبہ عمر فاروق، شاہ فیصل کالونی، کراچی

(۲) ذاکر نائک، ایک تجزیہ، ایک تحقیق، :۹۹، سمیع الحق، مکتبہ عمر فاروق، شاہ فیصل کالونی، کراچی

دے رہی ہے، آیئے اس چلتی پھرتی دینا کا ایک سرسری جائزہ لے لیں۔

سائنس کی نت نئی ایجادات اور انکشافات انسان کا فائدہ کم اور نقصان کا زیادہ موجب بن سکتی ہیں، ہاتھ سے کام کرنے کے بجائے اگر انسان مشین سے کام کرنے لگے، جانوروں پر سفر کرنے کے بجائے اگر ریل، موٹر اور بحری وہوائی جہازوں پر میں دوڑنے لگے، ڈاک چوکیوں کے بجائے آج موبائیل فون، ٹیلفون اور انٹرنیٹ پر خبر رسانی ہونے لگی تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان پہلے سے زیادہ خوش حال ہو گیا، ان چیزوں سے اس کی جس قدر خوشحالی بڑھ سکتی ہے، آج جنگی سامان، راکٹ، ایٹم اور ہائیڈروجن بم اور ایسے ایسے آتشیں سامان جنگ وجود میں آچکے ہیں کہ اب اگر انسان چاہے تو چند گھنٹوں میں اپنے مسکن یعنی کرہ ارضی کو مخلوق سمیت عدم کی راہ دکھا سکتا ہے، پھر تمدن کے نئے نئے مسائل اور نئے نئے حالات سامنے آنے کی وجہ سے مختلف قسم کے نئے علوم، نئے قوانین حیات، نئے ضوابط سیاست وجہانبانی، نئے اصولِ تجارت اور نئے اندازِ کاروبار بھی ایجاد ہوگئے ہیں، ان تمام نئے اسباب ووسائل اور نئی ایجادات ومصنوعات کی اتنی افراط وبہتات کی حالت میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ خود حضرت انسان اب کس حال میں؟ اس مشینی دور میں کیا ایسا تو نہیں ہے کہ خود انسان بھی کمانے، کھانے اور اڑانے کی ایک مشین ہی بن کر رہ گیا ہے، ہر وہ انسان جس کے چہرے پر دو آنکھیں، سینے میں دل اور سر میں دماغ موجود ہے، وہ دیکھ سکتا ہے، سمجھ سکتا ہے کہ مصنوعات اور سامان آرام وآسائش کی کثرت کی بدولت آج انسان کا یہ حال ہے کہ وہ ختم نہ ہونے والی نفسانی خواہشات اور سفلی جذبات کا غلام بن کر قلبی سکون اور روحانی طمانینت کو کھو بیٹھا ہے، پہلے ادوار میں جب کہ طرز زندگی اور فیشن ایک عرصہ کے بعد بدلا کرتے تھے، اب نئے نئے سامان مہیا ہونے کی وجہ سے ہر لحظہ بدلتے رہتے ہیں۔

انہیں سائنسی ایجادات کی وجہ سے انسان آج اصلی دودھ، گھی اور انڈوں سے محروم ہے، البتہ ملٹی نیشنل کمپنیوں کے گھی، دودھ، پنیر اور دہی دستیاب ہیں، جس کے بارے میں ہم نہیں جانتے کہ اس میں خالص حصہ کتنا ہے؟ اور ملاوٹ کتنی؟

تاریخ انسانی میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ لوگوں کو نیند نہ آئی ہو، سونے کے لئے گھر سے باہر سونے کی دکانوں میں جانا پڑا ہو، یورپ میں لوگوں کو نیند نہیں آتی ؛ لہٰذا ان کی خدمت کے لئے ملٹی نیشنل کمپنیوں نے سونے کی دکانیں کھول رکھی ہیں، جہاں پیسے دے کر سوجائیے، وہ کونسی تہذیب ہے؟ اس کا کیا نظام اور اقدار لی؟ کہ لوگ اپنے گھر کے بستروں کے بجائے بازار میں سونا چاہتے ہیں۔

سائنس وٹکنالوجی کی بدولت بے پردگی، عریانی، سینما اور تھیٹر کی زندگی اور محرک اشیاء، شراب وغیرہ کے استعمال سے انسان کے شہوانی جذبات حد اعتدال سے زیادہ برانگیختہ ہونے لگے، جس کے نتیجے میں صحت اور اعتدال مزاج سے ہاتھ دھونا پڑا، پھر طرح طرح کی بیماریاں اور پھر ہسپتالوں اور علاج ومعالجوں کی جکڑ نے انسانی زندگی کو مفلوج بنا رکھا ہے، کسی بالا وبرتر طاقت کے سامنے جوابدہی کے احساس کے فقدان کی وجہ سے ہر معاملہ اور زندگی کے ہر موڑ پر افراط وتفریط کی راہ اختیار کرلی گئی ہے، یہ بات ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ جس وقت خواہشات وجذبات کا سمندر موجزن ہو، اسباب مہیا ہوں، کوئی روکنے والا نہ ہو، تو ایک عقل منداور زیرک سے زیرک انسان کس حد تک جا پہنچتا ہے؛ چنانچہ یورپی ممالک میں مرد وزن کے آزادانہ اختلاط اور ساتھ ساتھ تعدد ازدواج پر پابندی کی وجہ سے ایک طرف تو نکاحوں اور طلاقوں کی بھرمار ہے، خاندانی نظام تباہ ہوکررہ گیا ہے، کیا ایسی تہذیب جو جدید سائنس زیر سایہ پنپ رہی ہے، اس کو ترقی کا نام دینا کہاں تک موزوں ہوسکتا ہے؟

ماحولیاتی تباہی اور سائنس وٹیکنالوجی

سائنس اور ٹیکنالوجی نے جہاں نت نئی ایجادات عطاء کی ہیں اور صنعتی سرگرمیوں نے بے پناہ ترقی کر کے انسان کو اس کی ضروریات مہیا کی ہیں، وہاں ان ایجادات نے انسان کو نفسیاتی امراض میں مبتلا کیا ہے اور بہت سے تباہ کن نقصانات بھی پہنچائے ہیں، صنعتی ترقی زمین کے درجہ حرارت میں تیز رفتار اضافہ کا سبب بن رہی ہے، جو محض چند دہائیوں میں دنیا آگ کی بھٹی میں تبدیل ہوگئی ہے، یہ سب کچھ ان نئ مصنوعات

(products) کے استعمال کی وجہ سے جس کی وجہ سے ہر فرد انفرادی لذت حاصل کرنے اور دنیا کو جہنم میں تبدیل کرنے میں لگا ہوا ہے، گذشتہ کئی سالوں سے کاربن ڈائی آکسائیڈ (Co2) اور گرین ہاوس گیسز () برف پگھلنے کے باعث خارج ہوکر فضاء میں شامل ہورہی ہیں، اور گلوبل وارمنگ میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے، کئی ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر آئندہ پچاس برس میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کے اخراج کے عمل کو کم نہیں کیا گیا تو تباہی پھیل جائے گی۔

اسی ماحولیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے آرٹک اور بحر اٹلانٹک کی برفانی تہیں اور گرین لینڈ کے علاقوں میں برف مسلسل پگھل رہی ہے، ماہرین کے اندازے کے مطابق ۲۰۵۰ تک دنیا کے ہزاروں شہر ڈوب جائیں گے، تو دوسری طرف عالمی جنگ بھی پانی کے حصول کے لئے لڑی جائے گی۔(۱)

انسان جس کو سائنس دریافت نہ کرسکی

جدید علماء سائنس طویل تجربہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سائنسدانوں کی عقل وفکر حقیقت انسانی کے ادراک میں بے بس اور ناکام ثابت ہوئی ہیں؛ کیونکہ انسان کے جسم میں حیاتیاتی مظاہر گویا ایک طلسماتی جنگل ہیں جہاں رنگ برنگ کے بے شمار درخت مسلسل طور پر اپنی جگہ اور اپنی شکل بدلتے رہتے ہیں۔

چنانچہ فرانس کے ایک بڑے نامی گرامی کاریل نے پوری ایک کتاب ”نامعلوم انسان“ کے نام سے لکھ ڈالی کہ انسان نے گو بے شمار علوم وفنون کے کتب خانے بھر ڈالے ہیں؛ لیکن خود یہ یا اس کی انسانیت ہے کیا؟ اس سے جاہل ہی چلا جاتا ہے، اس طرح ایک اور بڑے عالم سائنس نے ایک ضخیم کتاب ”سائنس کے ناحل مسائل“ پر لکھ ڈالی، اس میں بھی سائنس کا سب سے ناحل مسئلہ انسان کو قرار دے کہا:

> ”سائنس دان کسی بحث ومسئلہ میں اس سے زیادہ عاجز درماندہ جتنا خود انسان کے معاملے میں: وہ ایٹم کو توڑ سکتا ہے، بعید سے بعید ستاروں کی

---

(۱) حوالہ: سابق:۱۰۲

روشنی کی تحلیل وتجزی کرسکتا ہے، وہ بجلی کو غلام بنا سکتا ہے، لیکن یہی سائنسدان جب زندگی کی حقیقت اوراس سے بڑھ کرخود اپنی یا انسان کی حقیقت سمجھنا چاہتا ہےتو مشکلات ہی مشکلات سے دوچار ہوتا ہے'' (۱)

سائنس صرف مشاہدات اور تجربات پر مبنی ہے

سائنس صرف محسوسات، تجربات اور مشاہدات کی بات کرتی ہے، مثلا جب کوئی آدمی یہ دریافت کرے کہ پانی کیسے بنا؟ تو اس کے اس سوال کے جواب سے یہ منشا ہوگا کہ جواب دینے والا پانی بننے کے واقعے کا تجزیہ کرکے یہ بتلائے کہ جس مرکب کا نام پانی ہے، اس کی ترکیب کن عناصر سے ہوئی ہے اوران عناصر کے باہم ملانے کا طریقہ کیا ہے؟ تو سوال کا یہ منشا جواب کو واقعات اوران کے مشاہدات اوران کے اوران کے درمیان علت ومعلول کے رشتوں کی دریافت تک محدود کردینا ہے، سائنس صرف محسوسات ومشاہدات اور تجربات کی بات کرتی ہے۔

جب کہ مذہب صرف حسی مشاہدوں ہی نہیں؛ بلکہ بصیرت کی آنکھوں سے ضروری ہے؛ تاکہ اس مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر خدا کو پہچانا جائے، یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ان لوگوں کو اندھا اور بہرا کہہ دیا جو محسوسات میں الجھ گئے؛ حالانکہ وہ حقیقی طور پر اندھے اور بہرے نہیں تھے؛ بلکہ بصیرت اور معرفت خداوندی سے اندھے اور بہرے تھے۔

قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے:

''صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ'' ادراک بالحواس کے ہوتے ہوئے اگر معرفتِ الٰہی کی سعادت سے محروم ہوجائے تو اس کو اندھا اور بہرا ہی کہا جاتا ہے، چاہے وہ مادی ترقی کتنا ہی کرے، اسی وجہ سے سائنس اندھی اور بہری جو کسی صورت میں معرفتِ خداوندی کے لئے کافی نہیں۔

سائنس جو کہ صرف حسی اور مشاہداتی اور تجرباتی حقائق سے گفتگو کرتی ہے اور جو چیز مشاہدہ اور تجربہ میں نہ آسکے اس کا انکار کرتی ہے، جب کہ مذہب ہزاروں ایسی چیزوں کی

---

(۱) مذہب اور سائنس: ۵۱-۵۲

باتیں کرتا ہے جو ماوراءِ محسوس ہو، محسوس اور غیر محسوس کا یہ فرق ان دونوں کے درمیان تضاد اور تخالف کو نمایاں کرتا ہے، مثلاً معجزہ، ملائکہ، روح، جنت، دوزخ، حضرت آدم علیہ السلام کا مٹی سے پیدا ہونا، حیات بعد الممات، خدا، آخرت، وحی، مذہب میں بنیادی عقائد ہیں اور ایک مذہبی آدمی ان سب عقائد کو محسوس نہ ہونے کے باوجود دل وجان سے قبول کرتا ہے۔

سائنس جو خدا کا انکار کرتی ہے، آخرت اور وحی کا انکار کرتی ہے، اس کی اسلام کاری کیسے ممکن ہوسکتی ہے، البتہ اسے محض اپنے آرام وراحت کے حصول کے لئے ذریعہ ضرور بنایا جاسکتا ہے، لیکن اس کو مطمح نظر اور مقصد زندگی نہیں بنایا جاسکتا، چونکہ اس سائنس نے اور جدید ایجادات نے انسان کا اپنے خدا سے روحانی رشتہ ختم کردیا، جس نے خدا کی جگہ ایک نئے دیوتا کا روپ دھار لیا اور جس نے انسان کو قائم بالذات ہونے کے زعم میں مبتلا کردیا اور اس کو عیش پرست کردیا۔(۱)

قرآن کی ہزاروں آیتیں جدید سائنس کی مخالف ہیں

بہت سارے لوگوں کا یہ دعوی کہ قرآن کے کسی بھی بیان کو جدید سائنس کی روشنی میں غلط نہیں قرار دیا جاسکتا، یہ دعوی بالکل غلط اور حقائق سے کوسوں دور ہے اور یہ قرآن اور سائنس کو بے جا ایک لائن میں لا کھڑا کرنا سعی لا حاصل ہے، قرآن بالکل علاحدہ چیز ہے اور سائنس بالکل علاحدہ چیز ہے جیسا کہ مذکور ہوا، قرآن کا مقصود بھی سائنس بیان کرنا نہیں ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ: خدا موجود ہے جو کہ تمام مخلوقات کا رب ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالی فرماتے ہیں: ’’اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ‘‘(۲) ’’وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ، إِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ‘‘(۳) ’’اَللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ‘‘ (۴) قرآن کہتا ہے کہ خدا موجود ہے؛ لیکن سائنس تو خدا کا انکار کرتی ہے؛ کیوں کہ سائنسی نظریہ میں اب انسان حواس ظاہرہ اور اپنی عقل کی بناء پر

(۱) حوالہ سابق:۱۲۷ (۲) الفاتحۃ:۱

(۳) البقرۃ:۱۱۵ (۴) البقرۃ:۲۵۵

بالغ ہو چکا ہے، اب کسی ماورائے انسان، وجود یا ذریعے سے علم ورہنمائی کا محتاج نہیں، اس کے برعکس قرآن یہ علم اور یقین بخشا ہے کہ خالق کا وجود ہے، وہی خالق کھانا بھی کھلاتا ہے، شفاء بھی بخشا ہے، اختیار وقدرت بھی صرف اسی کو حاصل ہے، انسان ہر لحظہ اس کا فقیر اور غلام ہے۔

قرآن میں متعدد مقامات پر آخرت کا ذکر آیا ہے، کیا کوئی جدید سائنس سے آخرت کو ثابت کرسکتا ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

”مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحاً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُون“ (۱)

اسی طرح صلاۃ (نماز) کا ذکر قرآن میں ۶۷ مقامات پر، رسول پیغمبر انبیاء کا ذکر ۵۰۰ سے زائد مقامات پر، جنت ۷۰ مرتبہ، جہنم ۶۴ مرتبہ، جنات ۷۰ مرتبہ، قیامت: ۶۶ مرتبہ بیان کئے گئے ہیں، لیکن ان میں کوئی بھی چیز جدید سائنس سے ثابت نہیں کی جاسکتی ہے، ان متعدد آیات کا سائنس کے ساتھ ٹکراؤ ہے؛ بلکہ جدید سائنس کی روشنی میں یہ آیات غلط ہیں۔

جدید سائنس عیسائیت سے مادیت پرستی تک

جدید سائنس کی اصل حقیقت کو سمجھنے کے لئے ہمیں مادیت پرستی کی تاریخ کا مطالعہ کرنا ہوگا، عیسائیت سے مادیت کا یہ سفر کیسے طئے ہوا؟ کون اس کا ذمہ دار تھا؟ یورپ میں نصف سے زیادہ زمینوں کی ملکیت کا کلیسا کے پاس ہونا، کلیسا کی دولت پرستی میں مبتلا ہونا، قوت کے زعم میں مظالم کا ارتکاب یونانی سائنسی نظریات کو عیسائی الٰہیات واعتقادات کا حصہ بنانے کے بعد اس کے سائنسی ابطال کو تسلیم کرنے سے انکار اور ان مذہبی وسائنسی نظریات کے ابطال کرنے والوں پر بہیمانہ تشدد کی تاریخ جب کلیسا نے ہزاروں عیسائیوں اور عورتوں پر مظالم کئے، قتل کیا، عورتوں کو زندہ جلا دیا، کلیسا کے اخلاقی انحطاط کے نتیجے میں کلیسا کی شکست، کلیسا کی دنیا پرستی اور بربریت کے ردعمل میں یہ

(۱) البقرۃ:۶۲

پروٹسٹنٹ ازم کا فروغ، تحریک تنویر، تحریک رومانویت، قومی ریاستوں کا قیام، سرمایہ داری کا وجود، جدید فلسفہ اور جدید سائنس کا فروغ، نوآبادیات کا قیام کے نتیجے میں دولت کی لوٹ مار اور اس کے دروازے سمیٹ کر یورپ میں جمع ہونا، سرمایہ دارانہ فکر کا ارتقاء، سرمایہ دارانہ نظام کی تاریخ، امریکی ریاست کا قیام، بنیادی حقوق کے منشور کی تاریخ وغیرہ وغیرہ، ان مباحث پر گہری نظر کے بغیر جدید سائنس کے حیرت انگیز ارتقاء کی کہانی سمجھ میں نہیں آسکتی۔

سائنس: نیچرل فلاسفی کہلاتی تھی

انیسویں صدی کے آخر تک سائنس نیچرل فلاسفی کہلاتی تھی، لیکن انیسویں صدی کے اختتام پر اسے فلسفہ سے الگ کر دیا گیا اور سائنس خود ایک ذریعہ علم بن گئی، سائنس اور فلسفے میں جب تک ہم آہنگی تھی چیزوں کی حقیقت اور قدر کا سوال برقرار رہتا تھا مثلاً یہ سوال موجود رہتا تھا کہ میں پانی کیوں پیوں؟ لیکن سائنس جب فلسفے سے الگ ہوئی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ سوال بے کار تھا کہ پانی پیا جائے یا نہیں، اس سوال کی ضرورت ہی نہ رہی، اصل سوال یہ ہوگیا کہ اچھے طریقے سے پانی کیوں پیا جائے دلیل (reason) اور (rational) عقلیت جب آلاتی (instrumental) ہوگئے تو سائنس فلسفہ سے الگ ہوگئی، جدید سائنس کا بانی نیوٹن ایک مذہبی شخص اور فلسفی بھی تھا، اس نے بھی سائنس کو فلسفے سے الگ نہیں سمجھا، اس کی کتاب کا نام (principle methematical natural philosophy) تھا، نیوٹن نے نصف زندگی مذہبی کتابیں لکھیں، وہ خدا کے وجود کا قائل تھا؛ لیکن اس کا خیال کہ خدا کائنات بنا کر اس سے الگ تھلگ ہوگیا ہے، اس تصور نے ایک نئے بے خدا سائنس تیار کرنے میں مرکزی کردار ادا کیا، لطف کی بات ہے کہ ڈیکارٹ نے بھی ذہن سے خدا کا تصور پیش کیا، کانٹ نہایت مذہبی شخص تھا؛ لیکن ڈیکارٹ، نیوٹن اور کانٹ جو خدا کے قائل تھے ان کے پیش کردہ فلسفہ کے نتیجے میں خدا کا وجود مغربی تہذیب و تاریخ سے خارج کر دیا گیا، قدیم سائنس میں خدا کا تصور، خدا کا کردار موجود تھا؛ کیوں کہ وہاں انسان مخلوق تھا، خالق نہ تھا، اپنے مخلوق ہونے کا احساس

اسے خدا اور آخرت کے تصورات سے وابستہ رکھتا تھا، لیکن (newonian) تصور کائنات کے بعد کائنات ایک (subject) ہے اور انسان محض (object) اس کے نتیجے میں مادی تصور کائنات وقوع پذیر ہوا جس نے خالق کی جگہ لے کر انسان کو خالق قرار دیا۔

ہندوستان کی دولت ایجادات کی باعث

اٹھارہویں صدی کے وسط تک انگلستان زرعی ملک تھا؛ لیکن پلاسی کی جنگ کے بعد ہندوستان کی دولت سمندری طوفان کی طرح انگلستان میں آنے لگی، یہی دولت ایجادات کا باعث بنی، برطانیہ کی صنعتی تاریخ کے ماہر ڈاکٹر کنگھم نے لکھا ہے کہ "ایجادیں اتنے بڑے پیمانے پر صرف اس لئے نہیں ہوئیں کہ جیسے لوگوں کی ذہانت آناً فاناً پھوٹ پڑی ہو، اصل وجہ یہ تھی کہ ملک میں سرمایہ اتنا اکھٹا ہوگیا تھا کہ ان ایجادات کا مصرف نکلنے کا امکان پیدا ہوگیا تھا" اس موضوع پر (leo huberman) کی کتاب (man,s worldy goods) بہت سے حقائق آشکارا کرتی ہے، نوآبادیات میں لوٹ مار کہانی مائیکل مین کی کتاب (darkside of democracy) اور رومیل کی کتاب (death by government) میں پڑھی جاسکتی ہے، مائیکل مین کہتا ہے کہ نسلی قتل عام مغربی تہذیب کی خصوصیت ہے جس کی بنیاد قوم پرستی پر رکھی گئی جو مغربی تہذیب کی بہیمیت کا فطری جواز مہیا کرتی ہے، اس کے الفاظ ملاحظہ کیجئے:

> the unfortunately for us murderous ethnic cleansing is not primitive or it belongs ti our own eivilization and us .most say this ti the rise of nationalism in the world and this ture

پچاس کروڑ لوگوں کی لاشوں اور کھربوں روپیئے کی لوٹ مار پر جدید سائنس کی عمارت کھڑی کی گئی ہے، لوٹ مار کی یہی دولت اس حیرت انگیز سائنسی ترقی کی بنیاد بنی جو

آج ہر شخص کو فطری حقیقی ضروری اور عین اسلامی معلومات دیتی ہے، کیا مذہبی ریاستیں جبر واستبداد اور لوٹ مار کا مذہبی جواز فراہم کرسکتی تھیں، مذہبی معاشروں میں اس بہیمیت کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا، عیسائیت کی خامیوں، کوتاہیوں اور مذہبی استبداد کے باوجود اس کا موازنہ اگر مہذب متمدن جدید سائنسی یورپی انسانوں کی لوٹ مار سے کیا جائے تو ہمیں مذہبی دور جو مغرب کی اصطلاح میں (dark age) تاریک دور، جدید دور (engligthened) روشن خیال کے مقابلے میں زیادہ شریفانہ، محبت اور قابل رشک نظر آئے گا، اس کے ظلم و جبر بھی لامحدود نہیں تھے، محدود ہی تھے؛ کیوں کہ عسکری آلات بھی اسی علمیات کے نتیجے میں تیار ہوئے تھے، جس کے مطابق تمام مخلوق اللہ کا کنبہ سمجھی جاتی تھی اور اس کنبہ کی ہولناک تباہی کا تصور الہامی مذاہب میں نہیں پایا جاتا، مذہبی تہذیبوں کی سائنس ایٹم بم بنانے کا تصور بھی نہیں کرسکتی، اس سوال پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ مغربی تہذیب و معاشرت تین سو سال میں ایک حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر بن عبد العزیزؒ، حضرت جنید بغدادیؒ جیسی ہستی پیدا نہ کرسکی، اس سوال کو دوسری طرح بھی دیکھا جائے کہ اسلامی معاشرے میں نیوٹن، آئن اسٹائن کیوں پیدا نہیں ہوسکے اور اسلامی تاریخ جدید سائنس کیوں مہیا نہ کرسکی؟

سائنسی ترقی میں براعظموں کی لوٹ مار: مرکزی عامل

مغربی فکر و فلسفے سے نکلنے والی خلق جدید کی بہیمیت کی اس تاریخ کو اور سرمایہ داری کی ابتدائی تاریخ کو پڑھے بغیر سائنسی ایجادات و ترقی کا سبب سمجھ میں نہیں آسکتا، اس سلسلے میں جو مظالم ہوئے ہیں اور براعظموں کو جس طرح لوٹا گیا ہے خصوصا امریکہ، آسٹریلیا، افریقہ، ایشیا اور وہاں کے لوگوں کو جس طرح تہس نہس کر کے مال لوٹا گیا، اس کے نتیجے میں صنعتی ترقی اور سائنس کا پہیہ چلا ہے، صنعتی ترقی کے لئے کروڑوں افریقی غلام استعمال ہوئے، اور ہلاک کیے گئے، غلاموں کا اس طرح استعمال کسی مذہبی معاشرے میں نہیں ہوا، ۱۷ویں صدی سے پہلے ہونے والے عیسائیوں کے مظالم وغیرہ بھی اس کے سامنے ہیچ ہیں، پھر سرمایہ داری نے مزدور کا جو حشر کیا وہ عبرتناک ہے، جاگیرداری کے

زمانے میں ظلم تھا؛ لیکن محدود۔(۱)

سائنسی تحقیقات کا مقصد: سرمایہ کس کا تھا؟

ہم لوگ سرمایہ کاری کے آغاز ارتقاء کی تاریخ سے واقف نہیں ہیں: لہٰذا سائنسی ایجادات سے متاثر ہو جاتے ہیں، اس وقت بھی جتنی سائنسی تحقیقات ہو رہی ہیں اس کے پیچھے سرمایہ کس کا ہے؟ سائنسی تحقیقات کا مقصد کیا ہے؟ انسانیت کی خدمت؟ یا دولت کمانا؟ دولت کمانا ہی اصل مقصد ہے، لہٰذا یہ محرک تیزی سے ایجادات کا سبب بن رہا ہے؛ لہٰذا سائنس یا اس کی ترقی کو مغرب کے فلسفے تاریخ، مابعد الطبعیات، نوآبادیات میں لوٹ مار، تصور انسان تصور نفس اور تصور کائنات تصور آخرت کو سمجھے بغیر مجرد دیکھنا اور سمجھنا مناسب نہیں ہے، کوئی مذہبی ریاست دوسروں کو لوٹ کر ترقی کا پہیہ نہیں چلا سکتی، ایسے ظالم ترقی یافتہ معاشرے کو ترجیح دینا دین کا تقاضہ بن جاتا ہے۔آج کل سائنس کمپیوٹر کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتی، یعنی آج سائنس ٹکنالوجی کی محتاج ہو چکی ہے، اور ٹیکنالوجی سرمایہ کی محتاج ہے اور سرمایہ صرف سرمایہ کے ذریعے ہی اپنی مقدار میں اضافہ کر سکتا ہے، لہٰذا سائنس، ٹیکنالوجی اور سرمایہ داری کے مثلث کے بغیر سائنسی ترقی کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے؛ چوں کہ ٹیکنالوجی پر بھاری سرمایہ کاری کرنا پڑتی ہے، لہٰذا سرمایہ کار صرف ان شعبوں میں ٹیکنالوجی پر سرمایہ کاری کرتا ہے، جہاں وہ بھاری منافع حاصل کر سکے، اس کے نتیجے میں سائنس کے افق بڑھنے کے بجائے سکڑ رہے ہیں اور سائنس وٹیکنالوجی صرف سرمایہ داری کے بہترین خدمت گذار بن گئے ہیں، دنیا میں سب سے زیادہ سرمایہ طب، آلات حرب وضرب، تفریحات اور تعیّشات فسق وفجور کی صنعتوں میں ہو رہی ہے، جس کا علمی نام میڈیکل ٹیکنالوجی انفارمیشن ٹیکنالوجی ہے، جدید سائنس وٹیکنالوجی کو اس حال تک مادیت پرستی کے مغربی فلسفے نے پہنچایا تھا، پہلے پہل سائنس مغربی فکر وفلسفے سے الگ ہوگئی اور اب وہ خود ایک علم بن چکی ہے، حالانکہ دنیا کی تاریخ میں سائنس اور فلسفہ میں چولی دامن کا ساتھ رہا ہے، دنیا کا پہلا فلسفی تھیلس سائنس دان بھی تھا، تھیلس کے

(۱) اس کے لئے مطالعہ کیجئے مفتی ابولبابہ شاہ منصور کی کتاب ''ہسپانیہ سے امریکہ تک''

فلسفے اور سائنس کا مقصد حقیقت مطلق تک رسائی تھا وہ نہیں جو آج کی سائنس اور فلسفے کا محور و مرکز ہے کہ دنیا کی زندگی کو کس طرح خوبصورتی سے بسر کیا جائے اور زمین کو جنت بنادیا جائے، تمام بڑے بڑے سائنس داں فلسفی تھے، لیکن بیسویں صدی میں صرف سائنس داں پیدا ہورہے ہیں، یہ سائنس دان فلسفی نہیں ہیں؛ لہٰذا سائنس کی سمت، اہداف مقرر کرنے والا کوئی عامل باقی نہیں رہا، اس پر نقد کرنے والا کوئی ادارہ اس سے وابستہ نہیں رہا؛ لہٰذا جدید سائنس جو اول دن سے آزادی کی قدر پر اپنے وجود کا اظہار کررہی تھی، اب بے مہار ہوگئی ہے اور اس کے پیدا کردہ خطرات کا ازالہ مشکل ہوگیا ہے، اس جدید سائنس کی اسلامی صورت گری ممکن ہی نہیں، البتہ عارضی طور پر دفاعی ضرورت کے پیش نظر اس سے حدود کے اندر استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کا کام، تسخیر کائنات یا تسخیر قلوب انسانی

مسلمانوں کے زوال پر گفتگو میں بار بار ان کے سائنسی اور جدید علوم و ٹیکنالوجی سے محرومی کو زوال کا اصل سبب قرار دیا جاتا ہے، لیکن جب انبیاء علیہم السلام اور ان کے پیروکار پرانی تہذیبوں سے نبرد آزما ہوئے تو وہ کون سے پڑھے لکھے تھے ان کے پیروکار فلسفی سائنس داں تھے، یا ان پڑھ تھے، قرآن نے بعض انبیاء علیہم السلام کے پیروکاروں کے بارے میں ان کے مخالفین کا قول نقل کیا ہے کہ تمہاری پیروی تو ''اراذل'' نے اختیار کی ہے اور خود تم مادی طور پر ہمارے مقابلے میں کچھ نہیں، تاریخ بتاتی ہے کہ اس وقت کے جدید علوم تو انبیاء علیہم السلام کے مدمقابل کے پاس تھے؛ لیکن انہوں نے سب پر فتح پائی، یہ اعتراف کہ ہم تسخیر کائنات میں پیچھے رہ گئے احمقانہ اعتراف ہے، اصل بات یہ ہے کہ ہم تسخیر قلوب انسانی میں پیچھے رہ گئے جو انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا اصل مقصد ہے جس کی بنیاد محبت کا بے پناہ جذبہ ہے، انبیاء علیہم السلام تسخیر کائنات کے لئے انہیں تسخیر قلوب انسانی کے لئے آتے ہیں، یہ کام صرف اور صرف محبت سے ہوتا ہے، عدل وانصاف مساوات سے نہیں، محبت سے کیوں کہ تمام نیکیوں کا سرچشمہ اللہ سے محبت ہے، یہ محبت جتنی مستحکم ہوگی عروج بھی اسی قدر مستحکم ہوگا، انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ سے محبت کا یہ

چراغ ہر دل میں روشن کرتے ہیں، اللہ سے محبت کرنے والے انبیاء علیہم السلام اس محبت کو امتوں میں تقسیم کرتے ہیں، اور ہر دل کو یادالٰہی کا آستانہ بناتے ہیں، وہ صرف اللہ سے نہیں اس کی مخلوق سے بھی محبت کرتے ہیں اور مخلوق سے محبت انہیں اس دردمندی سے آشنا کرتی ہے، جس کے ذریعے مخلوق کو جہنم کی آگ سے بچانے کے لئے بے قرار ہوجاتے ہیں، ان کی بے قراری اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو مداخلت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور وہ فرماتے ہیں: ''لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ''(۱) اے نبی (ﷺ)! شاید تم اس غم میں اپنی جان کھودوگے کہ یہ ایمان نہیں لاتے۔

محبت کا یہ معاملہ اپنے مخاطب کفار و مشرکین سے صرف انبیاء علیہم السلام کا نہیں ہوتا؛ بلکہ ان کے پیروکاروں کا بھی یہی رویہ ہوتا ہے؛ اسی لئے قرآن نے مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ تم ان سے محبت رکھتے ہو، مگر وہ تم سے محبت نہیں رکھتے ''تُحِبُّونَهُمْ وَلَا يُحِبُّونَكُمْ ''(۲) یہ محبت انبیاء علیہم السلام اور ان کے امتی اپنی امتوں سے کرتے ہیں اور اس محبت کا چراغ ہر دل میں روشن کرتے ہیں، یہ محبت ہی دلوں کے دروازے کھولتی ہے اور انقلاب بپا کرتی ہے ،انبیاء اور ان کے پیروکاروں کا یہ معاملہ صرف انسانوں سے نہیں ہوتا، تمام مخلوق سے محبت کا یہی عالم ہوتا ہے، امتیوں کو یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ جانوروں کو کس طرح ذبح کیا جائے کہ انہیں پانی پلایا جائے، تیز چھری استعمال کی جائے؛ تاکہ انہیں اذیت نہ ہو، خوف زدہ نہ کیا جائے، زندہ جانور کے سامنے اس کے ساتھی کو ذبح نہ کیا جائے، الگ رکھا جائے، ان پر زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے وغیرہ وغیرہ۔

انبیاء علیہم السلام انسان تیار کرتے ہیں، مشینیں نہیں

انبیاء علیہم السلام کتابیں نہیں لکھتے، وہ انسان تصنیف کرتے ہیں، وہ انسان تیار کرتے ہیں، ایسے انسان جو بڑی بڑی کتابوں، بڑے بڑے فلسفوں اور بڑے بڑے سائنس دانوں پر بھاری ہوں؛ کیوں کہ انسان تیار کرنا سب سے مشکل کام ہے، سائنس

(۱) الشعراء:۳

(۲) آل عمران:۱۱۹

ٹیکنالوجی اپنی جدید شکل میں بھی کوئی انسان تیار کرنے سے قاصر ہے، انبیاء علیہم السلام لوگوں کے دلوں کی دنیا بدلتے ہیں، سائنس وٹیکنالوجی آسائش دے سکتی ہے، وہ نہ ذہنِ انسانی کو پڑھ سکتی ہے، نہ دلوں کو بدل سکتی ہے، دلوں کو بدلنے کا طریقہ صرف اور صرف انبیاء علیہم السلام اور ان کے صالح امتیوں کے پاس ہوتا ہے، انبیاء علیہم السلام انسانوں کے قلوب تسخیر کرتے، ان کے ذہن تبدیل کرتے اور ان کے طرز زندگی اور طرز معاشرت کو بدل ڈالتے ہیں، وہ امتوں کے موضوعات گفتگو تک بدل دیتے ہیں؛ حتی کہ ان کے سونے اور جاگنے کے اوقات بھی بدل دیتے ہیں، دنیا کو تبدیل کرنا زمین وآسمان کو بدل ڈالنا آسان ہے، لیکن کسی انسان کو تبدیل کرنا محال ہے، یہ کام انبیاء علیہم السلام اور ان کے امتی کرتے ہیں۔

اللہ پر قربان ہونے میں کامیابی

نظامِ کائنات پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ ہر ادنی اعلیٰ پر قربان ہورہا ہے، ہر بے اہمیت، قیمتی اور اہم چیز پر قربان ہورہی ہے، جمادات، زمین، پتھر وغیرہ قربان ہورہے ہیں نباتات یعنی پودوں پر، ان کے لئے بچھ جاتے ہیں، سڑ جاتے ہیں، پھٹ جاتے ہیں، اسی طرح نباتات، پھل پھول، گھاس پھوس قربان ہوجاتے ہیں حیوانات کے لئے اور بڑا سے بڑا درندہ حیوانات میں سے گرفتار ہوجاتا ہے انسان کے ہاتھوں، اب انسان کا قیمتی ہونا یہ ہے کہ وہ رب کریم پر قربان ہوجائے، یہ اس کی اہمیت کا گرجانا ہے کہ وہ اپنے سے ادنی پر اپنے آپ کو کھپائے۔

ڈگری کا روزی سے کوئی تعلق نہیں، حکماء نے کہا: اگر روزی عقل سے ہوتی تو سارے بیوقوف بھوکے مرجاتے اور یہ انسان اتنا مکار ہے کہ اپنی چالبازی سے درندوں کی روزی کھاجاتا ہے، ایک ہی سال ایک ہی ڈگری حاصل کرنے والے ہم سبق دو طلباء کا مقدر ایک نہیں ہوتا، ایک باپ کے دو عالم یا دو حافظ بیٹوں کا نصیب بھی ایک نہیں ہوتا؛ لہٰذا دو کفِ جو کو مقصد زندگی بنالینا دین اور قوم وملت کے اعتبار سے نہایت نقصان دہ ہے، سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ موجودہ عصری علوم کو معرفتِ رب اور خدمت انسانیت سے

کاٹ دیا جائے؛ اس لئے سارے عالم میں یہ واقعات سامنے آرہے ہیں کہ جو جتنا بڑا اعلی تعلیم یافتہ ہے وہ اتنی بڑی چوری اور رشوت ستانی اور گھوٹالے میں ملوث ہے، ایک طرف لڑکیوں کے لئے اعلی تعلیم کے ادارے قائم ہورہے ہیں، دوسری طرف مہیلا عدالتوں اور دار القضاء میں طلاق وخلع کا بازار گرم ہے، شرحِ پیدائش گھٹتی جارہی ہے، مادری شفقت سے دل خالی ہوتے جارہے ہیں، انجینئروں اور ڈاکٹروں کی تعداد میں بھی اضافہ ہے اور دارالمعمرین، آرام گھر، اولڈ ایج ہوم کی تعمیرات کا سلسلہ بھی جاری ہے، جو نیوکلیر کا مالک ہے، وہی انسانیت کا قاتل ہے، دنیا کا سب سے بڑا ڈاکو اور چور ہے، دوائیں اصل مواد سے خالی ہوتی جارہی ہیں، ڈاکٹر مردوں سے بھی حصولِ مال کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

عروج وترقی کا تصور: حجرہ نبوی ﷺ

امتوں کو عروج سائنس وٹیکنالوجی سے نہیں ملتا، اس لذت کردار سے ملتا ہے، اس کی لذت دشمن بھی محسوس کرتا ہے اور دشمنی ترک کر کے محبت اختیار کر لیتا ہے، اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وادی مکہ کو آباد کرتے ہوئے اپنے ورثاء کے لئے اللہ سے دعا کی تھی ''فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ ''(۱) ''اے میرے رب لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق بنادے'' اگر امتیں شان وشوکت کی حامل ہوں اور صرف ان کی ہیبت قائم ہو؛ لیکن دلوں میں ان کے لئے محبت نہ ہو تو یہ سلطنتیں مغلیہ سلطنت کی طرح گرد وغبار میں گم ہوجاتی ہیں، عیش وعشرت کی ثقافت جس نے بھی اختیار کی اس کا انجام بہت برا ہوا، خواہ وہ دنیادار لوگ تھے یا دین کے علم بردار، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں ایک دن بھوکا رہوں، ایک دن کھانا کھاؤں؛ تاکہ اللہ کا شکر ادا کرتا رہوں، یہ اس ہستی کا طرز زندگی تھا جسے کون ومکان میں فضیلت دی گئی اور رحمت اللعالمین کا خطاب دیا گیا، رحمت اللعالمین نے اپنے لئے ''الفقر فخری'' کا خطاب پسند فرمایا، آپ نے فقر، سادگی، سادہ طرز زندگی اختیار کی اور عیش وعشرت سے گریز کو اپنے مسلسل طرز عمل سے

(۱) ابراہیم: ۳۷-۴۰

ثابت کیا، آپ نے ساری زندگی ایک ایسے حجرے میں بسر کی جس میں وصال مبارک کے بعد صرف تین قبریں سما سکیں، مختصر حجرہ مبارک کی سنت پر رسول اللہ ﷺ نے متواتر عمل کر کے دکھایا، یہ ایسی سنت تھی جس پر رسول اللہ ﷺ زندگی بھر عامل رہے اور مستقبل کے حکمرانوں اور امت مسلمہ کے لئے ایک عجیب مثال قائم فرمائی:

ایسا کوئی سلطان زمانے میں دکھادو
مٹی کا دیا جس کے شبستاں میں جلا ہو

لیکن جب امتیں عیش وعشرت کے اسلامی جواز تلاش کرتی ہیں تو وہ تاریخ کے صحراء میں اس طرح گم ہوجاتی ہیں جس طرح کسی بیوہ کا آنسو تنہائی میں شب فراق کے تصور سے پلکوں سے گر کر زمین میں تحلیل ہوجاتا ہے، جدید سائنس وٹیکنالوجی کا مقصد صرف عیش وعشرت کی فراوانی کے ذریعے مادیت کو روحانیت پر غالب کرنا ہے؛ اس لئے جدید سائنس اسلامی تہذیب کی اصل حریف اور دشمن ہے اس کو غیر جانبدار سمجھنا، اسے اسلامی تہذیب وتاریخ کا گمشدہ قافلہ قرار دینا اور اس کے حصول پر امت کی نجات، عروج وشان وشوکت کو منحصر رکھنا جدیدیت پسندی ہے، اصل عروج یہ ہے کہ دل کی گہرائیوں سے قائم ہوجائے جو حق ہے ''الحق'' ہے، ''الکتاب'' ہے آخری پیغام ہے اور وہ اسلام ہے۔

اصل شان وشوکت ایمان، ایقان اور عمل صالح سے پیدا ہوتی، یہ شان وشوکت دنیا میں بھی عروج کا سبب بنتی ہے اور آخرت میں بھی کامیابی صرف اسی کے لئے مختص ہے، اسی شان وشوکت کے باعث دنیا قدموں میں ہوتی ہے اور وقت کے پیغمبر یوسف علیہ السلام کو قید وبند کی سختیوں کے بعد اقتدار طشتری میں رکھ کر پیش کردیا جاتا ہے، حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے کردار کی عظمت ثابت کردی تھی اور اسلامی زندگی پر قید خانے کو ترجیح دی تھی اور الزام لگانے والی عورتوں کو حضرت علیہ السلام کی عظمت اور بے گناہی کا اعتراف کرنا پڑا، کردار کی یہ عظمت کہ بدترین دشمن بھی کردار کی شہادت دے، انبیاء علیہم السلام پیدا کرتے ہیں یہ عظمت لاؤ لشکر اور انتخابات کے بغیر بھی تمکن فی الأرض کا سبب بن جاتی ہے، یہ نہ ہو تو مادی شان وشوکت کا انجام اندلس کے انجام سے بدتر ہوگا، اندلس

جہاں سے بیکن علم حاصل کر کے آیا اور یورپ میں انقلاب بپا کیا، اندلس کے سائنس وٹیکنالوجی سے متاثر ہونے والے یورپ نے اندلس کی اسلامیت وروحانیت سے کچھ اثر لیا، اندلس میں آج کتنے مسلمان ہیں؟ اگر سائنس وٹیکنالوجی کی ترقی اندلس ریاست کا تحفظ نہ کرسکی اور اندلس کو مسلمان نہ رکھ سکی اور یورپ کو مسلمان نہ کرسکی تو اس کی دینی حیثیت کی اہمیت کیا ہے؟ قصرۃ الزہراء وغیرہ دوسری عمارتیں اس کے زوال کی آخری نشانی ہیں۔

رسالت مآب ﷺ کا حجرہ مبارکہ ایک طرف رکھا جائے، دوسری جانب عاد، ثمود، قوم سبا، قوم فرعون، موہنجوڑو چین کے محلات عالیشان تہذیب وتمدن پر نظر کی جائے تو یہ تہذیب وتمدن اوران کے آثار رسول اللہ ﷺ کی آمد کے وقت بھی محفوظ تھے، یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو عاد وثمود جیسی عمارات تعمیر کرنے کا ہنر کیوں نہ دیا، مسجد نبوی پتوں اور کھجور کے تنوں سے تیار کی گئی، ایران وروم کی سلطنتوں کو فتح کرنے والے مسلمانوں کے پاس قرآن کے سوا کوئی کتاب نہ تھی، نہ کتب خانے تھے، نہ سائنس تھی، نہ ٹیکنالوجی نہ صنعتیں تھیں نہ مدرسے نہ کالج نہ یونیورسٹی؛ لیکن اس عہد کی دونوں عظیم طاقتیں ان کے چھوٹے چھوٹے تیروں اور ناقابل بیان معمولی تلواروں سے زیر ہوگئیں، اصل طاقت کردار کی طاقت ہے جس سے روحانیت پیدا ہوتی ہے، اگر سائنس وٹیکنالوجی کی ترقی کے بغیر ترقی کا کوئی تصور موجود نہیں ہے تو پھر رسالت مآب ﷺ سے لے کر انیسویں صدی میں خلافت عثمانیہ کے زوال تک ہماری تاریخ زوال کی تاریخ ہے؛ کیوں کہ اس عہد میں ہم فراعنہ مصر اور یونان تہذیب جیسی عمارتیں نہ بنا سکے، خلافت اسلامیہ اور مدینۃ النبی ﷺ میں انیسویں صدی تک نکاسی آب وگندم کا نظام موجود نہ تھا، جب کہ یہ نظام رسول اللہ ﷺ کی آمد سے ڈھائی ہزار سال پہلے کی تہذیب موہنجوڑو میں موجود تھا، اس اعتبار سے مسلمان تو ناکام ترین تہذیب وتمدن کے وارث ٹھہرے، قرآن نے ہر قوم کی عظمت، جلالت، افادیت، تعمیرات، شان وشوکت کے مرقعے محفوظ کئے ہیں؛ لیکن انبیاء علیہم السلام کرام کی عمارات وتعمیرات کے مرقعے محفوظ نہ رکھے، ایک آدھ استثناء کے

سوا اس کی کیا وجہ ہے؟ وجہ ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتیں حاضر و موجود اور غالب تہذیب و تمدن تہس نہس کرنے آتی ہیں اور خوف خدا پر مبنی ایک نئی تہذیب اور ایک نئے معاشرے کی تعمیر کرتی ہیں۔

عمارتیں تعمیر کرنا آسان کام ہے، انسان تعمیر کرنا مشکل ہے، انبیاء علیہم السلام انسان تعمیر کرتے ہیں، قلب بدلتے ہیں، صرف حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی مثال لیجئے ان کے بارے میں مؤرخین لکھتے ہیں کہ: ولید بن عبدالملک کے زمانے میں لوگ جب آپس میں ملتے تھے تو تعمیر اور عمارتوں پر گفتگو کرتے تھے، سلیمان بن عبدالملک کو عورتوں اور ان نکاح سے دلچسپی تھی؛ لہٰذا اس کے زمانے میں اس کا چرچا تھا لوگوں کا موضوع گفتگو لونڈیاں اور شادیاں تھیں؛ لیکن جب عمر بن عبدالعزیزؒ نے تخت خلافت پر قدم رکھا تو مذہب، عبادت اور اس کی تفصیلات موضوع بن گئیں، جہاں چار آدمی جمع ہوتے تو ایک دوسرے سے پوچھتے کہ رات کو کون سے اوراد و وظائف پڑھے، تم نے کتنا قرآن یاد کیا ہے؟ تم قرآن کب ختم کروگے؟ مہینے میں کتنے روزے رکھتے ہو؟ قلب تبدیل ہونے سے فرد تبدیل ہونے سے معاشرہ میں کس قدر تبدیلی آتی ہے، اس کے برعکس مغربی فکر وفلسفے کے فروغ کے بعد زندگی کے مقاصد بھی تبدیل ہوگئے، ہلاکت خیز ہتھیار بنانا اسے بیچ کر دولت کمانا، جانوروں کی طرح ہمہ وقت جنسی عمل میں مشغول رہنا اور جانوروں کی طرح کھانا اور کھانے کے لئے نت نئی غذائیں پیدا کرنا، صنعتی مغربی معاشروں کا ہدف ہے، دنیا کی تاریخ میں اسلحہ اور کھانے اور جنسی ادویہ کی اتنی اقسام کبھی تیار نہیں ہوئیں، ان تینوں اقسام میں ترقی بہ ظاہر بے ضرر محسوس ہوتی ہے؛ لیکن اس ترقی نے چینی، امریکی، یورپی قوموں کے طرز زندگی، صحت، طرز فکر اسلوب زندگی، فکر و نظر کے پیمانوں پر کیا اثر ڈالا۔

ترقی کا مطلب ہر وقت کھانا

اللہ عزوجل نے کفار کے کھانے پینے کی بارے میں فرمایا: ”یأکلون کما تأکل الأنعام“ نت نئی ایجادات کے نتیجے میں ایسی کھانے پینے کی چیزیں ایجاد ہوگئیں اور ان کو فروخت کرنے کے لئے ایسے خوشنما تشہیری اسباب استعمال کئے گئے کہ تہذیب

جدید کا ہر فرد کھانے میں مگن نظر آتا ہے، ناشتے میں انڈا، مکھن، پنیر، جام جیلی، ڈبل روٹی، چائے، کچھ وقفے کے بعد بسکٹ، پیسٹیز، سموسے چائے، پھر منہ میں سپاری کی تھیلی، پھر چیونگم، پھر چاکلیٹ، پھر پیزا، پھر کافی، چپس، برگر، فرنچ فرائز، دنیا بھر کی چیزیں منہ کو مشین کے پہیئے کی طرح ہر وقت رواں دواں رکھتی ہے۔اس بکثرت کھانے کے نتیجے میں نت نئی بیماریاں جنم لے رہی ہیں، لہٰذا ان بیماریوں کے لئے طبی سائنس ایجادات کا کمال دکھارہی ہیں۔

جدید بیماری، دائمی قبض

طبی تاریخ میں کسی قوم کو کبھی قبض ایک بیماری کے طور پر لاحق نہیں ؛ لیکن مغربی تہذیب وترقی اور سائنس وٹکنالوجی کے نتیجے میں جو اشیاء صارف استعمال کررہے ہیں اور جو ثقافت پیدا ہوئی ہے اس نے قبض کی بیماری کو عام کردیا ہے، دنیا کی تاریخ میں کوئی اس طرح قبض میں مبتلا نہیں، صرف قبض سے متعلق ادویات کا کاروبار اربوں کھربوں روپیئے سے تجاوز کرچکا ہے، اس کاروبار سے منافع کی حالت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آٹے کی بھوسی جو بازار میں دس روپیئے کلو ملتی ہے، اس کو قبض دور کرنے کی دوا کے نام پر کمپنیاں اسے چھ سواسی روپیئے میں فروخت کرتی ہیں۔

لوگوں کا وزن بڑھ رہا ہے

ٹیکنالوجی کے انقلاب کے نتیجے میں کھانے کی غیر فطری اشیاء کی مقبولیت اور فاسٹ فوڈ کے ذریعے زہریلی غذاؤں کو زندگی کا لازمی حصہ بنادیا گیا ہے، یہ زہریلی غذائیں جسم انسانی میں چربی کی شکل میں محفوظ ہوتی رہتی ہیں اور پھر دل دھڑکنا چھوڑ دیتا ہے، دل کی جراحت (آپریشن) پر لاکھوں روپئے خرچ کرکے اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے کے بعد مریض کو غذا میں فطری طرز زندگی کے مطابق مثلاً بھوسی کی روٹی، سبزی، دالیں سادہ غذائیں یہی فطرت ہے اور جناب رسالت مآب کا دسترخوان بھی اسی سادہ غذا کی خبر دیتا ہے، یورپی معاشروں نے غیر فطری طرز زندگی اختیار کرنے میں تین سو برس کا عرصہ لیا؛ لیکن اب غیر فطری طرز زندگی بسر کرنا ایک فطری طریقہ سمجھا جارہا ہے۔

جنسی امراض، طبی انقلاب

دنیا کی تاریخ میں اتنے جنسی امراض کبھی پیدا نہیں ہوئے جس قسم کے امراض مغربی تہذیب کے غلبے کے نتیجے میں آزادانہ جنسی تعلقات کے باعث پیدا ہوئے؛ کیوں کہ جنسی عمل ہی زندگی کا اصل مقصد ٹھہرا، عیش وعشرت کو آخری حدتک ممکن بنانے کے لئے طب کی دنیا میں جنسی امراض کے علاج کا انقلاب پیدا ہوا، اسلامی یا مذہبی تہذیبوں نے کبھی یہ امراض پیدا نہیں کئے؛ لہٰذا ان امراض کا علاج بھی دریافت نہیں کیا، لہٰذا یہ طبی انقلاب کسی مذہبی، تہذیب میں نہ کبھی برپا ہوا نہ کبھی برپا ہوسکتا ہے، جنسی امراض کے نتیجے میں نفسیاتی امراض کا بھی سیل بلا آیا کیوں کہ جنسی آزادی نے خاندان کی تنظیم، معاشرتی تعلقات اور خونی رشتوں کو تہس نہس کردیا تھا، لہٰذا تنہا فرد جب زندگی کی گردشوں سے اکتا گیا تو نفسیاتی امراض کے گرداب میں پھنس گیا، مغرب کے میکے، سسرال، خالہ، نانی، دادی کے رشتے ختم ہو چکے ہیں، اگر رشتہ دار موجود ہیں تو وہ ''بوڑھوں کے گھروں'' میں انتظار کی گھڑیاں گن رہے، ان امراض سے بچانے کے لئے نفسیات کا علم ایجاد ہوا اور اس علم میں ایسی ترقی ہوئی کہ مذہبی لوگ بھی اس پر رشک کرنے لگے، مذہبی تہذیبوں میں خاندانی ادارہ معاشرتی تنظیم ازدواجی تعلقات کی پاکیزگی، شرم وحیاء اور رشتوں کے پاس ولحاظ کے باعث اسی درجہ کے ہولناک نفسیاتی مسائل کبھی پیدا نہیں ہوئے؛ لہٰذا نفسیاتی بیماریوں کے علاج کی صنعت کا انقلاب بھی برپا نہیں ہوا۔(۱)

یہ مشینوں کی ترقی ہے نہ کہ انسان کی

کیا انسان بجائے نو مہینے کے دو مہینے میں بننے لگ گیا، بجائے دو پیر کے چار پیر سے چلنے لگ گیا، دنیا گلوبل ویلج تو بن گئی؛ لیکن بہن بھائی کو بھی ایک دسترخوان پر کھانے کے لئے سالوں، مہینوں کا انتظار کرنا پڑتا ہے، مواصلاتی فاصلہ، کمیونیکیشن گیاپ ختم ہوگیا؛ لیکن محلے کی بیوہ اور یتیم کی خبر لینے والا کوئی نہیں، تیز رفتار سواریاں بڑھ گئیں، پھر بھی انسان کے پاس وقت نہیں، ماؤں کو دواخانہ لے جانے والی اولاد نہیں، ہواؤں میں

(۱) ساحل: جولائی ۲۰۰۵ء

انسان تو اڑنے لگ گیا؛ لیکن زمین پر چلنے کا سلیقہ نہ مل سکا، انسانی ترقی یہ ہے کہ حیاء میں اضافہ ہو، اخلاق واقدار میں ترقی ہو، انسانیت کا درد بڑھے، رشتے استوار ہوں، اللہ والی مائیں اور گودیں نصیب ہوں، قوم وملت کے بہی خواہ، تعمیر کے خواہش مند وجود میں آئیں، موجودہ اسکولس اور کالجس کے فارغین نہ اپنے لئے باعث راحت ہیں، نہ والدین کے آنکھ کا تارہ ہیں، نہ اہل محلّہ کے لئے نافع ہیں، نہ حکومت کے لئے نفع بخش ہیں، نہ یہ گاندھی جی کا خواب ہے نہ ابوالکلام اور ڈاکٹر ذاکر حسین کا نظریۂ تعلیم۔
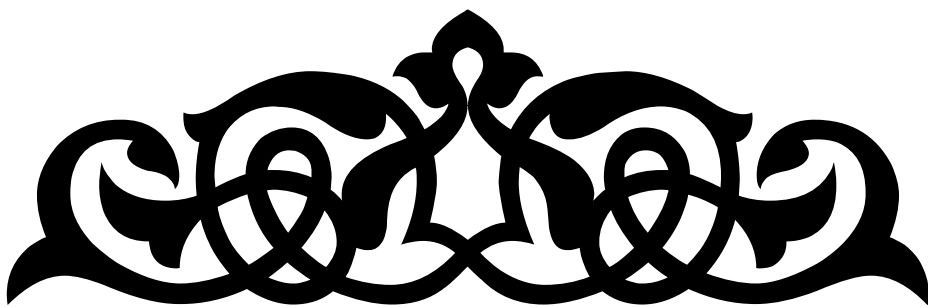
عصری تعلیم-اسلامی نقطۂ نظر

موجودہ صورتِ حال

حدیث وسیرت کے بعد اگر فقہی عبارتوں کا جائزہ لیا جائے تو متعدد جگہوں پر فقہاء نے عصری فنون حاصل کرنے کو فرض کفایہ قرار دیا ہے، یہ بات اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ اسلام کی نظر میں عصری فنون کی اتنی اہمیت نہیں ہے کہ دینی علوم سے صرف نظر کر لیا جائے، ہمارے انجنیئرس اور ڈاکٹرس کو اپنی مذہبی بنیادی معلومات بھی نہ ہوں، ضروریات دین سے ناواقف اور اس کے حاصل کرنے والوں کو بندۂ شکم اور بندۂ شہوت بنا کر چھوڑ دیا جائے، والدین کے رشتہ کا تقدس اور بے داغ جوانی سے وہ بے بہرہ ہوں، دیانت داری، انسانیت نوازی کا کوئی جذبہ ان کے تحقیق وملازمت میں دخل نہ رکھتا ہو۔

علامہ اقبالؔ نے مغربی تہذیب کے ساتھ ساتھ مغربی نظام تعلیم کو بھی اپنی تنقید کا نشانہ بنایا اور اس کے نقائص کو یوں بے نقاب کیا، فرماتے ہیں:

ہم سمجھتے ہیں کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
گھر کے پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

اور ایک مقام پر فرمایا:

وہ علم نہیں زہر ہے احرار کے حق میں
جس علم سے حاصل ہے جہاں میں دو کف جو

عصر حاضر میں ڈاکٹرس، انجنیرس اور سائنسدانوں کی کمی کا مسئلہ نہیں ہے؛ بلکہ

دیانت دار، قوم وملت کے خادم، احساس ذمہ داری، زندہ ضمیر وباشعور افراد کی کمی سب سے بڑا مسئلہ ہے، ان اوصاف کے فقدان اور مذہبی تعلیمات سے دوری ہی کی وجہ سے جو جتنا پڑھا لکھا ہوتا ہے وہ اس زمانہ میں ڈاکہ زنی، چوری، رشوت ستانی کے بڑے بڑے واقعات میں ملوث ہوتی ہے، وہ انگریزی زبان سے واقف تو کم ہے؛ لیکن انگریزوں کا غلام زیادہ ہے، بالوں میں تراش خراش، لباس وپوشاک میں تہذیب وتمدن پوری قوم میں غلامی کو تسلیم کرلیا گیا ہے، وہ کامیاب شہری تو کیا حکومت اور قوم کے لئے نقصاندہ ہورہا ہے، نہ ہی یہ اسلام کا نقطۂ نظر ہے، نہ ہی گاندھی، ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا ابوالکلام آزاد کا نظریۂ تعلیم، مغربی مواد تعلیم کے ساتھ مغربی نظام تعلیم کو بھی جوں کا توں نافذ کردیا گیا ہے، نہ ہی نظام تعلیم میں عمل جراحی کرکے غیر اسلامی اثرات کو پاک کیا گیا اور نہ اسلامی مواد کو داخل کیا گیا، مسلمان خود ہی نظام تعلیم میں مخلوط تعلیم کو گناہ ہی نہیں سمجھتا؛ بلکہ بہت سے دینی علوم کے ساتھ عصری علوم کو پڑھانے کا خوشنما نام لگانے والے بھی جماعت پنجم کے بعد مرد وزن کے اختلاط کو ختم کرنا ہی نہیں چاہتے، جب کہ طلباء بالغ ہوجاتے ہیں اور زمانہ آئے دن اسکولوں، کالجوں میں پیش آنے والے واقعات سے نالاں ہے۔ علامہ اقبال نے فرمایا:

جب پیر فلک نے ورق ایام کا الٹا
آئی یہ صدا پاؤ گے تعلیم سے اعزاز
آیا ہے مگر اس سے عقیدوں میں تزلزل
دنیا تو ملی، طائر دیں کر گیا پرواز
دین ہو تو مقاصد میں بھی پیدا ہو بلندی
فطرت ہے جوانوں کی زمین گیر، زمین تاز
مذہب سے ہم آہنگیٔ افراد ہے باقی
دین زخمہ ہے جمعیت ملت ہے اگر ساز
پانی نہ ملا زمزم ملت سے جو اس کو
پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز

اور ایک موقع سے فرمایا:

یہ مدرسہ ، یہ جواں ، یہ سرور ورعنائی
انہی کے دم سے ہے مے خانۂ فرنگ آباد

یہ تو باطنی اثرات تھے، ظاہری نظام کے اعتبار سے اگر نظر ڈالئے تو بچوں کے لئے یونیفارم میں نہایت چھوٹے شلوار رکھے گئے اور بچیوں کے لئے ایسا فراک کہ جس سے ان کا ستر کھلتا رہتا ہے اور رگ و پیئے سے حیاء کریدلی جاتی ہے، دسویں جماعت تک بھی اسی لباس میں لڑکیوں کو دیکھا جارہا ہے، سر کو ننگا رکھنے، کمر پر بیلٹ بندھوانے کا مقصد سوائے بے حیائی ظاہر کرنے کے کچھ نہیں ہوسکتا، سیکھنے سکھانے سے اس کا کوئی تعلق نہیں، کھیل تو کھیل ہے، ناچ کیا ہنر ہوسکتا ہے، اس زمانے میں کھیل اور ناچ ایک مقصد زندگی، ذریعہ معاش، شہرت کا آسان سبب بن چکا ہے، سائنسدانوں، اعلیٰ تعلیم یافتہ، قوم وملت کے خادم افراد کی وہ قدر نہیں رہی جو رقاصاؤں اور کھلاڑیوں کو ہو چکی ہے، انہیں کو پوری قوم کا نمائندہ اور مثالی شخصیت شمار کیا جارہا ہے، کھیل اور ناچ مغربی تہذیب کی تشہیر کے لئے نہایت مؤثر ذریعہ ہو چکے ہیں، یہودی تجارت کے فروغ کے لئے جادوئی ہتھیار بن چکے ہیں، اسی سے متاثر ہو کر اسکولوں میں بھی رقص وسرور، ڈیانس، سوئمنگ، پکنک، فلم بینی، تاریخی مقامات کی سیر، سالانہ تعلیمی مظاہروں کا سلسلہ جاری کیا گیا، ان سے وہ سب کچھ ہورہا ہے جو ہونا نہ چاہئے، پھل وقت سے پہلے پک رہے ہیں، نابالغی میں جنسی تشدد کے واقعات پیش آرہے ہیں، خود تعلیمی نظام مضمحل ہورہا ہے، اس تعلیمی نظام سے گذر کر بچہ جب بیرونی ممالک کا سفر کرتا ہے تو قدیم زمانے میں مائیں اپنے بچوں کہتی تھیں بیٹے ہم نے تمہارے لئے خاندانی لڑکی دیکھ رکھی ہے وہاں نکاح نہ کرنا، کچھ عرصہ پہلے یہ کہہ رہیں تھیں اگر وہاں نکاح کرنا ہو تو مسلمان عورت سے کرنا کسی عیسائی لڑکی سے نہ کرنا، آج کل یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ بیٹے یورپ جارہے ہو اگر نکاح کی ضرورت محسوس ہو تو عورت سے نکاح کرنا مرد سے نکاح ہرگز نہ کرنا، ڈگریوں کی اہمیت اتنی اختیار کرگئی کہ ڈگریوں کی تکمیل کے لئے بچیوں کے اچھے رشتوں کو ٹھکرایا جارہا ہے اور اس دور فتن میں اور اس بے حیاء

نظامِ تعلیم میں رکھ کر بچوں کو نکاح میں غیر معمولی تاخیر کی جارہی ہے، اگر اعلی ڈگریاں مل جائیں تو بچوں کے اس تناظر سے رشتوں کی تلاش میں مزید تاخیر ہورہی ہے اور اس معیار کے نکاح کا تقاضا بھی ہورہا ہے۔

یہ کہاں کی عقل مندی ہے کہ لڑکیوں کی تصاویر ان کے اونچے رینک آنے پر برسرعام سڑکوں پر اور اخباروں میں شائع کیا جائے، اس تعلیمی سال کے ابتداء میں نئے داخلہ شدہ لڑکیوں میں حسیناؤں کا درجہ طئے کیا جائے یا ریگنگ کے ذریعہ سے اخلاق سوز حرکتیں کی جائیں بالکل جائز نہیں ہے، کہ اولاد کو اعلی تعلیم کے عنوان پر اس حال میں یورپ وامریکہ بھیجا جائے کہ اس کا ایمان اور تقوی ہی درست نہ ہو، اسلامی شناخت کے تحفظ وبقا کا امکان نہ ہو؛ بلکہ مغربی ماحول میں رل مل جانے کا قوی اندیشہ ہو اور عملی تجربے ہورہے ہیں، اس کے لئے سودی قرضے گوارا کئے جارہے ہیں۔

اسلام میں عصری فنون کی اہمیت وشرعی حیثیت

اسلام نے علومِ دینیہ کے سوا دیگر علوم وفنون کے حصول کو شجرِ ممنوعہ نہیں قرار دیا، بلکہ ضرورت اور حاجت کے درجے اور مراتب کے لحاظ سے ان علوم اور فنون کے حصول کی بھی ترغیب دی ہے اور ان علوم وفنون کے حصول پر ابھارا ہے جس پر تمدنی زندگی کا دارومدار ہے اور جن پر انسانی معاشرت، عمرانی ضرورت اور جسمانی آسائش کا مدار ہے، اسلام نے نہ صرف ہمیں دنیاوی، عمرانی، اجتماعی اور معاشرتی ضرورتوں کے لئے دوسرے علموں کے حاصل کرنے کی اجازت دی؛ بلکہ بعض موقعوں پر ہمت افزائی کی ہے اور ان کے تعلیم وتعلم میں دینی حیثیت سے کسی قسم کی مداخلت روا نہیں رکھی ہے، ارشادِ نبوی ہے ”أنتم أعلم بأمور دنیاکم“(۱) ”تم اپنے دنیوی امور کے زیادہ جاننے والے ہو“۔

یہ ملحوظ رہے کہ ہر کام میں اصل مدار انسانوں کی نیتوں پر رکھا گیا ہے؛ اس لئے اگر کسی دنیوی سی دنیوی علم کی تحصیل بھی مثلاً مخلوقِ خدا کو فائدہ پہنچانے اور شہر ووطن کے لئے لوگوں کو آرام دینے اور اہل وعیال کی پرورش کرنے کے لئے اس نیت سے کئے جائیں

(۱) مسلم: باب وجوب امتثال ما قاله، حدیث: ۲۳۶۳

ان کے حقوق ادا کر کے اور انہیں فائدہ پہنچا کر حکمِ خداوندی بجالانے کی توفیق حاصل ہوگی تو بارگاہِ الٰہی سے اسے مقبولیت کی سند عطا ہوگی۔

احادیث میں اس مفہوم کی مختلف روایتیں ہیں مثلاً:

☆ اگر کسی شخص نے اپنے بچہ کے منہ میں ایک لقمہ بھی اس نیت سے ڈالا کہ حکمِ خداوندی پورا ہوگا تو اللہ تعالی اس کی نیت کا اجر عطا فرمائے گا، بہت سے ایسے عمل جو دنیاوی معلوم ہوتے ہیں وہ حسنِ نیت سے اُخروی اعمال بن جاتے ہیں، اور بہت سے وہ عمل جو دینی نظر آتے ہیں، وہ نیت کی برائی سے دنیوی بن جاتے ہیں۔

بہرحال اس حدیثِ مبارک میں رسول اللہ ﷺ نے دنیوی امور سے متعلق علوم کی جانکاری کی ترغیب دی ہے اور ان پر بھی علم کا اطلاق کیا ہے، البتہ وہی اخلاصِ نیت، خدمتِ خلق اور حلال رزق کی تلاش اس سے مقصود ہو۔

☆ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان جو بھی میوہ دار درخت لگاتا ہے یا کھیتی کرتا ہے اور اس سے پرندے، آدمی اور چوپائے کھاتے ہیں اس کا ثواب اس کو ملتا ہے: "فیأکل منه سبع أو طائر أو شیء إلا کان له فیه أجر "(۱) پودا لگانے پر وہ اگر کسی جانور کے لئے نفع بخش ہوجائے تو اس میں ثواب ملتا ہے تو کیا انسانی جان کی حفاظت کے لئے اگر کوئی انجکشن اور کوئی ٹائبلٹ وغیرہ بناتا ہے تو اس کو ثواب نہیں ملے گا؟

☆ حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے رسول اللہ ﷺ کی دو باتوں کو یاد کر رکھا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالی نے ہر چیز پر بھلائی فرض کر دی ہے تو جب بھی تم قتل کرو تو اچھی طرح قتل کرو اور جب بھی تم ذبح کرو تو اچھی طرح ذبح کرو اور تم میں سے ایک کو چاہئے کہ اپنی چھری کو تیز

(۱) مسلم : باب فضل الغرس والزرع ،حدیث:۴۰۵۲

کرے اور اپنے جانور کو آرام دے۔(۱)

جب جانور کے ذبح کرنے میں مہارت اور لیاقت ضروری ہے تو کیا انسان کے آپریشن اور رہائش کے لئے تعمیرات میں مہارت ضروری نہیں؟ چنانچہ انجنیئرنگ اور میڈیکل میں مہارت ضروری ہوئی۔

☆ ہر اچھی اور مفید چیز میں مہارت اور قابلیت مطلوب ہے اس کی طرف حضور اکرم ﷺ کی یہ روایت اشارہ کرتی ہے: نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ عزوجل یہ پسند کرتا ہے جب کوئی کام کیا جائے تو مہارت کے ساتھ کیا جائے "إن اللـــه يحب إذا عمل أحدكم عملا أن يتقنه"(۲)

اسی کو مرحوم اکبر الہ آبادی نے یوں کہا تھا:

تم شوق سے کالج میں پھلو ، پارک میں پھولو
جائز ہے غباروں میں اڑو ، چرخ پر جھولو
بس ایک سخن بندۂ ناچیز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

☆ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو علمِ نجوم اور علمِ انساب سیکھنے کا حکم کیا تھا:

"تم علمِ نجوم سیکھو، تاکہ تم خشکی اور تری کی تاریکیوں میں راہیاب ہو جاؤ، پھر اس سے رک جاؤ" (تعلّموا من هذه النجوم تهتدون به في ظلمات البرّ والبحر ثمّ أمسكوا) اور ایک روایت میں ہے: تم علمِ نجوم سیکھو تاکہ راستے کی رہنمائی حاصل کرسکو اور علمِ انساب سیکھو تاکہ صلہ رحمی کرسکو، رشتہ داری جوڑ سکو "تعلّموا من النّجوم ما تهتدون بها وتعلّموا من الأنساب ما تتواصلون بها "(۳)

(۱) مسلم، باب الأمر بإحسان الذبح، حدیث:۵۱۶۷

(۲) شعب الایمان: الأمانات ومایجب أدائها إلى أهلها، حدیث:۴۹۲۹

(۳) حياة الصحابة :۲۷۸/۳

☆ نبیٔ کریم ﷺ نے غزوۂ خندق کے موقع سے حضرت سلمانِ فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورہ سے ایرانیوں کی معروف جنگی حکمتِ عملی سے فائدہ اٹھایا تھا اور مدینہ کے اطراف ان کے مشورہ کے مطابق خندق کھدوائی تھی اور اس طرح دشمنوں کے حملہ کے خطرے سے حفاظت کرلی تھی۔(۱)

☆ ان ہی سلمانِ فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورہ سے غزوۂ طائف کے موقع پر آپ ﷺ نے دو نئے آلاتِ حرب استعمال فرمائے جو بعض روایات کے مطابق حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے خود اپنے ہاتھ سے بنائے تھے، اُن میں ایک منجنیق تھی جسے اس زمانے کی توپ کہنا چاہئے، اور دبابے تھے جسے اس دور کے ٹینک کہا جاسکتا ہے۔(۲)

☆ حافظ ابنِ کثیرؒ نے نقل کیا ہے:

آپ ﷺ نے دو صحابہ حضرت عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت غیلان رضی اللہ عنہ کو باقاعدہ شہرِ ''جرش'' بھیجا، تاکہ وہاں سے دبابے، منجنیق اور صنبور کی صنعت سیکھ کر آئیں، ''جرش'' شام کا مشہور صنعتی شہر تھا اور صنبور دبابے کی ہی طرح کا ایک آلہ تھا، جسے اہلِ روم جنگوں میں استعمال کرتے تھے، چنانچہ یہ دونوں صحابہ غزوۂ حنین اور غزوۂ طائف میں اسی لئے شریک نہ ہوسکے کہ وہ دونوں حضرات شام میں یہ صنعت سیکھ رہے تھے۔(۳)

☆ حافظ ابن جریرؒ نقل کرتے ہیں:

''زراعت کی ترقی کے لئے آپ نے اہلِ مدینہ کو زیادہ سے زیادہ کاشت کرنے کا حکم دیا اور پیداوار کو بڑھانے کے لئے یہ تدبیر بتائی کہ کھیتوں میں اونٹوں کی کھوپڑیاں استعمال کیا کریں'' (۴)

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۲/۲۲۴ (۲) البداية والنهاية: ۴/۳۴۸

(۳) طبقات ابن سعد: ۲/۲۲۱، تاریخِ طبری: ۱۶۶۹، البداية والنهاية: ۴/۳۴۸

(۴) كنز العمال: ۲/۱۹، أنواع الكسب

زراعت اور معدنیات سے فائدہ اٹھانے کے لئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:
"اطلبوا الرزق فی خبایا الأرض "یعنی زمین کی پوشیدہ نعمتوں میں رزق تلاش کرو"(۱)

☆ عرب بحری بیڑے سے ناواقف تھے، لیکن حضور ﷺ نے مسرت کے ساتھ پیشن گوئی فرمائی کہ میری امت کے کچھ لوگ اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے سمندری موجوں پر اس طرح سفر کریں گے جیسے تخت نشین بادشاہ(۲) اور پھر مسلمانوں کی پہلی بحریہ کے بیڑے کے فضائل بیان فرمائے، چنانچہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرتِ عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں پہلا بحری بیڑا تیار کیا، اور اس سے مسلمانوں کی تگ وتاز، قبرص اور صقلیہ تک پہنچ گئی، یہاں تک پورا بحرۂ روم ان کے لئے مسخر ہوگیا۔

☆ حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ ان کے سو غلام تھے، ان میں سے ہر غلام علاحدہ زبان میں گفتگو کرتا تھا، چنانچہ حضرت ابن الزبیر رضی اللہ عنہ کو ان غلاموں میں سے ہر ایک کی زبان پر درک حاصل تھا، اور وہ ہر ایک سے اس کی زبان میں گفتگو کرتے تھے، عمرو بن قیس راوی کہتے ہیں :

"میں جب ان کو ان کے دنیوی امور ومشاغل میں دیکھتا تو ان کی دانائی اور دانشمندی سے یہ باور کرتا کہ: یہ شخص لمحہ بھر کے لئے اللہ کا طلب گار نہیں ہوگا اور جب میں ان کے دینی امور اور مشاغل کو دیکھتا تو لگتا کہ شاید یہ شخص لمحہ بھر کے لئے دنیا کی طرف متوجہ نہیں ہوتا"(۳)

"اذا نظرت الیه فی أمر دنیاه قلتُ : هذا رجل لم یرد الله طرفة عین ، واذ نظرت الیه فی أمر اٰخرته قلتُ :

---

(۱) مسندابی یعلیٰ ،مسند عائشة ، حدیث:۴۳۸۴،عجلونی نے"کشف الخفاء :۱۳۸/۱،دار احیاء التراث العربی "میں کہاہے کہ:اس کوابویعلیٰ ،طبرانی اور بیہقی نے سند ضعیف کے ساتھ نقل کیاہے۔

(۲) بخاری : کتاب الجهاد (۳) حیاة الصحابه :۲۷۸/۳

هذا رجل لم يرد الدنيا طرفة عين "(۱)

چنانچہ امام غزالیؒ نے حدیثِ نبوی ﷺ "طلب العلم فريضة على كلّ مسلم" (۲) پیش کر کے جس علم کی تحصیل ہر مسلم پر ہے، اس کو دکھا کر اس علم کا بیان جس کی تحصیل فرض کفایہ ہے" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

"علوم کی اوّلاً دو قسمیں ہیں: (۱) علومِ شرعیہ (۲) علومِ غیر شرعیہ

علومِ شرعیہ سے میری مراد وہ علوم ہیں جو انبیائے کرام علیہم الصلوات سے براہِ راست حاصل ہوتے ہیں، ان کی طرف عقل کی رہنمائی اس طریقہ سے نہیں ہوسکتی، جیسے عقل کے ذریعہ علم حساب سیکھا جاتا ہے، نہ وہ تجربہ سے حاصل ہوسکتے ہیں جیسے علمِ طب کی تدوین ہوتی ہے اور نہ محض سننے سے انکا حاصل کرنا ممکن ہے، جیسے علمِ لغت حاصل کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد جو علوم غیر شرعیہ ہیں، ان میں بعض پسندیدہ ہیں اور بعض ناپسندیدہ اور بعض ایسے جو صرف درجۂ مباح رکھتے ہیں"

۱- علومِ پسندیدہ وہ ہیں جن سے دنیاوی امور کی مصلحتیں وابستہ ہوتی ہیں جیسے علم طب اور حساب وغیرہ، پھر ان علوم پسندیدہ میں اپنے درجوں کے لحاظ سے بعض ایسے ہیں جنکا حاصل کرنا فرض کفایہ ہے، بعض ایسے ہیں جنھیں حاصل کرنا افضل ہے اور بعض ایسے ہیں جن کو حاصل کیا جاسکتا ہے، مگر ان کی تحصیل فرض نہیں ہے۔ پھر ان میں سے فرضِ کفایہ وہ علم ہے جس سے ہم دنیاوی زندگی اور کاروبار کے قائم اور باقی رکھنے میں بے پروا نہیں ہوسکتے، جیسے علم طب ہے کہ اس کی تحصیل صحت کے باقی رکھنے کے لئے لازم ہے، یا علمِ حساب ہے مختلف معاملوں، وصیتوں اور ترکہ کی تقسیم میں اس کی ضرورت ہوتی ہے، اگر کوئی شہر ان علوم کے جاننے والوں سے خالی ہوجائے، تو شہر والوں کو دقت پیش آئے گی، اور جب کوئی

---

(۱) المستدرك: ذكر عبد الله بن الزبير، حديث: ۶۳۳۵

(۲) احياء علوم الدين: الباب الثانى فى العلم: ۱۴/۱، دارالمعرفة، بيروت

شخص بھی ان کا جاننے والا ان کے درمیان پیدا ہو جائے تو اس کے ذریعہ سے شہر کی ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں ، اسلئے یہ فرض اس کی موجودگی میں دوسروں کے ذمہ سے ساقط ہو جائے گا، اسی طرح مختلف پیشے کاشتکاری، باغبانی، پارچہ بافی، ایسے ہی، حجامت اور خیاطی وغیرہ ہیں، کہ اگر ان میں سے کسی پیشہ والے سے کوئی شہر خالی ہو جائے تو زحمت پیش آئے اور بعض پیشہ والوں کی غیر موجودگی میں ہلاکت تک کی نوبت آجائے، پس جس نے بیماری اتاری، اس نے دوا بھی بتائی، ان کے استعمال کے طریقے بتائے اور ان کے مہیا کرنے کے اسباب پیدا کئے، اسلئے ان پیشوں کو چھوڑنا جائز نہ ہوگا۔

اور بعض علوم جن کا حاصل کرنا فرض نہیں، مگر افضل ہے، وہ جیسے علم حساب وطب میں باریکیاں پیدا کرنا ہے کہ انسان ان سے مستغنی نہیں ہو سکتا ہے؛ لیکن ان کی تحصیل سے فائدہ پہنچنے کے پہلوؤں میں اضافہ ہوتا ہے۔

ناپسندیدہ علوم میں سحر، شعبدہ بازی، اور نظر بندی وغیرہ ہیں اور علمِ مباح میں جیسے ایسے اشعار کا پڑھنا جن میں رکاکت نہ ہو یا علم تاریخ وغیرہ سے دلچسپی رکھنا ہے“

پھر امامِ غزالیؒ نے بھی ایک دوسرے موقع پر بھی ”علم“ کے مصداق میں مختلف علموم اور پیشوں کو داخل کیا ہے، ان کے بیان کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے:

”جب علم تمام امور میں افضل ہے تو اس کا حاصل کرنا افضل چیز کا حاصل کرنا ہے اور اس کی تعلیم دینا افضل چیز کا مہیا کرنا ہے، اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کی پیدائش کے مقاصد دین اور دنیا دونوں کے مجموعہ پر مشتمل ہے، کیونکہ دین کا نظام جب تک دنیاوی نظام قائم نہ ہو، قائم نہیں ہو سکتا اور امر دنیاوی کا انتظام انسانوں کے کاموں اور پیشوں پر موقوف ہے اور انسانی پیشے تین قسم کے ہیں:

ایسے پیشے جو عالم کے قیام کے لئے بنیاد کے طور پر ہیں اور وہ چار ہیں:

(۱) زراعت انسان کی غذا کے لئے (۲) پارچہ بافی تن پوشی کے لئے

(۳) تعمیر سکونت کی جگہ کے لئے (۴) اور سیاست خاندان اور ملک کے نظام اور معیشت کے اسباب کے مہیا کرنے اور اس کی حفاظت کرنے کے لئے

۲۔ دوسرے وہ پیشے جو ان چاروں پیشوں کے لئے آلات اور وسیلے مہیا کریں، جیسے لوہاری، اور ندافی (دھنائی) وغیرہ۔

۳۔ تیسرے وہ پیشے ہیں جو پہلی قسم کے پیشوں کو مدد پہونچائیں جیسے کھانا پکانے اور سینے پرونے وغیرہ کے پیشے۔

ان سب پیشوں میں پہلی قسم کے پیشوں کو فضیلت حاصل ہے، اور ان میں سے بھی سے افضل سیاست کا پیشہ ہے جس سے نظم اور ضبط کا وجود عمل میں آتا ہے اور اس کے ذریعہ سے مخلوق کی اصلاح کی جاتی ہے اور انہیں حق کی راہ دکھائی جاتی ہے۔

پیشۂ سیاست کے چار درجہ قرار پا سکتے ہیں:

۱) پہلے درجہ میں انبیائے کرام علیہم السلام کی سیاست ہے جو وہ اپنے پیغاموں سے خلق کی رہبری فرماتے ہیں۔

۲) دوسرا درجہ خلفاء اور سلاطین کو حاصل ہے، ان کے احکام عوام وخواص پر نظم وانتظام کے لئے جاری ہوتے ہیں؛ لیکن ان کی حکومت ظاہر پر ہوتی ہے، باطن پر نہیں۔

۳) تیسرے علمائے کرام ہیں، یہ انبیاء کرام کے وارث ہیں ان کی حکومت لوگوں کے دلوں پر ہوتی ہے اور یہ باطن کی اصلاح کرتے ہیں۔

۴) چوتھے واعظ ہیں جو صرف عوام کی اصلاح کرتے ہیں۔

پس ان پیشوں میں سب سے بڑھ کر پیشہ نبوت کے بعد علم کا فائدہ پہنچانا اور لوگوں کو تہذیب اور اخلاق سکھانا ہے اور یہی فن تعلیم کا حقیقی مقصود ہے" (۱)

اس کے ساتھ اسلامی نقطۂ نظر سے علم دین کے حاصل کرنے والوں کے لئے یہ بھی جائز نہ تھا کہ وہ اس علم کی فضیلت پر ناز کر کے دوسرے غیر شرعی علوم کو حقارت سے دیکھیں؛

---

(۱) حیاء علوم الدین : الباب الثانی فی العلم :۱۴/۱، دارالمعرفة، بیروت

کیونکہ دنیاوی زندگی میں ان علوم کی ضرورتیں مسلم تھیں، امام غزالیؒ نے اس مبحث میں اس لحاظ سے بھی گفتگو کی ہے اور نتیجہ کے طور پر دکھایا ہے کہ علم دین حاصل کرنے والوں کی مثال ان مجاہدین سے دیجاسکتی ہے جو جہاد کے میدان میں اپنا سر ہتھیلی پر لئے دین کی حمایت میں لڑ رہے ہیں اور دوسرے علوم کے حاصل کرنے والوں کی مثال فوج کے اس دستہ سے دی جائے گی جو سرحدی قلعوں پر سرحد کی حفاظت کیلئے متعین ہوتا ہے"۔(۱)

یہ کیا جاسکتا ہے کہ علمِ نافع میں بھی وہ علم مقدم ہے جو مقصدِ زندگی ہے جس سے آدمی اپنے عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت اور اخلاقیات کو درست کرتا ہے یہ فرضِ عین ہے، اور جو علم ضرورتِ زندگی ہے (جیسے ڈاکٹر، انجینئر) اس کا درجہ بعد کا ہے اور وہ فرضِ کفایہ ہے، ضرورتِ زندگی والا علم بھی ایمانی مزاج کے ساتھ ساتھ ہی انسانیت کے حق میں نفع بخش ہوسکتا ہے، کتنے انجینئر وں کو اپنے والدین کی خدمت تو کجا ان کے جنازہ کو کاندھا دینا بھی نصیب نہیں ہے، اور کتنے ڈاکٹر مردہ جنازوں کو زندہ بتلا کر روپے بٹورتے ہیں، کتنے جج ظالم زانی کے حامی بن چکے ہیں، کتنوں نے سائنس کو پڑھ کر بجائے قدرتِ خداوندی کے معترف ہونے کے ملحد اور بددین ہوگئے۔

ہر وہ علم جس سے دین یا دنیا میں انسانیت کو فائدہ پہونچ سکتا ہو اسلام اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، اسلام علم وحکمت کو گمشدہ خزانہ قرار دیتا ہے، آپ نے عبرانی اور سریانی زبانوں کے سیکھنے کی تعلیم دی۔

عباسی خلیفہ مامون رشید نے ۱۲۵ھ میں "بیت الحکمت" قائم کیا، یہ ایک علمی انجمن تھی، جس میں ایک رسد خانہ اور پبلک لائبیریری تھی، اس کام کے لئے مامون نے دو لاکھ درہم خرچ کئے جو اس زمانے کے اعتبار سے سات ملین سے زیادہ ہوتے ہیں اور مترجمین کا ایک ایسا گروہ ملازم رکھا جو مختلف زبانوں اور علوم میں مہارت رکھتے تھے۔

مامون نے "ابن طریق" اور "حجاج بن مطرح" جیسے لوگوں کو جو مختلف زبانوں کے ماہر تھے، دوسرے ممالک میں اس لئے بھیجا کہ وہاں سے ہر فن کی علمی کتابیں مثلاً

---

(۱) احیاء علوم الدین : الباب الثانی فی العلم :۱۴/۱،دار المعرفۃ ، بیروت

طب، فلسفہ، ریاضی کی تصانیف جو ہندی، کلدانی، عبرانی، یونانی زبانوں میں لکھی گئی ہوں، خرید خرید کر بغداد روانہ کر دیں، مورخین نے لکھا ہے ان کتابوں کو سو (۱۰۰) اونٹوں پر لادا گیا۔(۱)

مسلمانوں کے ہر نفع بخش علوم کے تئیں حصول کا جذبہ اس سے سمجھ میں آتا ہے؛ چنانچہ یورپی مؤرخ لکھتا ہے:

”جس زمانہ میں کتاب ولائبریری یورپ والوں کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی اور تمام کلیساؤں میں راہبوں کے پاس سو سے زیادہ کتابیں نہ تھیں، اور وہ بھی مذہبی تھیں، اس وقت بھی اسلامی ممالک میں کافی سے زیادہ کتابیں اور لائبریریاں تھیں، خود بغداد کی لائبریری بیت الحکمت میں چار ملین اور قاہرہ کی لائبریری میں ایک ملین اور طرابلس کی لائبریری میں تین ملین کتابیں تھیں، اور تنہا اسپین میں سالانہ ستر، اسی ہزار کتابیں اکھٹا کی جاتی تھیں“(۲)

بہر حال روزِ اول سے ہی اسلام نے ضروریاتِ زندگی سے متعلق علوم وفنون کو سیکھنے کی ترغیب دی تھی، خود حضراتِ انبیاء حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک ضروریاتِ زندگی سے متعلق فنون کو انبیاء بذاتِ خود برتا ہے، یا اس کی ترغیب دی ہے، پھر یہ سلسلہ اسلام کی تاریخ میں عہدِ اخیر تک رہا ہے۔

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ:

”دشمن کے مقابلے کے لئے قوتِ حرب (جنگی طاقت) کو اس حد تک بڑھانا چاہئے کہ دشمن پر ہیبت طاری ہو جائے، ہمارے پہلے خلفاء وسلاطین اس حکم پر پوری طرح عامل تھے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے خلافتِ عثمانیہ میں پانچ سو بحری جہازوں کا جنگی بیڑہ تیار کیا تھا، دشمن کی

(۱) دائرۃ المعارف بحوالہ دینی وعصری تعلیم۔ مولانا سید احمد ومیض ندوی مدظلہ

(۲) تاریخ تمدنِ اسلام وعرب: ۳۲۹/۳ بحوالہ دینی وعصری تعلیم: از مولانا سید احمد ومیض ندوی مدظلہ

جنگی قوت کی مدافعت کا پورا سامان تیار کرتے تھے، دوسروں کے دستِ نگر نہ تھے، جیسے آج کل ہم دوسروں کے محتاج ہیں، سب مسلمانوں کو مل کر اسلحہ سازی کے کارخانے قائم کرنے چاہیئے، اور نئی ایجادیں بھی کرنی چاہیئے، یہ سب ''أَعِدُّوا لَهُم مَا اسْتَطَعْتُم مِنْ قُوَّةٍ'' میں داخل ہیں''(۱)

حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب عثمانیؒ فرماتے ہیں:

''صبر وتقویٰ اور اللہ تعالیٰ پر ایمان وتوکل تو مسلمانوں کی اصل اور ناقابلِ تسخیر طاقت ہے، اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہر زمانے اور ہر مقام کے مناسب اسلحہ اور سامانِ جنگ بھی جمع کیا جائے، رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ جنگی مشقوں کا اہتمام فرمایا، اس زمانے میں جنگ کے جو ہتھیار تھے ان کو جمع کرنے کی ہدایتیں فرمائیں، امامِ حدیث وتفسیر ابن کثیر نے اپنی تاریخی کتاب ''البداية والنهاية'' میں غزوۂ حنین کے تحت نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے دو صحابہ حضرت عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور غیلان بن اسلم رضی اللہ عنہ اس جہاد میں اسلئے شرکت نہیں کر سکے کہ وہ بعض جنگی اسلحہ اور سامانوں کی صنعت سیکھنے کے لئے دمشق کے مشہور صنعتی شہر میں اس لئے گئے تھے کہ وہاں دبابہ اور صنبور کی وہ جنگی گاڑیاں بنائی جاتی تھیں جن سے اس وقت ٹینکوں جیسا کام لیا جاتا تھا، اسی طرح منجنیق کی صنعت بھی وہاں موجود تھی۔

اس واقعہ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ اپنے ملک کو جنگی اسلحہ اور سامان کے لئے خودکفیل بنائیں، دوسروں کے محتاج نہ رہیں ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ یہ جنگی گاڑیاں اور منجنیق وہاں سے خرید کر درآمد کر لی جاتیں، ہمارا فرض ہے کہ ہم اس پر غور کریں ......ہم

(۱) ماہنامہ البلاغ: جمادی الاولی: ۱۳۷۸ھ

جیسے لوگوں کو اس کی ضرورت کس قدر زیادہ ہے، موجودہ زمانے میں جنگ کے لئے جس طرح اسلحہ اور آلات اور سامان کی ضرورت ہے، ان میں سے کسی سے پیچھے نہ رہیں اور اس کوشش میں لگ جائیں تو قریب سے قریب مدت میں ان چیزوں کے لئے اپنے ملک کو خود کفیل بنا سکیں‘‘(۱)

حضرت مولانا تقی عثمانی مدظلہ نت نئی ایجادات اور یورپی صنعتی انقلابات اور اس کے زندگی پر اثر کے بارے میں لکھتے ہیں:

’’اس سلسلے میں ہمیں عرض کرنا یہ ہے کہ یورپ کے صنعتی انقلاب کے نتیجے میں زندگی کے ہر شعبہ میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں وہ دو قسم کی ہیں : کچھ تو تبدیلیاں وہ ہیں جو موجودہ ترقی کے لئے ناگزیر اور ضروری تھیں اور ان کے بغیر سائنس اور ٹکنالوجی کا موجودہ معیار تک پہنچنا ممکن نہ تھا، انہی کی بدولت دنیا میں نئی نئی ایجادات سے آشنائی، بڑے بڑے کارخانے بنے، پل تعمیر ہوئے، بند باندھے گئے، اور انسانی معلومات میں مفید اضافے ہوئے، صنعتی انقلاب کا پہلو بلا شبہ قابلِ تعریف ہے، عالم اسلام کے لئے اس میدان میں آگے بڑھنا ضروری ہے، اور اسلام نہ صرف یہ کہ اس راہ میں کوئی رکاوٹ عائد نہیں کرتا؛ بلکہ ’’اعداد قوت‘‘ کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی کچھ تبدیلیاں وہ ہیں جو صنعتی اور مادی ترقیات کے لئے ہرگز ضروری نہیں تھیں، مغرب نے انہیں خواہ مخواہ صنعتی انقلاب کے سر منڈھ دیا تھا، چنانچہ آج وہ بھی اپنی اس خامکاری پر نوحہ پڑھ رہا ہے، فحاشی و عریانی، مخلوط اجتماعات، رقص و موسیقی، سو اور ضبطِ ولادت وغیرہ‘‘(۲)

---

(۱) جہاد:۵۳-۵۶، مطبوعہ کراچی

(۲) اسلام اور جدت پسندی:۲۳، کتب خانہ حسینیہ دیوبند

لفظِ ''علم'' کا حقیقی مصداق

قرآن وحدیث میں وارد لفظِ علم کا حقیقی مصداق کیا ہے؟ کیا اس کا اطلاق عصری علوم پر بھی ہوسکتا ہے۔اختراعات کے اس دور میں جو فتنوں کے عروج کا دور ہے، جہاں بہت سارے الفاظ واصطلاحات کو اس کے اصل مفہوم سے ہٹا کر غیر اصل کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، انہیں میں سے ایک علم بھی ہے، ''روشن خیال'' مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہمارا اچھا خاصا، سنجیدہ دین دار طبقہ بھی بے جا وسعت ظرفی کا مظاہر کرتے ہوئے معنیٔ علم میں وسعت کے در پے ہے، ان کا کہنا ہے کہ: علم ایک اکائی ہے، اس کی تقسیم ممکن نہیں؛ لہٰذا علم دین اور علم دنیا کی یہ تقسیم غلط ہے، تمام علوم ایک ہی ہیں، قرآن وحدیث نے جس علم کی فضیلت بیان کی ہے وہ ان تمام کو شامل ہے، جب کہ علمائے ربّانیین اور راسخین فی العلم کی اکثریت بلکہ جمہور علماء اس کے قائل ہیں کہ: علم کی تقسیم مسلم ہی نہیں، علم تو صرف ایک ہے اور وہ علم دین ہے، کیوں کہ وہ آخرت کی فکر پیدا کرتا ہے؛ لہٰذا قرآن وحدیث میں جو فضیلت وارد ہے وہ صرف اسی کی ہے، کسی اور کی نہیں اور دنیوی علوم علم کے زمرے میں داخل ہی نہیں، وہ تو فن، ہنر اور کاریگری ہے، وہ علم کہے جانے کے قابل ہی نہیں، اگر علم کو لغتاً معلومات کے معنی میں لیا جائے تب بھی تو تقسیم کے سوا چارہ کار نہیں، آخرت کی فکر پیدا کرنے والا علم دین اور دنیا اور معاش کا مسئلہ حل کرنے والا علم دنیا، اسی کو ''علم معاش وعلم معاذ'' بھی کہتے ہیں۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خان صاحب پاکستانی تلمیذ رشید حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کشف الباری میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''یہاں علم سے مرادعلمِ دین ہے، جس کی تعلیم کے لئے حضرت جبرائیل آئے، اور اس علم دین کی طلب ہر مسلمان مرد وعورت پر فرض ہے''
> (بحوالہ فتح الباری) تفصیل یہ ہے کہ ایسے تمام امور جن کی ادائیگی کو انسان پر فرض قرار دیا گیا ہے، ان کا علم حاصل کرنا بھی فرض ہے، لیکن امور واجبہ کا علم حاصل کرنا واجب ہے، اور علوم مسنونہ ومندوبہ کا علم

حاصل کرنا مسنون اور مستحب ہے، اور قرآن وحدیث کے جملہ علوم کی تحصیل اور ان میں کمال حاصل کرنا فرضِ کفایہ ہے، فرضِ عین نہیں ہے"

آج کل اسکولوں اور کالجوں میں جو دنیوی فنون سکھائے جاتے ہیں وہ مطلوبِ علم نہیں، یعنی اسکوفرض عین نہیں کہا جائے گا، بعض ان میں فرضِ کفایہ کے درجے میں آتے ہیں، اگر وہ مخلوقِ خدا کے فائدے کے لئے درکار ہوں اور خلافِ شرع امور پر مشتمل نہ ہوں، یا ان کو صرف جواز کا درجہ دیا جائے گا؛ لیکن جو ایسے امور پر مشتمل ہو، جس کی شریعت میں کوئی گنجائش ہی نہیں، تو ان کا حاصل کرنا ناجائز ہوگا" (۱)

علم کے حقیقی مصداق کے متعلق متقدمین کے کچھ اقوال

ابوداؤد اور ابن ماجہ شریف میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: دین کے ضروری علم تین ہیں، (۱) قرآن کا علم، (۲) احادیثِ شریفہ کا علم (۳) اور ان احکام کا علم جو اجماع اور قیاس کے ذریعہ قرآن وحدیث سے مستنبط کئے جائیں، اس کے علاوہ سب علوم زائد علوم ہیں، خواہ وہ کسی بھی طرح کا علم ہو۔

اس حدیث شریف میں شارع علیہ السلام کا مقصد اس بات کو بیان کرنا ہے کہ علومِ شرعیہ انہی تین علوم میں منحصر ہیں، تاکہ امت ان تین علوم کے علاوہ کی طرف سے توجہ ہٹا کر ضروری علوم کی طرف توجہ مبذول کرسکے، اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ باقی علوم کو زائد علوم کہا جائے۔ (۲)

حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں :

"انّ العلم علمان ، علم الدّين وعلم الدّنيا، فالعلم الّذى للدّين فهو الفقه ، والعلم الّذى للدنيا فهو الطب ، وما

(۱) کشف الباری پاکستان :۴۴/۳

(۲) مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوۃ المصابیح :۴۵۶/۱

سوی ذلك من الشعر ونحوه فهو سفه أو عبث"(۲)

''علم دوطرح کے ہیں، علم دین اور علم دنیا، علم دین فقہ ہے، اور علم دنیا طب اور ڈاکٹری ہے، اس کے علاوہ علوم میں مشغول ہونا بے وقوفی یا بے کار ہے''

حضرت حسن بن ربیع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

''میں نے حضرت عبداللہ بن مبارکؒ سے پوچھا کہ ارشادِ نبوی: ''طلب العلم فریضة علی کلّ مسلم'' کا مطلب کیا ہے؟ تو حضرت عبد اللہ بن مبارک نے فرمایا کہ: اس سے وہ دنیوی علوم مراد نہیں جو تم حاصل کرتے ہو، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی دینی معاملہ میں مبتلا ہو تو اس کے بارے میں پہلے جانکار لوگوں سے علم حاصل کرے ''یسأل عنه حتی یعلمه''(۲)

حضرت امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ:

"العلم علمان: النافع هو ما يتعلق بالآخرة وعلم أحوال القلب واخلاقه المذمومة والمحمودة وهو مرضیّ عند الله "(۳)

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ نے اپنے کسی شاگرد کو وصیت فرماتے ہوئے تحریر فرمایا:

"اجماع الخير أن يستعين بالله سبحانه فی تلقی العلم الموروث عن النبی ﷺ فانّه هو الذی يستحق أن يسمی علما وما سویٰ ذلك انما أن يكون علما فلا يكون نافعاً واما أن لا يكون علما فان سمی به ولئن

(۱) تاریخ دمشق :محمد بن إدريس بن العباس:۵۱، ۴۱۰، دار الفکر۔بیروت

(۲) الفقيه والمتفقه:وجوب النفقة فی الدين :۱/۱۷۱، دار ابن الجوزی، السعودیة

(۳) فيض القدير : حرف السين :۴/۱۰۸، المكتبة التجارية ،مصر

کان علما نافعا فلا بد أن یکون فی میراث محمد ما یغنی عنه مما هو مثله وخیر منه " (۱)

حضور ﷺ سے موروث علم کے حصول میں اللہ عزوجل سے مدد طلب کرے، چونکہ یہی علم کہلانے کے مستحق ہے، اور اس کے علاوہ دیگر علوم علم تو ہیں؛ لیکن نافع نہیں ہیں، یا تو وہ علم ہی نہیں ہیں، اگر ان کو علم کہا بھی جاتا ہے تو گرچہ وہ نافع بھی ہو تو ضروری ہے کہ محمد ﷺ کی میراث میں ایسی چیز موجود ہو جو اس سے بے نیاز کرتی ہو جو اسی کے مثل ہو یا اس سے بہتر ہو۔

بخاری شریف کی کتاب التفسیر میں جہاں آیت "وَقُلْ رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا" مذکور ہے اس کی شرح میں حافظ ابن حجرؒ نے تحریر فرمایا:

"والمراد بالعلم العلم الشرعی الذی یفید معرفة ما یجب علی المکلف من أمر عباداته ومعاملاته والعلم باللّٰه وصفاته وما یجب من قیام أمره وتنزیهه ومدار ذلك علی التفسیر والحدیث والفقه"

"علم سے مراد وہ علم شرعی ہے جو مکلّف پر واجب چیزوں کی معرفت عطا کرتا ہو عبادات، معاملات، اللہ عزوجل کی ذات وصفات اور اس کے اوامر ونواہی وغیرہ اور ان تمام علوم کا مدار تفسیر، حدیث اور فقہ پر ہے"

ترمذی شریف وابن ماجہ شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ یوں فرماتے تھے:

"اَللّٰهُمَّ انْفَعْنِیْ بِمَا عَلَّمْتَنِیْ وَعَلِّمْنِیْ مَا يَنْفَعُنِیْ وَزِدْنِیْ عِلْماً وَالْحَمْدُ لِلّٰه عَلیٰ كُلِّ حَالٍ، وَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ حَالِ أَهْلِ النَّارِ"

اس حدیث میں "علمنی ما ینفعنی" کی شرح میں ملا علی قاریؒ نے فرمایا کہ:

---

(۱) مجموع فتاوی ابن تیمیه :ملازمة الذکر وأفضله "لا إله إلا الله": ۶۶۴/۱۰، دار الوفاء، بیروت

علم سے مراد شریعت محمدیہ کا علم ہے، اور اس میں تفسیر حدیث فقہ اور اصولِ فقہ کا علم بھی داخل ہے۔

قرآن کریم کی آیت ''یَرۡفَعِ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ وَالَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ دَرَجٰت ''اس آیت کریمہ کی تفسیر میں علامہ شوکانیؒ فرماتے ہیں:

یہاں ''الذین اوتو العلم '' سے مراد وہ لوگ ہیں جو قرآن پڑھتے ہیں، اولی یہ ہے کہ آیت کو عموم پر محمول کیا جائے، یہ ہر اس مومن اور ہر دین کا علم حاصل کرنے والا اس آیت میں شامل ہے۔ ''حمل الآية على العموم فى كل مؤمن وصاحب علم من علوم الدين من جميع أهل هذه الآية''(۱)

علامہ آلوسیؒ کہتے ہیں:

''والذين اوتو العلم أى الشرعى '' اسی طرح قرآن کریم کی آیت ''وَقُلۡ رَّبِّ زِدۡنِیۡ عِلۡماً '' کی تفسیر میں علامہ بغویؒ نے معالم التنزیل میں، نسفی نے ''مدارك التنزيل ''میں، ابواللیث سمرقندی نے ''بحر العلوم ''میں، شوکانی نے ''فتح القدير ''میں علم سے مراد قرآن کا علم اور اس کا فہم ہی مراد لیا ہے، اور قرآن کریم میں حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق ''وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَاءَ كُلَّهَا'' وہاں علم سے مراد یہ بات مسلم ہے کہ وہ تشریعی علم نہیں، بلکہ وہ تکوینی علم ہے، اسلئے قرآن کریم میں ''اِنَّا اَوۡحَیۡنَا اِلَیۡكَ كَمَا اَوۡحَیۡنَا اِلٰی نُوۡحٍ وَالنَّبِیّٖنَ مِنۡ بَعۡدِهٖ'' میں وحی کا سلسلہ حضرت نوح علیہ السلام تک بیان کیا گیا ہے، حضراتِ مفسرین نے اس میں یہی مذکورہ نقطہ بیان فرمایا ہے''

اور حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق ''عَلَّمۡنٰهُ صَنۡعَةَ لَبُوۡسٍ ''فرمایا گیا ہے، تو وہاں علم شرعی مراد نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق کسب و پیشہ سے ہے، احادیث میں اس کے لئے

(۱) فتح القدير : سورة الجمعة :۲۲۶/۵، دار ابن كثير ، دمشق

صراحتہ کسب یا عمل بالید کا لفظ استعمال ہوا ہے، ’’كان داؤد عليه السلام لا يأكل الاّ من كسب يده ‘‘(۱)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھایا کرتے تھے۔

نیز نبی کریم ﷺ کی بعثت کا مقصد علم شرعی کی دعوت واشاعت ہے، دنیوی علوم کے لئے آپ ﷺ مبعوث نہیں کئے گئے، مسلم شریف کی حدیث میں ہے کہ:

’’حضور ﷺ ایک قوم کے پاس سے گذرے، جو تلقیح کرتے تھے (یعنی اچھے اور زیادہ پھل حاصل کرنے کی غرض سے نر درخت کا خوشہ مادہ درخت کے خوشہ میں رکھ دیتے تھے) آپ ﷺ نے فرمایا: کہ اگر تم لوگ ایسا نہ کرو تو اچھا ہے، ”لو لم تفعلوا لصلح“ ان لوگوں نے اس عمل کو ترک کردیا، راوی کہتے ہیں کہ: اس مرتبہ ردی کھجوریں پیدا ہوئیں، اور آپ کا ان پر دوبارہ گذر ہوا، تو آپ ﷺ نے پوچھا: کہ تمہارے کھجوروں کا کیا حال ہے؟ انہوں نے جواباً کہا کہ: آپ ﷺ نے ایسا کہا تھا، ہم نے ویسا ہی کیا اور ردی کھجوریں پیدا ہوئیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ: تم لوگ اپنے دنیاوی کاموں سے زیادہ واقف ہو ”انتم أعلم بأمور دنيا كم“ (۲)

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دنیوی علوم اگر نبی پاک ﷺ کے مقاصد میں داخل ہوتے آپ ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم سے ’’أنتم أعلم بأمور دنيا كم ‘‘(۳) نہ فرماتے۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ علم کے صحیح مصداق کی وضاحت

---

(۱) طبرانی : قطعة من المقفود ،حدیث:۹۵

(۲) مسلم : باب وجوب امتثال ما قاله ، حدیث:۶۲۷۷

(۳) مسلم : باب وجوب امتثال ما قاله ،حدیث:۶۲۷۷

کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

''علم کا شرف معلوم کے شرف پر موقوف ہے اور معلوم اس کو کہتے ہیں جس کے حالات اس علم میں بیان کئے جائیں''۔

علم دین کا معلوم حق تعالیٰ شانہ کی ذات ہے اور تمام علم دین کا حاصل بھی یہی ہے اور دیگر تمام علوم ماسوی اللہ ہے، پس جو نسبت دنیا یا ماسوی اللہ کو حق تعالیٰ کے ساتھ ہے، وہی نسبت علوم دینیہ کو علم دین کے ساتھ ہوگی اور اس کی نسبت بجز اس کے کیا کہا جاسکتا ہے۔

ع چہ نسبت خاک را با عالم پاک

حق تعالیٰ کی ذات وصفات تو کسی چیز کے ساتھ کچھ نسبت نہیں رکھتے، وہ باقی اور سب فانی، وہ زندہ اور سب مردہ، وہ غنی اور سب محتاج، وہ موجود اور سب معدوم (کل شیء هالك إلا وجهه)۔

غرض دونوں چیزوں میں کوئی نسبت نہیں قرار دی جاسکتی ہے، سوائے اس کے علم دین پر موجود کا اطلاق کیا جائے اور علم دنیا پر معدوم، اب میرا دعوی قریب المفہوم ہو گیا ہے کہ علم دین کے سامنے دیگر علوم کہلانے کے مستحق ہی نہیں؛ تو مقابلہ کیا کیا جائے؟ علومِ دنیا کو علوم مت کہو، فن کہو، پیشہ کہو، حرفت کہو (انفاس عیسی)

شیخ الاسلام ترجمان اہل سنت والجماعت حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نور اللہ مرقدہٗ تو ''جدید دور میں علم اور اس کا استعمال، فتنۂ الفاظ کا جائزہ'' کے تحت فرماتے ہیں:

''موجودہ دور کے علمی وذہنی فتنوں میں سے ایک بڑا فتنہ ''فریب الفاظ'' کا بھی ہے، ایک لفظ جسے ہم بولتے ہیں، وہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے ایسے حقائق پر مشتمل ہوتا ہے، جو بالکل صحیح وصادق، مقدس ومتبرک، اور نہایت معقول ومحمود ہے، مگر اسی لفظ کے عام لغوی معنی کی وسعت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اسے بہ طور تلبیس وتلمیح، ایک ایسے معنی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو بجائے مقبول ہونے کے مردود اور مذموم ہوتا ہے، اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ مخاطب کو مغالطہ دے کر، محض خوش نما اور دل

فریب الفاظ سے مسحور کر دیں''۔

آزادی، مساوات، تہذیب، ترقی اور اسی طرح کے اور الفاظ ہیں، جو اگر اپنے اصلی وحقیقی معانی میں مستعمل ہوں، نہایت محمود، مستحسن اور قابلِ تعریف ہیں، لیکن جب کسی زشت وشنیع مفہوم کو خوبصورت ظاہر کرنے کے لیے یہی الفاظ بہ بطور نقاب استعمال ہونے لگیں، تو یہ خالص تلبیس وخداع ہے۔ ٹھیک یہی صورت آج کل، لفظ ''علم'' کے متعلق واقع ہوئی ہے۔

کسی مسلم اسکول کا افتتاح ہو، کسی کالج کی بنیاد رکھی جائے، کسی یونیورسٹی کی تقسیم اسناد کا جلسہ ہو، آپ دیکھتے ہیں کہ حضرات مقررین کس شد و مد سے ''علم'' کے فضائل میں، قرآنِ پاک کی بہت سی آیات اور رسول کریم ﷺ کی بے شمار احادیث پڑھتے رہتے ہیں، گویا اپنے اس طرزِ عمل سے مخاطبین پر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ جدید علم کے ایسے ایسے فضائل قرآن پاک میں موجود ہیں، حالاں کہ قرآن کریم کو ایک سرسری نظر سے پڑھ جائیے تو ظاہر ہو جائے گا کہ وہ خود علم کی دو قسمیں قرار دیتا ہے:

ایک علم نافع مطلوب ومحبوب؛ دوسرا مضر ومردود......اس کے نزدیک ایک علم زہر ہے، دوسرا تریاق، ایک پاک شراب ہے، دوسرا محض سراب۔ ایک سببِ ہلاکت ہے، دوسرا سامانِ نجات۔ ایک آسمان کی بلندیوں پر اٹھانے والا ہے، دوسرا اسفل السافلین کی پستیوں میں پہونچانے والا۔

جو علم اپنے اثرات کے اعتبار سے آخر کار خشیت الٰہی اور رغبتِ آخرت پر منتج نہ ہو، جو علم انسان کو خدا سے نڈر اور زندگی کے آخری انجام سے بالکل غافل کر دے، جو علم ایسی مادی دنیا کی لذت وانبساط وشہوات حیوانیہ کو (خواہ وہ کتنی ہی ترقی یافتہ شکل میں ہوں) انسان کا معبود ٹھہرائے، کیا ایسا علم بارگاہ رب العزت میں درخور اعتنا یا لائق التفات ٹھہر سکتا ہے؟ یا قرآن حکیم اس کے اکتساب کی ایک لمحہ کے لیے بھی ترغیب دے سکتا ہے؟

قرآن تو ایسے علم کی نسبت صاف طور پر یہ حکم دیتا ہے:

''فَأَعْرِضْ عَن مَّنْ تَوَلّٰى عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ

الدُّنیَا ○ ذٰلِکَ مَبۡلَغُھُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ "(۱)

"تو منہ پھیر لے اس کی طرف سے، جس نے ہماری بات سے منہ پھیر لیا اور جس کا مقصد اس دنیوی زندگی سے آگے کچھ نہیں، ان کے علم کی رسائی اور پرواز یہیں تک ہے"

اس کے بالمقابل ایک وہ لوگ ہیں، جو اللہ سے ڈرتے ہیں، اس کی مخلوق پر رحم کھاتے ہیں اور ادب وتہذیب کے قاعدوں پر عمل کرتے ہیں۔ اخلاقی پاکیزگی ان کا جوہر ہے، ایمان کے نور سے ان کے دل روشن ہیں۔ غرض کہ علم ان کے اندر اِنابت الی اللہ، رحمت علی الخلائق کے اوصاف پیدا کرتا ہے، تو اسی طرح کے اولوا العلم کے حق میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"یَرۡفَعِ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ آمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَالَّذِیۡنَ أُوۡتُوا الۡعِلۡمَ دَرَجَاتٍ"(۲)

قرآن پاک نے ایک شخص (قارون) کا ذکر کیا ہے، جس کی دنیوی دولت اب تک ضرب المثل ہے۔ جس کے خزائن کی کثرت کا اندازہ "ان مفاتحہ" کے الفاظ سے ہوسکتا ہے، جس کا سامان دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں، حتیٰ کہ بہت سے تمنا کرتے تھے کہ "یالیت لنا مثل ما أوتی قارون انه لذو حظ عظیم" اس نے ترقی کی اس معراج پر پہونچ کر ایک علم کا دعویٰ کیا تھا، جس کے ذریعہ اس کو یہ عروج حاصل ہوا "قال انما أوتیته علی علم عندی"۔

بہر حال وہ علم تھا، اس کے بالمقابل دوسرا گروہ تھا، جس کا ذکر حق تعالیٰ اس طرح فرماتا ہے: "و قال الذین أوتوا العلم ویلکم ثواب الله خیر لمن آمن و عمل صالحًا" یہ "الذین اوتوا العلم "(۳) اُس علم والے تھے جو قارون کے اُس تمام ترقیات اور علم وہنر کو حقیر سمجھ رہے تھے اور اُدھار کو نقد پر ترجیح دے رہے تھے۔ قرآن کریم نے تو ایک آیت میں مسئلہ کا دوٹوک فیصلہ کر دیا ہے: "انما یخشی الله من عباده العلماء"۔(۴)

---

(۱) النجم:۲۹-۳۰
(۲) المجادلة:۱۱
(۳) القصص:۸۰
(۴) الفاطر:۲۸

اس ''انما'' کے لفظ پر غور کیجئے۔ گویا جو علم قلب میں خشیت الٰہی پیدا نہ کرے، وہ علم ہی نہیں۔ ایسے اصطلاحی علم سے جہل ہزار درجے بہتر ہے۔

حدیث صحیح میں نبی کریم ﷺ نے اس علم سے پناہ مانگی ہے، جو نفع سے خالی ہو، قرآن کریم میں بھی ہے: ''و یتعلمون ما یضرھم و لا ینفعھم''(۱) معلوم ہوا کہ علم نافع بھی ہوتا ہے اور مضر بھی۔

پس ایسے علوم جو انسان کو شیطان یا درندہ بنادیں یا اسے ترقی یافتہ بہائم کے زمرہ میں داخل کردیں۔ ان کی طرف ترغیب دلانے کے موقع پر مطلق علم کے فضائل قرآن وحدیث سے پیش کرنا، انتہائی تلبیس اور گمراہی ہے۔

مقصد یہ ہے کہ ہم یہ نہیں کہتے کہ علوم وفنون حاصل نہ کیے جائیں، لیکن درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، اگر علم وفن کی ترقی کا ما حاصل یہی ہے جو ہم دیکھ رہے ہیں تو فی الحقیقت ایسے علم سے جہل بہتر ہے، اگر علم وفن کی چکا چوند کرنے والی ترقیات مذہبی اور دینی علم وتہذیب کے ماتحت رہتیں تو دنیا کو ایسے بھیانک نتائج ہرگز نہ دیکھنے پڑتے۔(۲)

مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ علم کی دو قسمیں ہیں: ایک علم دین اور دنیا کے اعتبار سے۔ اور دوسرا نفع اور نقصان کے اعتبار سے۔ تحصیل علم دین تو خیر الناس والاعمل یعنی انسانوں کے کاموں میں سے ایک بہترین کام ہے، البتہ علم دنیا کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتے، ہاں اگر اچھی نیت ہو مثلاً کسبِ حلال کی نیت سے دینی تمام احکام کی رعایت کرتے ہوئے اسے حاصل کیا جائے تو ہوسکتا ہے کارِ ثواب ہوجائے، جب کہ کوئی حلال چیز کا کسب حلال طریقے سے ہو، اور اگر محض ''علمِ دنیا'' ہی مقصود ہو، تب تو ہلاکت اور ضرر کے علاوہ کچھ بھی نہیں، جتنی احادیث اور آیات فضیلتِ علم میں وارد ہوئی ہیں وہ سب علم دین کے بارے میں ہیں۔

حضرت تھانویؒ تو فرماتے ہیں:

''علم نام ہی علمِ نافع کا ہے، ورنہ اگر عمل نہ ہو تو علم نہیں معلومات ہے،

---

(۱) البقرۃ:۱۰۲ (۲) بیداری، حیدرآباد، سندھ، جون ۲۰۰۶ء

چاہے علمِ دین ہی کیوں نہ ہو، کیوں کہ ایسا علم دین جس پر عمل نہیں بندہ پر حجت اور دلیل بن جاتا ہے، جواز دیا دِعذاب کا سبب ہوگا، اسی لیے مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نوراللہ مرقدہٗ تحریر فرماتے ہیں، کہ علم کا ثمرہ اوراس کی حقیقی علامت اللہ تعالیٰ کی خشیت ہے''۔(۱)

حکم ''اِقراءٗ'' کا پیغام

حضرت مولانا ابوالحسن ندویؒ قرآن کریم کی آیت'' إقرا باسم ربك الذی خلق '' کے تحت مفید اور غیر مفید اور تخریبی علم کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرماتے ہیں:

''حضور اکرم ﷺ نے نہ کبھی پڑھا اور نہ کبھی لکھا اور کہا گیا پڑھو،'' إقرا'' یعنی اب جوامت پیدا ہوگی، وہ قرات والی امت ہوگی اوراس کا رشتہ علم کے دامن سے باندھ دیا جائے گا؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی رہنمائی کی جارہی ہے جس کو اکثر قوموں نے نظر انداز کردیا اور ترقی یافتہ مغرب میں جب سے وہاں بیداری شروع ہوئی،'' إقرا'' پڑھو؛ لیکن صرف پڑھنا کام نہیں آئے گا؛ بلکہ وہ علم تخریبی بن جائے گا، وہ تخریبی ذہن پیدا کرے گا اور انسانوں میں خود پرستی پیدا کرے، دوست پرستی پیدا کرے گا اور شہوانیت کی طرف لے جائے گا،'' اقرا'' پڑھو؛ لیکن خالی ''إقرا'' پڑھنا کام نہیں آئے گا، ''إقرا باسم ربك الذی خلق '' اپنے پروردگار کے نام سے پڑھو، دنیا میں اب اگر تاریخ منصفانہ طریقہ پر حقیقت پسندانہ طریقہ پر لکھی جائے اور دیکھا جائے کہ دنیا میں انسانیت کا زوال کب سے شروع ہوا تو یہ عنوان قرار دینا ہوگا جب سے علم اور اسم کا رشتہ ٹوٹا، جب علم اسم سے آزاد ہوا اور انسان نے اسم کو بھلاتے ہوئے، فراموش کرتے ہوئے انکار کرتے ہوئے؛ بلکہ بغاوت کرتے

(۱) مقالہ مولانا حذیفہ وستانوی: ''تعلیم اور سماجی خرابیاں''، پیش کردہ برموقع سمینار، جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا، زیرنگرانی: مولانا آزاد نیشنل اردو، یونیورسٹی، حیدرآباد، ۱۲، جنوری تا ۲۱ جنوری: ۲۰۱۰ء

ہوئے کہ اس کائنات کا کوئی خالق نہیں ہے، اگر اس کائنات کا کوئی خالق ہے بھی تو اس کا مالک نہیں ہے، وہ اس کا منتظم نہیں ہے ....
ضرورت اس بات کی ہے کہ علم کو اسم کے ساتھ لے کر چلا جائے، علم اسم کی رہنمائی میں اسم کے سایہ میں اس کی سرپرستی میں آگے بڑھے اور اسم کی برکت بھی اس کے ساتھ ہو، تب جا کر ہماری ٹکنالوجی اور سائنس کی جتنی شاخیں اور جتنے تعمیری کام ہیں اور تعمیری ادارے ہیں اور ہماری دانش گاہیں ہیں، ہمارے تحقیقی مراکز ہی ہیں وہ سب اسی وقت مفید ہو سکتے ہیں کہ جب اسم کے سایہ میں ہوں''(۱)

غور کرنا چاہئے کہ پڑھنے کے حکم دینے کے بعد تیس پاروں میں قرآن نے کیا پڑھایا ہے، اس کے فورا بعد نازل ہونے والی آیتوں میں ''یا أیها المزمل'' اور ''یا أیها المدثر'' والی آیتوں میں کیا پیغام دیا گیا ہے۔ خود نبی رحمت ﷺ نے دار ارقم وصفّہ میں کونسے علوم پڑھائے؟ کلام کو متکلم کی زندگی کی روشنی میں سمجھا جاتا ہے۔

''أطلبوا العلم ولو بالصين'' کی تحقیق:

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ اس حدیث کی توضیح اور اس کے صحیح مصداق کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''جتنے فضائل احادیث میں علم کے لئے وارد ہیں، انگریزی تعلیم پر بھی ان کو جاری کرتے ہیں اور اس کے متعلق یہ حضرات ایک حدیث بھی پیش کرتے ہیں ''اطلبوا العلم ولو بالصين'' یعنی علم کو طلب کرو اگرچہ چین میں بھی ہو، وہ کہتے ہیں کہ: دیکھئے! حضور ﷺ نے چین سے طلب علم کی ترغیب دی ہے، حالانکہ اس وقت چین میں دین کا علم نہ تھا؛ بلکہ محض دنیاوی علم تھا، معلوم ہوا کہ حضور اکرم ﷺ مطلق علم کی ترغیب دے رہے ہیں، خواہ دنیا کا علم ہو یا دین کا، پس انگریزی بھی علم ہے اور اس

(۱) ماخوذ از: انسانیت کے زوال کا سبب، علم سے اللہ کے نام کا جدا ہونا، حضرت مولانا ابوالحسن الندویؒ

حدیث کے تحت میں داخل ہے، ان لوگوں کو اول تو اس حدیث کا ثبوت دینا چاہیئے، ان الفاظ سے یہ حدیث محدثین کے نزدیک ثابت ہی نہیں۔

”قلت ذکر له فی المقاصدطریقین ، وقال : هو ضعیف من الوجهین ، وقال ابن حبان : أنه باطل لا أصل له ، وأخرجه ابن الجوزی فی الموضوعات ، قال وأخرجه البیهقی فی الشعب ، قلت ، قد التزم أن یخرج موضوعا فلأشبه الحکم علیه بالضعیف ، والضعیف لا یحتج به فی الأحکام “(الجامع)

میں کہتا ہوں کہ: مقاصد میں اس کے دوسندیں ذکر کی گئیں ہیں، اور فرمایا ہے، یہ روایت ان دونوں سندوں سے ضعیف ہے، ابن حبان کہتے ہیں: یہ روایت باطل ہے، اس کی کوئی اصل نہیں، ابن الجوزی نے اس کو موضوعات میں ذکر کیا ہے، فرماتے ہیں کہ: اس کی بیہقی نے شعب الایمان میں تخریج کی ہے، میں کہتا ہوں: انہوں نے موضوعات کے ذکر کا بھی التزام کیا ہے، زیادہ بہتر اس پر ضعف کے حکم لگانے کا ہے اورضعیف روایت سے احکام میں استدلال نہیں کیا جاسکتا۔

اور اگر ثابت بھی ہوتب بھی ان لوگوں کا مدعا اس سے حاصل نہیں ہوتا؛ کیوں کہ انہوں نے لفظ ”ولـــو“ پر نظر نہیں کی، یہ لفظ فرض کے لئے آتا ہے، مطلب یہ ہے کہ اگر بالفرض چین میں بھی علم ہوتو وہاں سے بھی کوشش کر کے حاصل کرنا چاہیئے اور فرض اس چیز کو کیا جاتا ہے جو معدوم ومستبعد ہو، موجود کو فرض نہیں کیا جاسکتا، معلوم ہوا کہ حضور اکرم ﷺ کی مراد اس حدیث سے وہی علم ہے جو چین میں اس وقت موجود نہ تھا، اس لئے بطور فرض کے فرمارہے ہیں کہ اگر وہاں بھی ہوتو حاصل کرو اور یہ وہ علم دین ہی ہے، ورنہ اگر علم کو ایسا عام کیا گیا کہ دنیوی علم بھی اس میں داخل

ہو گیا تو ایک بھنگی اور چماری کو بھی عالم کہنا چاہئے؛ کیوں کہ اس کو بھی علم حاصل ہے جو وہ کام کرتا ہے، اس کو خوب جانتا ہے اور اگر آپ ان کاموں کو بھی علم میں داخل کرلیں گے تو پھر آپ کی خاطر سے ہم انگریزی کو بھی اس میں داخل کریں گے اور خیر جانے دیجئے! ہم لفظ ''لو'' سے بھی استدلال نہیں کرتے ،مگر ہم کہتے ہیں:''أطلبوا العلم ولو بالصين '' میں تو تصریح نہیں کہ اس سے کون سا علم مراد ہے؟ اب شریعت کی دوسری نصوص سے اس کو دریافت کیا جائے ،بس علم وہ ہے جس کو شریعت علم کہتی ہے جس کے جاننے والوں میں ایک شیخ سعدی رحمۃ اللہ بھی ہیں:

علمے کہ راہ بحق ننماید جہالت است

اور حدیث میں ہے:

''الدنيا ملعونة وما فيهاملعون إلا ذكر الله وما والاه'' (الحديث)

معلوم ہوا کہ جو چیز خدا کی طرف قریب نہ کرے، وہ دنیائے ملعونہ ہے، اس میں ایسے علوم بھی داخل ہیں، اب میں آپ سے ہی پوچھتا ہوں کہ کیا سائنس اور جغرافیہ اور انگریزی زبان سے کوئی خدا کے قریب ہوتا ہے؟ وصل ہوتا ہے یا فصل؟ قرب ہوتا ہے یا بعد؟ مشاہدہ ہے کہ ان سے بعد ہی بڑھتا ہے، گو چاہئے تو یہ تھا کہ سائنس سے خدا کی طرف سے خدا کی طرف قریب بڑھتا؛ کیوں کہ اس سے قدرت مانع کا انکشاف ہوتا ہے اور اپنا عجز زیادہ مشاہد ہوتا ہے؛ کیوں کہ اہل سائنس رات دن ترقی کی فکر میں رہتے ہیں، اس لئے ان کے مقاصد بہت وسیع ہیں جن میں کثرت سے ایسے مقاصد بھی ہیں جو عرصہ تک پورے نہیں ہوئے، زمانۂ دراز تک ان میں ناکامی رہتی ہے، بخلاف ہمارے مقاصد کے کہ وہ معدودے چند ہیں، جو اکثر پورے ہو جاتے ہیں، مگر ہم پھر بھی اپنے عجز کے معترف

ہیں، ان لوگوں کے زیادہ مقاصد ناکام رہتے ہیں جو کھلی دلیل ہے عجز کی، مگر یہ لوگ باوجود مشاہدۂ عجز زائد کے پھر بھی اپنے کو قادر سمجھتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے عجز پر نظر نہیں کرتے، بس عرصہ کے بعد جو کسی مقصود میں کامیابی ہوگئی، اس پر نازاں ہوتے ہیں کہ ہم نے یہ ایجاد کر لی؟ ڈلے پتھر، اگر ایجاد تمہارے ہاتھ میں تھی تو پہلے ہی کیوں نہ ایجاد کر لی؟ تمہارا کام صرف اتنا ہے کہ سوچو اور غور کرو، باقی ذہن میں ایجاد کا صحیح طریقہ آجانا یہ تمہارے اختیار سے بالکل خارج ہے، یہ محض حق تعالیٰ کے قبضے میں ہے، مگر عادت الٰہیہ ہے کہ جب کسی بات کے لئے انسان غور وفکر کرتا ہے تو وہ اکثر راستے کھول دیتا ہے، مگر عادت الٰہیہ ہے کہ جب کسی بات کے لئے انسان غور وفکر کے بعد بھی حقیقت ظاہر نہیں کرتے؛ چنانچہ اب تک کسی کو نہیں معلوم کہ مقناطیس لوہے کو کیوں جذب کرتا ہے؟ اور ایسی نظائر بکثرت موجود ہیں، اگر غور وفکر کے بعد حقیقت تک پہنچ جانا تمہارے اختیار میں ہے تو ان چیزوں کا انکشاف کیوں نہ کرلیا؟''(۱)

غیر رسمی طور پر علمِ دین حاصل کرنے والے

اِس سلسلہ میں یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ: ہمارے اس زمانہ میں دینی مدارس اور دارالعلوم کی شکل میں علم دین کی تحصیل وتعلیم کا جو نظام قائم ہے۔ اس وجہ سے جب ہمارے دینی حلقوں میں ''طالب علم'' کا لفظ بولا جاتا ہے تو ذہن ان دینی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے والے ''طالب علموں'' ہی کی طرف جاتا ہے، اسی طرح عالم یا معلم دین کا لفظ سنکر ذہنی اصطلاحی وعرفی اور دینی مدارس میں تعلیم دینے والے اساتذہ ہی کی طرف منتقل ہوتا ہے، اور پھر اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ مندرجہ بالا حدیثوں میں اور اسی طرح اس باب کی دوسری حدیثوں میں علم دین کی طلب وتعلیم، یا طالبان علم دین اور معلمین دین کے جو فضائل ومناقب بیان ہوئے ہیں اور ان پر اللہ کی طرف سے ہونے

(۱) اشرف الجواب: حصہ چہارم: ۵۰۰، مکتبہ عمر فاروق، کراچی

والے جن غیر معمولی انعامات کی بشارتیں دی گئی ہیں، ان سب کا مقصدان مدارس ہی کی تعلیمی سلسلہ کو اوران کے طلبہ اور معلمین ہی کو سمجھ لیا جا تا ہے؛ حالانکہ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے، عہد نبوی میں اوراس کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بلکہ تابعینؒ کے دور میں بھی اس طرح کا کوئی تعلیمی اور تدریسی سلسلہ نہیں تھا، نہ مدارس اور دارالعلوم تھے، نہ کتابیں پڑھنے اور پڑھانے والے طلبہ اوراساتذہ کا کوئی طبقہ تھا، بلکہ سرے سے کتابوں ہی کا وجود نہیں تھا ،بس صحبت وسماع ہی تعلیم وتعلم کا ذریعہ تھا،صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے (ان کے درجہ اوّل کے علماء وفقہاء مثلاً خلفائے راشدین، معاذ بن جبل، عبداللہ بن مسعود، ابی ابن کعب، زید بن ثابت وغیرہ رضی اللہ عنہم نے بھی) جو کچھ حاصل کیا، وہ صرف صحبت وسماع ہی کے ذریعہ حاصل کیا تھا،اور بلاشبہ وہ حضرات ان حدیثوں اور بشارتوں کے اولین مصداق تھے۔

راقم السطور عرض کرتا ہے:

’’آج بھی جو بندگانِ خدا کسی غیر رسمی طریقے سے مثلا: صحبت وسماع ہی کے ذریعہ اخلاص کے ساتھ دین سیکھنے اور سکھانے کا اہتمام کریں، وہ بھی یقیناً ان حدیثوں کے مصداق ہیں، اور بلاشبہ ان کے لئے بھی یہ سب بشارتیں ہیں۔ بلکہ ان کو اصطلاحی وعرفی طلبہ اور معلمین پر فضیلت وفوقیت حاصل ہے اور وہ یہ کہ ہمارے موجودہ مدارس اور دارالعلوموں میں پڑھنے اور پڑھانے والے طلبہ اور اساتذہ کے سامنے اس طلب وتعلیم کے کچھ دنیوی منافع بھی ہوسکتے ہیں، (اور بس اللہ ہی جانتا ہے کہ اس لحاظ سے ہماری بربادی کا کیا حال ہے؟) لیکن جو بے چارے اصلاح وارشاد کی مجالس میں یا کسی دینی حلقہ میں اپنی دینی اصلاح اور دین سیکھنے کی نیت سے شریک ہوتے ہیں یا دین سیکھنے سکھانے والے کسی جماعت کے ساتھ کچھ وقت گذارتے ہیں، ظاہر ہے کہ وہ اس سے کسی دنیوی منفعت کی توقع نہیں کرسکتے، اسلئے ان کی غیر رسمی ’’طالب علمی‘‘ یا ’’معلّمی‘‘ بالکل بے غل وغش صرف اللہ ہی کیلئے اور آخرت ہی کے واسطے ہوتی ہے، اللہ کے

ہاں اسی عمل کی قدر و قیمت ہوتی ہے، جو خالصاً لوجہ اللہ ہو۔اس عاجز نے اس زمانے میں بھی اللہ کے ایسے بندے دیکھے ہیں۔ان میں متعدد ایسے بھی پائے جن سے ہم جیسے لوگ (جن کو دنیا عالم وفاضل سمجھتی ہے) حقیقت میں دین کا سبق لے سکتے ہیں۔

یہ وضاحت یہاں اس لئے ضروری سمجھی گئی ہے کہ ہمارے اس زمانے میں ''عالم''، ''معلم'' اور طالب علم کے مصداق کے بارے میں مذکورہ بالا غلط فہمی بہت عام ہے۔اگر چہ غیر شعوری طور پر ہے'' (۱)

فنون میں غیروں سے مشابہت ناجائز

یہ حقیقت ہے کہ ہر چیز کا وجود اس کی امتیازی خصوصیات، اسکے مخصوص نقشہ کی وجہ سے ہوتا ہے جو اوصاف اور نقشہ کسی دوسرے کو میسر نہیں، اگر زید عمر سے الگ دکھائی دیتا ہے یا ایک مکان دوسرے مکان سے علاحدہ نظر آتا ہے یا ایک کپڑا دوسرے کپڑے سے ممتاز معلوم ہوتا ہے تو وہ انہیں خصوصیات کے سبب جو ان میں مشترکہ نہیں، بلکہ آپس میں جداگانہ اور ممتاز ہیں، مکان کا ایک مخصوص نقشہ ہے جو دوسرے سے ممتاز ہے، کپڑے کو ہم اس کی رقت وغلظت، کپڑے کی چکناہٹ اور اس کے کرخت پن کے ذریعہ ایک دوسرے سے ممتاز کرتے ہیں، اسی طرح زید کے چہرے اور قد وقامت کی وہ مخصوص صفات واعراض ہیں جو عمرو کے لئے نہیں۔

ان اعیان کو چھوڑ کر اعراض کو لیں تو یہاں پر بھی صورت کا اختلاف ان کے وجود اور ہستی کے بقا کی وجہ سے ہوتا ہے، نور کی شکل اور ہے ظلمت کی اور، ان کی حقیقت جب ظہور کرتی ہے تو اپنی نورانی شکل میں اور رات اپنی تاریک اور بھیانک شکل پر، الوان کو دیکھو تو سیاہ رنگ، وہ شکل نہیں جو سرخ کی ہے اور سرخ کی وہ شکل نہیں جو سبز وسیاہ کی ہے؛ بلکہ ہر ایک اپنی امتیازی صورت میں اپنے وجود کی نمائش کر رہا ہے۔

اسی طرح جمادات کے نوعی دائرے میں جب ہم پتھر کی تلاش میں نکلتے ہیں تو کبھی

---

(۱) معارف الحدیث

پتھر کے دھوکے میں ریت اور لکڑی نہیں اٹھاتے، کیونکہ پتھر کی ایک قدرتی شکل متعین ہے جس سے وہ پہچانا جاتا ہے، اسلئے نہ پتھر کو اینٹ کہہ سکتے ہیں، نہ اینٹ کو پتھر، نباتات میں آم کو دیکھ کر ہمیں کبھی سیب و انار ہونے کا دھوکہ نہیں ہوتا کہ ان کی صورتیں ممتاز ہیں۔

اسی طرح اگر ہم حیوانات میں انسانیت کے جویا ہوں تو گھوڑے اور گدھے اور شیر کی شکلوں میں اس کو تلاش نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اس کو انسان ہی کی شکل میں تلاش کرنا ہوگا، جو اپنے قوی، قوت احساس وادراک، ایجاد واختراع کی طاقت، نفاست ونزاہت سے خوش آئند صفات کا حامل لباس، زینت کے خوش نما منظر، حالات اپنے اندر لئے ہوئے ہوتا ہے، پھر انسانوں کے آپسی حیوانی ونفسانی جذبات کے اتحاد کے باوجود ان میں صنفی اختلافات اور تفریق بھی ہے، جن میں ایک کو مرد اور دوسرے کو عورت سے تعبیر کرتے ہیں، اس اختلاف کی وجہ سے ان کے احکام بدل گئے، حقوق الگ ہوگئے۔

بہرحال دنیا کی اشیاء کی ہمہ ہمی اور رنگا رنگی میں ہی ان کے وجود کا راز پنہاں ہے، کوئی دیوانہ بھی یہ نہیں چاہے گا کہ رات اور دن ایک ہوجائیں، نور وظلمت میں کوئی امتیاز باقی نہ رہے، سارا عالم ایک ہی شکل اور ایک ہی رنگ میں ہو، ایک ہی حجم میں اور سب سب نہ ہوں؛ بلکہ وہ سب ایک ہوں، جو انسان ہو وہی گدھا ہو، اور جو گدھا ہو وہی شیر اور بکری بھی ہو، آم کے درخت کو ببول بھی کہا جائے اور ببول کو گلاب ویاسمین بھی پکارا جائے، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک اور یکتائی کے سوا دوسرے اور دوئی کا پتہ بھی نہ ہوگا، گویا سب کچھ ہونے کے باوجود کچھ نہ ہوگا، پھر اس طرح اس عالم کا وجود بیکار ٹھہرے گا۔

اختلاط والتباس یہ کائنات کے وجود کو باطل کردیتا ہے، اس کے بالمقابل امتیاز اور فصل ہی ہر چیز کے وجود کو نمایاں کرتا ہے۔

ٹھیک اسی طرح انسانیت میں تکوینی خصوصیات کے اس اتحاد کے باوجود کچھ معنوی خصائص اور باطنی امتیازات بھی ہیں جن کی وجہ سے انسان کی جسمانی صورتوں کے اتحاد کے باوجود ان کی معنوی صورتیں علاحدہ کردی ہیں۔

اسی طرح انسانوں میں بے شمار معنوی جتھے وجود میں آگئے، مسلم قوم، آرین قوم،

ہندوقوم،عیسائی اور یہودی اقوام، یہ تمام قومیں ایک ماں باپ کی اولاد ہونے کے باوجود مختلف اور متفاوت ہوگئیں، ان اقوام کے مابین اخلاق وعادات مختلف، ان کا تمدن وتہذیب مختلف، ان کے جذبات واحساسات مختلف، اگر ہم آج ایشائی قوموں کو یورپین اقوام سے مختلف کہتے ہیں تو اس وجہ سے کہ جو خصوصیات تمدن ومعاشرت اور جذبات واحساسات ایک قوم کے ہیں ان کا دوسرے میں وجود نہیں، انہی معنوی اور روحانی خصوصیات کا نام دین اور مذھب ہے، جس طرح مادیات میں حیوانیت، نباتیت اور جمادیت کے ظہور کے لئے مخصوص شکلوں اور صورتوں کی ضرورت ہے، اسی طرح معنوی طور پر مختلف اقوام میں شرعی اور مذہبی حقائق کے اظہار کے لئے مخصوص ہیئتوں اور ممتاز شکلوں کی ضرورت ہے۔

بہرحال اسلام جیسے ہمہ گیر اور وسیع مذہب کی بھی اپنے عقائد وتصدیقات، اعمال وعبادات، معاملات وسیاسیات، آداب ومعاشرت، سلوک، حالات ومقامات کے اعتبار سے ایک خاص شکل وصورت ہے، نماز، روزہ، حج، زکوۃ، اسی طرح محاسنِ اخلاق، سخاوت وشجاعت، حلم وایثار، معاملات، بیع وشراء، اور معاشرت، لباس، رہن سہن آپس کے حقوق متعین ہیں، اسلام اس مجموعی ہیئت اور صورت کا نام ہے۔

اس لئے اسلام یہ چاہتا ہے کہ علوم وفنون کے سلسلے میں ہمارا اپنا طریقۂ کار اور ہماری اپنی ایجاد اور اختراع ہو، ہم اس بارے میں بھی اپنے امتیاز باقی رکھیں، غیروں پر تکیہ کئے نہ رہیں۔

☆ نبیِ کریم ﷺ نے فرمایا:

"لا تستضئوا بنار أهل الشرك" (مشرکین کی آگ سے روشنی حاصل نہ کرو) حضرت حسن بصریؒ نے اس کی تفسیر یوں کی ہے "لا تستشيروا المشركين في شيئ من أموركم" یعنی مشرکین سے اپنے امور میں مشورہ نہ لیا کرو، اور پھر مطلب یہ ہے کہ ان سے علم حاصل نہ کیا کرو، یعنی علوم وفنون کے سلسلے میں ان پر اعتماد اور تکیہ

کرنا درست نہیں''(۱)

☆ ایک موقع سے نبی اکرم ﷺ اپنے دستِ مبارک میں عربی کمان لئے ہوئے تھے کہ آپ نے کسی کے ہاتھ میں فارسی کمان دیکھی تو ناخوشی سے فرمایا کہ: یہ کیا لئے ہو؟ اسے پھینک دو اور عربی کمان رکھو جس کے ذریعہ خدا نے تمہیں قوت وشوکت دی اور بلادِ ارض کو مفتوح کیا۔(۲)

چونکہ فارسی کمان کا بدل عربی کمان موجود تھی اسلئے غیرت دلا کر حضور اکرم ﷺ نے روک دیا، تاکہ غیر اقوام کے ساتھ ہر ممکن سے ممکن امتیاز پیدا ہو جائے اور چھوٹے سے چھوٹا اشتراک بھی منقطع ہو کر ایک مسلم اپنی ہی ہستی کے ساتھ نمایاں ہو، ہاں غیروں کی نئی نئی ایجادات، جدید اسلحہ وغیرہ استعمال بھی کئے جائیں، اگر ان کا بدل ہمارے یہاں موجود نہ ہو، تو بغیر مشابہت کی نیتِ کے استعمال کئے جائیں، اور اسی طرح کی جدید ٹکنالوجی، قوت حرب وسامان خود اپنے ملک میں پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

☆ ایک دفعہ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ: میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: میں نے اپنے یہاں ایک نصرانی کاتب ملازم رکھا ہوا ہے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مجھے کیا ہوا خدا تجھے غارت کرے کیا تو نے اللہ کا یہ حکم نہیں سنا کہ یہود ونصاریٰ کو دوست مت بناؤ؛ کیونکہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں "لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارىٰ أولياء، بعضهم أولياء بعض" کیوں نہ تو نے کسی مسلمان کو ملازم رکھا۔ ابوموسیٰ کہتے ہیں کہ: اے امیر المؤمنین! میرے لئے اس کی کتابت ہے اور اس کے لئے اس کا دین ہے (مجھے اس کے دین سے کیا تعلق؟) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں ان کی تکریم نہیں کروں گا جن کی اللہ نے توہین کی اور میں ان کو عزت نہ دوں گا جن کو اللہ نے ذلیل کیا اور میں انہیں مقرب نہ بناؤں گا جن کو اللہ نے دور کیا۔ (اقتضاء الصراط المستقیم)

---

(۱) شعب الایمان: حدیث: ۹۳۷۵ (۲) تجلیاتِ حکیم الاسلام: ۱۳۲، مطبوعہ فرید بک ڈپو

حضرت حکیم الاسلام قاری طیب صاحبؒ اس مکالمہ کی وضاحت نکات کی شکل میں یوں فرماتے ہیں:

۱۔ جب تک کوئی مضطرارانہ ضرورت داعی نہ ہو اصل یہی ہے کہ غیر مسلمین سے استغاثہ اور وہ بھی ایسے کہ اس میں ان کی تکریم ہوتی ہو، قرین عقل و دین نہیں۔

۲۔ یہ عذر کسی طرح قابل سماعت نہیں کہ ہمیں صرف خدمت درکار ہے، نہ کہ ان کا مذہب؛ کیونکہ اس تحصیلِ خدمات کے ذیل میں ان کے ساتھ معیت اس شدت اور تغلیظ کو کم یا محو کر دے گی، جو ایک مسلمان کا اسلامی شعار بتلایا گیا ہے۔

۳۔ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ اور ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے بعد کوئی شخص ان جیسا تدیّن نہیں لا سکتا، لیکن اگر بالفرض لے بھی آئے تو کوئی وجہ نہیں کہ ابوموسی رضی اللہ عنہ تو کفار کی خدمات حاصل کرنے سے روک دیئے جائیں اور اسے نہ روکا جائے۔

۴۔ جس مخلوق کی اس کے خالق نے تکریم نہ کی ہو اور ان کے لئے عزت کا کوئی شمہ گوارا نہیں کیا ہو، اس خالق کے پرستاروں کی غیرت وحمیت کے خلاف ہے کہ وہ علوم وفنون میں ان سے استفادہ کے ذریعہ اس کے دشمنوں کی تکریم کریں، وہ جسے پھٹکارے یہ اسے پیار کریں۔(۱)

☆ نعلِ سندی مجوسیوں کا مخصوص جوتا تھا، مروزی کہتے ہیں کہ: میں نے نعلِ سندی کے متعلق امام احمد بن حنبلؒ سے سوال کیا کہ ان کا پہننا کیسا ہے؟ تو فرمایا: ”امّا أنا فلا استعملها لکن اذ کان للکنیف أو الوضوء“ لیکن سو میں تو استعمال نہ کروں گا، البتہ جب کہ کیچڑ گارے کے لئے یا بیت الخلاء کے لئے (ایک روایت میں) اگر بیت الخلاء یا وضو کے لئے تو مناسب ہے اور جو زینت کا ارادہ نہیں، اور فرمایا: کہ عجمیوں کی ہیئت ہے، علامہ تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ: گویا امام احمدؒ نے گلی کوچوں میں انہیں پہن کر چلنے کو مکروہ نہیں سمجھا ہے۔

☆ امام ابن مبارکؒ سے نعلِ کرمانی (کرمانی جوتا) کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے

---

(۱) تجلیاتِ حکم الاسلام: ۵/۹۷، فرید بک ڈپو

اسے ناپسند فرمایا اور کہا کہ یہ (اسلامی جوتا) اس کے مقابلے میں تمہیں کافی ہے۔

☆ حضرت مولانا عبد القادر رائے پوریؒ اس پر بڑا افسوس اور قلق کا اظہار کیا کرتے تھے کہ مسلمان ممالک صنعت وحرفت اور اپنی ضرورت کو اپنے ملک میں ہی پیدا کرنے کی طرف توجہ نہیں کرتے، اور ان کی زیادہ تر دولت باہر سے ضروریاتِ زندگی کے درآمد کرنے پر صرف ہوتی ہے، حضرت مولانا ابوالحسن ندویؒ فرماتے ہیں کہ شعبان ۱۳۸۱ھ جنوری ۱۹۶۲ء میں راقم نے اپنے چند رفقاء کے ساتھ کویت وقطر کا سفر کیا، جب اجازت اور رخصت کے لئے رائے پور حاضر ہوا تو بڑی عنایت اور محبت سے رخصت فرمایا: چلتے وقت خصوصیت سے فرمایا: ''ان بھلے مانسوں سے کہنا کہ اپنی دولت کا صحیح استعمال کریں، کارخانے بنائیں اور صنعتوں کو رواج دیں'' (۱)

حضرت اسلامی ممالک کے لئے مادی ترقی، نئے علوم کا اکتساب، جدید صنعتیں، سائنس میں ترقی، مالی استحکام اور خود کفالتی کو بہت ضروری سمجھتے تھے، ایک مرتبہ فرمایا:

''نیک نیتی سے ملک کی طاقت پیدا کرنے کی جو کوشش کی جائے سب دین ہی ہے "وَأَعِدُّوا لَهُم مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ" اگر ریا یا نیتِ فاسد سے نماز بھی پڑھی جائے تو بھی قبول نہیں ہوتی اور رد ہے، اور اگر نیتِ صالح سے پڑھی جائے تو وہ عبادت ہے، اسی طرح نیتِ صالح سے حکومت کی ترقی کا جو بھی کام کیا جائے سارا کا سارا دین ہی ہے، ایسا نہ ہو کہ ''تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود'' (تریاق کے عراق سے آنے تک سانپ کا کاٹا مرجائے) افراد کی اصلاح بھی ضروری ہے، لیکن ملک کی حفاظت بھی ضروری ہے''۔

اور ایک موقع سے فرمایا:

''اسلامی نظام خالی باتوں سے نہیں قائم ہوسکتا، اگر دنیا کے بڑے بڑے

(۱) سوانح حضرت مولانا عبد القادر رائے پوریؒ: از مولانا ابوالحسن علی الندوی: ۲۸۰، مکتبۃ الاسلام، گوئن روڈ لکھنؤ

ملکوں کے دوش بدوش کھڑا ہونا ہے تو ان لوگوں کے علوم وفنون سیکھنے ہوں گے، مگر مشکل یہ ہے ان کے علوم کو سیکھتے سیکھتے اپنے دین و مذہب کو خیر باد کہہ دیتے ہیں، جب تک کوئی ملک اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو تو اِس زمانہ میں دین و دنیا کا کوئی کام نہیں کرسکتا''۔(۱)

حضرت مولانا ابوالحسن ندوی اپنے مشہور زمانہ کتاب ''مسلمانوں کا عروج وزوال'' کتاب میں مادی اسباب کی تیاری کی اہمیت وافادیت کو بتلاتے ہوئے فرماتے ہیں:

عالم اسلام کا کام یہیں ختم نہیں ہوجاتا، اگر اس کو اسلام کے پیغام کی اشاعت کی خواہش ہے اور وہ دنیا کی قیادت ورہنمائی کا فرض انجام دینا چاہتا ہے تو اس کو اس کے لئے ممتاز قوت اور تربیت، صنعت وعلوم، تجارت اور فن حرب میں مکمل کی ضرورت ہوگی، اس کو زندگی کے ہر شعبہ اور اپنی ہر ضرورت میں مغرب سے مستغنی اور بے نیاز ہونا پڑے گا، وہ اس سطح پر ہو کہ اپنے لئے پہننے اور کھانے کا سامان کرسکے، اپنے لئے ہتھیار تیار کرسکے، اپنی زندگی کے معاملات کا انتظام اس کے ہاتھ میں ہو، اپنی زمین کے خزانے وہ خود برآمد کرسکے اور اس سے فائدہ اٹھاسکے اپنی حکومتوں کو اپنی دولت اور اپنے آدمیوں کے ذریعہ چلائے، اس کے چاروں طرف پھیلے ہوئے سمندروں میں بحری بیڑے اور جہاز شور کر رہے ہوں، وہ دشمن کا مقابلہ اپنے یہاں کے جنگی جہازوں، توپوں اور ہتھیارں سے کریں، اس کی برآمد اس کے درآمد سے زیادہ ہو اور اس کو مغربی ممالک سے قرض لینے کی ضرورت پیش نہ آئے، اس کو اس کے کسی جھنڈے کے نیچے نہ آنا پڑے اور وہ کسی کیمپ میں شامل ہونے پر مجبور نہ ہو۔

جب تک عالم اسلام علم وسیاست، صنعت وحرفت وتجارت میں مغرب

---

(۱) سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ، از مولانا ابوالحسن علی الندویؒ: ۲۷۹

کا محتاج رہے گا، مغرب اس کا خون چوستا رہے گا، اسی کی زمین کا آبِ حیات نکالے گا، اسکا سامانِ تجارت اور مصنوعات ہر روز اس کی منڈیوں، بازاروں اور جیبوں پر چھاپہ مارا کریں گے اور اس کی ہر چیز پر ہاتھ صاف کرتی رہیں گی، جب تک عالم اسلامی مغرب سے قرض لیتا رہے گا اور اپنی حکومت کا انتظام کرنے، اہم کلیدی عہدوں کو پُر کرنے، اپنی فوج کو ٹریننگ دینے کے لئے مغرب کے آدمیوں کا رہین منت رہے گا، وہاں کا سامان تجارت وصنعت منگائے گا اور اس کو اپنا اتالیق اور استاذ، مربی اور سرپرست، حاکم اور سردار سمجھے گا، اس کے حکم اور اس کی رائے کے بغیر کوئی کام نہیں کرے گا، اس وقت تک وہ مغرب سے مقابلہ کرنا تو درکنار اس سے آنکھیں بھی نہیں ملا سکتا۔

یہ علمی وصنعتی زندگی کا وہ شعبہ تھا جس کے بارہ میں عالم اسلامی نے عہدِ ماضی میں کوتاہی سے کام لیا اور جس کی تعزیر اس کو طویل اور ذلیل زندگی کا مزہ چکھنا پڑا اور اس پر مغربی قیادت اور سرداری مسلط کی گئی، جس نے دنیا میں تباہی وغارت گری، قتل وخوں ریزی اور خودکشی برپا کی، اب اگر اس موقع پر بھی عالم اسلامی نے علمی وصنعتی تیاری اور اپنی زندگی کے معاملات میں آزادی کے بارہ میں غفلت برتی اور اس مرتبہ بھی اس سے یہ چوک ہوگئی تو دنیا کی تقدیر میں بدنصیبی اور شقاوت لکھ دی جائے گی اور انسانیت کے ابتلاء کی مدت اور طویل ہوجائے گی''(۱)

حضرت مولانا محمد یوسف بنوری صاحب شیخ الحدیث مدرسہ عربیہ نیوٹاؤن کراچی ماہنامہ ''البینات'' کے اداریہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''عالمِ اسلام بالخصوص عرب کے صحراؤں میں قدرتی وسائل، خام ذخائر اور مال ودولت کی کمی نہیں، بلکہ فراوانی ہے، مگر یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ ان کے

(۱) انسانی دنیا میں مسلمانوں کے عروف وزوال اثر:۳۵۱، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنو

مال و دولت کا بڑا حصہ یا تو غیر ملکی بینکوں میں جمع ہونے کی وجہ سے دشمنانِ اسلام کے کام آتا ہے، بادشاہ خرچی، عیش پرستی، عافیت کوشی اور آسائش پسندی کے لئے ضائع کیا جاتا ہے، لیکن فوجی استحکام، عسکری تربیت اور اسلحہ سازی تقریباً صفر ہے، دشمنانِ اسلام جگہ جگہ ہوائی اڈے، بحری بیڑے، فوجی چھاؤنیاں اور اسلحہ سازی کے بڑے بڑے کارخانے قائم کررہے ہیں؛ مگر مسلمان خدافراموشی کے ساتھ ظاہری تدبیر سے بھی مجرمانہ غفلت میں مست ہیں''۔

عصری علوم میں غیروں کے محتاج نہ بنیں

موجودہ عصری تعلیم کا جو نظام اس وقت ہم پر لادا گیا ہے، اس کا بانی لارڈ میکالے تھا اور اس نے اپنی جو تاریخی یادداشت ۱۸۴۲ء میں مقبوضہ ہندوستان کے گورنر جنرل کو پیش کی تھی، بلکہ ڈھٹائی سے کھول کھول کر بیان کردیا تھا، اس کا سب سے بڑا مشن یہ تھا کہ ہندوستان کے باشندوں بالخصوص مسلمانوں کو اپنے سارے تہذیبی ورثے کے بارے میں شدید احساسِ کمتری کا شکار بنا کر ان کے دلوں پر مغرب کی ہمہ گیر بالادستی کا سکہ بٹھادیا جائے اور نئی نسل کو ہر ممکن طریقہ سے یہ یقین کرلینے پر مجبور کیا جائے کہ اگر دنیا میں ترقی اور سربلندی چاہتے ہو تو اپنی فکر اپنے فلسفے، اپنی تہذیب، اپنی معاشرت اور اپنے سارے ماضی پر ایک حقارت بھری نظر ڈال کر مغرب کے پیچھے پیچھے چلے آؤ اور اپنی زندگی کا ہر راستہ اسی کے نقوشِ قدم میں تلاش کرو، گویا اس تعلیمی نظام کی ساری مشینری سر سے لے کر پاؤں تک وہی ہے جو میکالے نے سرکاری ملازم یا زیادہ صحیح لفظوں میں اپنے ذہنی غلام پیدا کرنے کے لئے بنائی تھی۔

انگریزی اقتدار کے عہد میں ہم پر جو نظام مسلط کیا گیا تھا اس میں دوسری خرابیوں کے علاوہ ایک بنیادی خرابی یہ تھی کہ اس میں اسلام کو زندگی کے تمام شعبوں سے کاٹ کر عبادتوں اور نجی زندگی کے چند معاملات تک محدود کردیا تھا، یہ بات محتاجِ بیاں نہیں ہے کہ اسلام زندگی کا ایک مکمل نظام ہے اور وہ حکومت سے سیاست سے لے کر تجارت و معیشت

تک زندگی کے ہر شعبے کے لئے اپنی مخصوص تعلیمات اور ہدایات رکھتا ہے؛ لہٰذا جس وقت دنیا میں یہ دین عملاً نافذ تھا، اس وقت نظامِ تعلیم کا حال بھی یہ تھا کہ اسلام کی تعلیم صرف اسلامیات کے مضمون کی حد تک محدود نہ تھی، بلکہ ہر علم وفن کی تعلیم میں اسلام رچا بسا نظر آتا تھا، طالب علم فلسفہ پڑھ رہا ہو یا منطق، سائنس کی تعلیم حاصل کر رہا ہو یا حساب اور ریاضی کی، طب کی تعلیم میں مشغول ہو یا صنعت وحرفت کی تعلیم میں، غرض ہر علم وفن کی تعلیم کے رگ وریشہ میں اسے اسلامی نظریات اور مفکرین اسلام کے افکار یا کم ازکم اسلامی طرزِ فکر سمایا ہوا ملتا تھا، اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ علم وفن کے خواہ کسی گوشے کو اپنی زندگی کا محور بنالے، وہ ذہنی اور عملی طور پر سچا اور پکا مسلمان ہوتا تھا، اس کے دل ودماغ میں اسلام کے مقابلے میں دوسرے افکار سے مرعوبیت پیدا ہو ہی نہیں سکتی تھی، یہ نظامِ تعلیم اس میں اتنی صلاحیت پیدا کر دیتا تھا کہ وہ ہر نئی تحقیق اور نئے فلسفے سے اس کے صالح اجزاء کو اپنالے اور غیر صالح کو چھوڑ دے۔

اس لئے موجودہ عصری تعلیمی نظام کو بجائے اس کے یہ غیروں کا نصاب ہم پر مسلط رہے، اس نظام کو بھی بدلنے کی ضرورت ہے، اسلئے کہ موجودہ نظامِ تعلیم میں اسلام کی اس ہمہ گیر حیثیت کو سرے سے ختم کر دیا گیا ہے، اسلام کو صرف ''اسلامیات'' کے ایک گھنٹے تک محدود کر دیا گیا ہے، اور اس ایک گھنٹے میں بھی نصاب اور طرزِ تعلیم کے معیار کو اس قدر پست کر دیا گیا ہے کہ اس سے اسلام کی صحیح تعلیم کا ہزارواں حصہ بھی طالب علم کے سامنے نہیں آسکتا۔

یہ بات چند مثالوں سے واضح ہو سکے گی:

☆ آج کل ہمارے کالجوں اور یونیورسیٹیوں میں جو فلسفہ پڑھایا جا رہا ہے اس میں یونانی یا نو افلاطونی فلاسفے کے بعد طالب علم سیدھا یورپ کے نشأۃ ثانیہ کے بعد کے فلسفے تک پہنچ جاتا ہے، اور اس کے ذہن پر یہ تاثر قائم ہو جاتا ہے کہ نو افلاطونی فلاسفر سے کر ڈیکارٹ تک پورا زمانہ فکر اور فلسفے میں جمود کا زمانہ ہے، علم وفن کی تاریخ میں بھی اس زمانہ کو تاریک زمانہ سے تعبیر کیا جاتا ہے؛ حالانکہ یہ دور صرف

غیر مسلم یورپ کے لئے تاریک تھا، ورنہ یہی وہ دور ہے جس میں مسلمانوں نے آدھی سے زائد دنیا میں علم وفن کے چراغ روشن کیے ہوئے تھے، اور خود یورپ کا خطہ اندلس ان کی روشنی سے جگمگا رہا تھا، اس دور میں مسلمان فلاسفہ اور متکلمین نے فکر اور فلسفہ کے میدان میں جو نئی راہیں کھولی ہیں اور اپنی تحقیقات کا جو بیش بہا ذخیرہ چھوڑا ہے، موجودہ نظامِ تعلیم میں سرے سے ان کا کوئی ذکر ہی نہیں ملتا۔

جدید اسلامی نظام میں یہ ضروری ہے کہ اس وسیع علمی خلا کو پر کیا جائے جو مغرب کی تنگ نظری اور تعصب نے مصنوعی طور پر پیدا کیا ہے، اور فلسفے کی تعلیم میں مسلمان فلاسفر اور متکلمین کے افکار کو ان کا صحیح مقام عطا کیا جائے۔

☆ سائنس کے بارے میں یہ حقیقت آج پوری دنیا میں مان لی گئی ہے کہ سائنس کی موجودہ ترقی میں اس استقرائی طریقہ جس میں صرف قیاس وتخمین کے بجائے مشاہدہ اور تجربہ کے ذریعہ تحقیقات کی جاتی ہیں، لیکن ساتھ ہی مغربی نظامِ تعلیم نے ہر کس وناکس کے ذہن پر یہ تاثر قائم کرا دیا ہے کہ استقرائی طریقہ، استدلال کی بنیاد پر مسلمانوں نے ڈالی تھی، انہوں نے ہی سائنس کا رخ موڑ کر اسے اس راستہ پر ڈالا تھا جس پر آج وہ برق رفتاری کے ساتھ دوڑ رہی ہے، اس کے باوجود ہمارا سائنس کا طالب علم خالد بن یزید، زکریا رازی، ابن سینا، خوارزمی، ابوریحان، بیرونی، فارابی، ابن مسکویہ، ابن رشد، کندی، جابر بن حیان اور موسیٰ بن شاکر جیسے عظیم سائنس دانوں سے یکسر ناواقف ہے۔

☆ معاشیات کی تعلیم میں طالب علم آج صرف یہ جانتا ہے کہ بنیادی طور پر معاشیات کے دو مکتبِ فکر ہیں، سرمایہ داری اور اشتراکیت، اسلام کے معاشی اصول اور قوانین اس کی نگاہوں سے بالکل اوجھل رہتے ہیں، اور اس کو یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اسلام نے بھی معیشت کے بارے میں ایسا نظام بنایا ہے جو مذکورہ دونوں مکاتبِ فکر سے الگ ہے، اسی طرح اس کو یہ پڑھایا جاتا ہے کہ علمِ معاشیات کی بنیاد آدم اسمتھ نے رکھی تھی، اور اس سے بہت پہلے کے تمام فقہاء سے لے کر ابن

خلدونؒ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جیسے مفکرین نے علم معاش کی جو خدمات انجام دی ہیں، ان کو فہرست سے یکسر خارج کر دیا گیا ہے۔

☆ علم سیاست میں بھی نو افلاطونی فلاسفر اور جدید مغربی فلسفہ کے درمیان ایک وسیع خلاء ہے جو صرف مغرب کے تعصب اور تنگ نظری کی پیداوار ہے، سیاست کے بارے میں اسلام کے اصول و تعلیمات اور مسلمان مفکرین کی کاوشوں کا کوئی ادنیٰ سا عکس بھی موجودہ نصاب میں نہیں ملتا۔

☆ یہی حال عمرانیات کا بھی ہے، شاید ہی کوئی منصف مزاج اس بات سے انکار کر سکے کہ اس علم کے مدون اول ابن خلدون ہیں؛ لیکن عمرانیات کے موجودہ نصاب سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اسلام یا مسلمانوں نے بھی اس علم پر کوئی کام کیا ہے۔

☆ نفسیات کی تعلیم اب بڑے پیمانے پر ہونے لگی ہے؛ لیکن اس سلسلے میں مسلمانوں کے علماءِ تصوف نے جو نئی نئی راہیں اور نفسِ انسانی کے عوارض پر مفید ترین بحثیں کی ہیں، موجودہ نظامِ تعلیم میں اس کی کوئی پرچھائیں بھی موجود نہیں ہیں۔

☆ قانون اور اصولِ قانون کے بارے میں بھی ہمارا نصابِ تعلیم سراسر مغربی افکار و نظریات ہی سے بھرا ہوا ہے، اصول قانون کی دقیق بحثوں کو جس بے نظیر انداز میں فقہائے اسلام نے اصولِ فقہ میں مدون کیا ہے اس سے استفادہ کا کوئی موقع طالب علم کو نہیں ملتا۔

☆ اسی طرح بعض علوم میں خالص اسلامی احکام کے اجزاء کی ضرورت ہے، مثلاً حساب میں سود اور سود در سود کے مسائل تو باقاعدہ پڑھائے جاتے ہیں، لیکن میراث اور زکوۃ نکالنے کے طریقوں سے طالب علم ناواقف رہتا ہے، اسی طرح جغرافیہ کی تعلیم میں سمت، قبلہ، اوقاتِ نماز اور مواقیتِ احرام معلوم کرنے کا طریقے اس کی نظر سے نہیں گذرتے، نصاب کی نئی تدوین میں اس قسم کی چیزیں شامل ہونی چاہیئے، غرض وہ علوم جنہیں آج جدید علوم یا مغربی علوم کا نام دیا گیا ہے، ہمارے نظامِ تعلیم میں ٹھیک اسی ترتیب اور اسی ڈھانچے کے ساتھ لئے گئے

ہیں جو مغرب نے اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ تعصب برتتے ہوئے اسلام کا نام لئے بغیر بنایا تھا، اب اگر اپنے نظامِ تعلیم کو اسلامی بنانا اور اس کے ذریعہ صحیح اسلامی قومی شعور پیدا کرنا مقصود ہے تو یہ بات خواہ کتنی منت طلب کیوں نہ ہو، لیکن ناگزیر اہمیت رکھتی ہے کہ ان علوم کے سلیبس کو اپنے قومی تقاضوں کے تحت اس طرح مرتب ومدوّن کیا جائے کہ اس میں اسلام اور مسلمانوں کے افکار اور کارنامے پوری طرح رچے بسے ہوں (نمونہ کے طور پر ڈاکٹر حمید اللہ صاحبؒ کی کتاب ''قانون بین الممالک'' ملاحظہ ہو جس میں بین الاقوامی قانون کو اس طرح مدون کیا گیا ہے)۔(۱)

خلاصہ یہ ہے کہ:

(۱) مسلمان قوم کی ترقی دین دار مسلمان، ڈاکٹر، انجینیئر، سائنسداں سے ہے نہ کہ ملحد، غلامانہ ذہنیت والے افراد اور حقیقت یہ ہے کہ دوسری قسم ہی ہمیشہ نفاذِ شریعت میں رکاوٹ بنی، اور اعداء اسلام کا آلہ کار ہوئی ہے

(۲) دینی ضروری علم پر عصری علوم کو اتنی اہمیت نہ دی جائے کہ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ اسلام کے تئیں احساسِ برتری، دینی تشخص کی حفاظت، داعیانہ کردار سے یکسر خالی ہو جائے، اہل علم اور اہل اللہ کی صحبتوں سے اسے مربوط کیا جائے۔

(۳) نصاب ونظام میں جرأت مندانہ اور انقلابی قسم کی تبدیلی پیدا کرنا نہایت ضروری ہے، یہ کام وہ ادارے بخوبی انجام دے سکتے ہیں جسے خود مسلمان چلا رہے ہیں۔

(۴) اللہ کی مدد کے بغیر کوئی کام نہ ہوا اور نہ ہوسکتا ہے اور نہ ہو رہا ہے، نصرت الٰہی، ایمانی صفات سے متوجہ ہوتی ہے، ایمانی صفات سے خالی نظام بھی انسانیت اور مسلمانوں کے لئے بھلائی کا ذریعہ نہیں ہوسکتا، غلبہ کا فیصلہ نہیں کرا سکتا، اقوام عالم پر تفوق نہیں دلا سکتا۔

(۵) تعلیم کو محض برائے امتحانات، برائے تجارت، برائے دولت نہ چلایا جائے؛ بلکہ

(۱) ہمارا تعلیمی نظام: ۱۷-۲۰

برائے خدمت کا تصور پرورش کرنے کی بہت ضرورت ہے۔

اگر عصری علوم کی دینی علوم سے زیادہ اہمیت ہوتی تو رسول اللہ ﷺ نے کبھی تو صحابہ کو موجودہ زمانے میں جن خبیث اعمال کو فنون لطیفہ کہا جاتا ہے، اس کے سیکھنے کے لئے بھیجا ہوتا، کیا وجہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے نہایت متمدّن اقوام کے سامنے داعیانہ اور قائدانہ احساسِ برتری کے ساتھ دینے والا ہاتھ لے جارہے ہیں، نہ کہ لینے والا، اگرچہ رسول اللہ ﷺ نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو سریانی زبان سیکھنے کا حکم دیا تھا؛ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ یہ دینی مزاج کے پختگی کے بعد تھا، صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین جب فارسی مما لک میں گئے تو زبان سیکھنے سے پہلے اہل زبان پر اتنے مؤثر ثابت ہوئے کہ فارسی زبان کے رگ و پے میں اسلامی خون دوڑادیا، یہ بات صحیح ہے کہ اسلام ہر علم نافع کی ہمت افزائی کرتا ہے؛ لیکن علم نافع میں فرض عین وفرض کفایہ کی تفریق بہت ضروری ہے، لیکن ایسا نہ ہو کہ فرض کفایہ کی ادائیگی کی فکر میں اور امت کو آنکھ، ناک کا ڈاکٹر دینے کے جذبہ میں خود کی اذکار نماز درست نہ ہو، فرائض اسلام سے دوری ہو یہ بہت تکلیف دہ اور غیر معتدل صورت حال ہے کہ عصری علوم کی اہمیت پر بولنے اور لکھنے والے نافع اور غیر نافع کی تقسیم پر چھوڑ دیتے ہیں، جس کی وجہ سے قرآن وحدیث والے علم کی تحقیر محسوس ہوتی ہے۔

لڑکیوں کے لئے عصری تعلیم

خدا کے بندوں کو دیئے گئے زندگی گذارنے کے نورانی طریقے میں مرد وزن میں فرق مسلم ہے، ان کی ذمہ داریاں اور ان کا دائرہ کار مکمل واضح ہے، اسلام ہی دین فطرت ہے اور اسلام ہی مرد وعورت کی جسمانی ساخت، جذبات کو اعتدال کے ساتھ پورا کرنے والا ہے، معاش کی ذمہ داری اسلامی نقطۂ نظر سے عورت پر عمومی حالات میں نہیں ہے، عورت کا اصل کام کامیاب بیوی، سلیقہ مند ماں، فرماں بردار بیٹی، پاک دامن بہن بننا ہے ن انسانی معاشرہ کو خدا ترس خادم دین وملت دینا ہے، اگر عورت اس فرض منصبی کو پورا کرتے ہوئے اور اس سے ہٹے بغیر کچھ ضروری عصری فنون کی طرف حدودِ شرع میں وقت دیتی ہے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

نسوانی ذمہ داریاں پورا کرنے کے لئے اللہ پر توکل ہو، قناعت، صبر، تواضع، حسنِ انتظام، تربیت کی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے، اگر عفت و پاک دامنی نہ ہوتو گھر کی چہار دیواری میں رہنا بوجھ محسوس ہوتا ہے، خاندانوں کو نبھانا طبیعت بالکل نہ چاہتی ہو ایسی عورتیں انسانی معاشرہ کو بکھیرنے کا ذریعہ بن سکتی ہیں، تعمیر وتشکیل کا سبب نہیں بن سکتیں، حالات حاضرہ میں عورت کو وہ حقیقی علم دیا ہی نہیں جارہا ہے جس سے وہ کسی ولی کی ماں بن جاتی، یا کسی عالم دین کو جنم دیتی، قوتِ دعا، انابت اِلی اللہ کا کچھ سرمایہ اس کے پاس ہوتا، وہ فاطمہ وعائشہ رضی اللہ عنہما کی حیاء کو اپنا نمونہ بناتیں، بشر حافی کی بہن یا حضرت ملفوسہ والی قناعت، رضا وتسلیم کا اسے کوئی حصہ مل جاتا، حضرت خنساء رضی اللہ عنہا، اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما جیسی جان فروشی اور اولاد کو اعلائے کلمۃ اللہ پر ابھارنے کے جذبات دیئے جاتے۔

اگر پندے ز درویشے بگیری
ہزار امت بہ میرد ، تو نہ میری
بتولے باش وپنہاں ازیں عصر
کہ در آغوش شبیرے بگیری

علامہ اقبالؔ کی نگاہ میں ایسی تعلیم سراسر موت ہے جس کی وجہ سے عورت اپنی نسوانیت کے جوہر کو کھودے اور ایک مسلمان ماں کی خوبیوں سے محروم ہوجائے اور اس کا دینی کردار ختم ہوجائے۔

تہذیب فرنگی ہے اگر مرگ اُمومت
ہے حضرت انسان کے لئے اس کا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نہ نازن
کہتے ہیں اس علم کو ارباب نظر موت

اس کے برخلاف علم کے نام پر پائی جانے والی جہالت سے بیٹیاں ماؤں پر جری ہوگئیں ہیں، علم بغیر دینی تربیت کے ناخواندہ باپ پر انہیں جری کردیا، مسلمان بہن کو اس جہالت کی ضرورت نہیں ہے، جہاں ڈگری کے ہاتھ میں آنے سے پہلے دامنِ عفت ہاتھ

سے چھوٹ جاتا ہو، ڈگریوں کے انبار کے ساتھ طلاق وخلع کا بازار بھی گرم ہو جاتا ہے، بچوں کی تربیت کو بوجھ سمجھا جارہا ہو، یہ تہذیب نہیں ہے، ایر ہوسٹس پچاس سو مسافروں کی خدمت بخوشی بجالائے اور ان کی ناز برداری کرے اور ایک شوہر کا تحمل ناقابل برداشت ہے، یہ اخلاقی اور عقلی دیوالیہ پن نہیں ہے تو اور کیا ہے، یا کسی کمپنی کا عورت کو منیجر بنا کر، یا پرنسپل ٹھہرا کر دسیوں معاملات کو درست کر رہی ہوں؛ لیکن اپنے خاندان کی ناہموار طبیعتوں کو نبھانے سے، ناموافق مزاجوں کو لے کر چلنے سے کنارہ کشی اختیار کر رہی ہوں، انانیت اس قدر بڑھ چکی ہو کہ اپنی ساس کے ساتھ کچھ نبھاؤ نہ کر سکے۔ عورتوں کو کالج کے ماحول میں جو تعلیم دی جارہی ہے، اس سے عورت کی نسوانیت تار تار ہورہی ہے۔

حج کے لئے جانے والا کوئی بدکاری کے ارادہ سے نہیں جاتا، تب بھی وہاں دوران طواف پردہ معاف نہیں، مسجد میں بھی آنے والیوں کو حکم تھا کہ لباس سادہ قسم کا ہو، خوشبو لگی ہوئی نہ ہو، مردوں سے پہلے مسجد سے نکل جائیں تو مسجد کے اندر کعبہ کے سائے میں بے محابا اختلاط خیر القرون میں درست نہیں تھا تو دورِ فتن میں کیسے درست ہوگا؟ وہ بھی بازاروں اور کالجوں میں۔

ہمیں یہ یقین کرنا ہے کہ مریم بنت عمران اور یحی بن زکریا علیہم السلام بھی تنہا جمع ہوں تو تیسرا شیطان ہوتا ہے (۱) اور بقول جنید بغدادیؒ اگر پڑھانے والا اللہ کا ولی حسن بصریؒ ہو اور پڑھنے والی رابعہ بصریہؒ ہو اور یہ دونوں تنہا بیت اللہ میں کلام اللہ پڑھیں تو تیسرا شیطان ہوتا ہے؛ لہٰذا ہمیں بہرصورت مخلوط تعلیم کو ختم کرنا ہے، اسٹاف میں بھی غیر محرموں سے اختلاط نہ ہونے پائے، چہرے، ہاتھوں، پیروں کی پردہ، ہمیں بطریقۂ ترغیب پورا اہتمام کرانا ہے، کھیل صرف تفریح طبع کے لئے اور بچوں کی نشو ونما کے لئے، لڑکے اور لڑکیوں کے مزاج کا لحاظ کر کے کھلانا ہے، جوان بچیاں نامحرم کوچ سے بے تکلف کراٹے، فٹ بال، ٹینس سیکھیں، پھر بھی دل پاک رہیں ہیں، نہیں ہوسکتا، بہت عجیب بات ہے کہ غیروں کے اسکول تو اپنے مذہبی مزاج کی دعوت دے رہے ہیں اور مسلمان

(۱) ذم الهوى لابن الجوزي : في ذكر تحريم الخلوة: ۱/۱۴۸

اپنے آسمانی مذہب کو حصولِ علم میں رکاوٹ سمجھتا ہے۔

اس کے متعلق علامہ اقبال نے کہا تھا:

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت
بیگانہ رہے دین سے اگر مدرسۂ نسواں
ہے عشق ومحبت کے لئے علم وہنر موت

اور ایک جگہ علامہ اقبال نے فرمایا تھا کہ

ہزار بار حکیموں نے اس کو سلجھایا
مگر یہ مسئلہ زن رہا وہیں کا وہیں
قصور زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں
گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ وپرویں
فساد کے ہے فرنگی معاشرت میں ظہور
کہ مرد سادہ ہے بیچارہ زن شناس نہیں

اگر کالج صرف لڑکیوں کے لئے مخصوص ہے تو پڑھانے والے غیر مسلم یا بے حیاء ہوں تو ضرور اپنے استاذ کے اوصاف سے غیر شعوری طور پر انجذاب کرتا ہی ہے، ٹنکی کا پانی ہی نلوں میں منتقل ہوتا ہے، استاذ طالب علم کی نگاہ میں مثالی شخصیت بن جاتا ہے، ان کی فیشن پرستی، خدا بیزاری، اخلاقی بے راہ روی، ان کے دلی رجحانات کا پرتو ہماری بہو، بیٹیوں پر پڑ کر رہے گا، صبح سے شام تک پانچ، دس، پندرہ، بیس، پچیس سال کی صحبت کیا ان میں اثر انداز نہیں ہوگی؟ ضرور ہوگی، اور ہو رہی ہے، بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ غیر مسلم لڑکیوں سے پردہ ایسا ہے جیسے کہ اجنبی مسلمان سے۔

خلاصہ یہ ہے کہ:

۱) عورت کو سب سے پہلے امور خانہ داری، حسن انتظام، حسن معاشرت، عبادت واطاعت والی مومنانی صفات سے آراستہ کرنا ہماری اولین ترجیح ہے۔

۲) کم سے کم جماعت سوم سے زیادہ سے زیادہ جماعت پنجم سے مخلوط تعلیم کا سد باب ہو جانا چاہیئے۔

۳) انتظامیہ میں، معلمین میں کوئی مرد نہیں جماعت پنجم میں پڑھانے والا نہ ہو؛ مگر یہ کہ پردہ کا پورا اہتمام ہو۔

۴) یہ بات خوب ذہن نشیں کر لینا چاہیئے کہ پردہ دینی یا عصری اعلیٰ تعلیم کے لئے مانع نہیں ہے، چنانچہ اسلام میں سینکڑوں نمونے احکامِ الٰہی کی مکمل پابندی کے ساتھ پیدا کر کے دکھائے ہیں، جس کا تذکرہ مختلف کتابوں میں ہے۔

۵) کوئی خاتون اگر ماہر امراضِ نسواں یا خواتینِ اسلام کو بالخصوص نفع پہنچانے والے کوئی فن کو سیکھ رہی ہے تب بھی اسے اصل اور اہم کام شوہر کی اطاعت، اولاد کی تربیت اور دینی گھرانے کی بنیاد ڈالنے کو ہی اپنا نصب العین اور مقصد بنانا چاہیئے۔

کوئی پوچھے حکیم یورپ سے
ہند و یونان ہیں جس کے حلقۂ بگوش
کیا یہی ہے معاشرۃ کا کمال
مرد بے کار زن تہی آغوش

عالمِ اسلام میں کرنے کا پہلا کام

حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ موجودہ انگریز اور یورپین قوموں کے نصاب تعلیم کے امت اسلامیہ میں رواج پا جانے کی وجہ سے مسلمانوں میں جو مختلف ذہنی کشمکش جاری ہے، اور مختلف نظریات کی حامل مسلمان نسل وجود میں آ رہی ہے، جو میدان کار میں آنے کے بعد مختلف طبقات کی شکل میں بٹ کر امت میں تفریق اور پھوٹ کا باعث بن رہی ہے، اس کی وجہ طرز تعلیم کو قرار دیتے ہوئے نصاب و نظام کی تبدیلی کی پرزور وکالت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''مغرب کی فکری و تہذیبی یلغار کے دور شروع ہونے اور اس کے مشرق کو اپنے ارادہ یا بلا ارادہ مغربی طرز تربیت، نظام تعلیم، دبستان فکر، زندگی

اور انسان کے مغربی تصور اور علوم وفنون کے مغربی زاویہ نگاہ میں یا زیادہ بہتر الفاظ میں اس کی گود میں اس طرح آجاتا ہے کہ وہ اس کے پورے نظام تعلیم یا مختصر الفاظ میں اس کے نظریۂ تعلیم کو ساری خرابیوں اور خامیوں کے باوجود جوں کا توں قبول کر لیتا ہے جو ایک ایسی سرزمین میں پیدا ہوا اور نافذ کیا گیا جس کے عقائد، بنیادی اصول، اخلاقی قدریں، اسلامی معاشرہ کی قدروں اور بنیادی ومسلمہ اصولوں سے ہر جگہ اور ہر سطح پر مختلف ہیں جن پر وہ پورا ایمان رکھتا ہے یا ان پر ایمان لانا، ان کے لئے جدوجہد کرنا ان کے لئے کچھ نہ کچھ قربانی دینا اپنے لئے ضروری سمجھتا ہے؛ بلکہ مغرب کی اخلاقی قدروں کی تردید اور ان کی بیخ کنی اور تحقیر ہی پر اس کی بنیاد ہے، ایسی حالت میں اس کی مثال بعینہ اس شخص کی سی ہوتی ہے جو آبِ حیات کے شوق میں زہر کا پیالہ پینا چاہے، یا کھاری اور نمکین پانی سے اپنی پیاس بجھانے کی کوشش کرے۔

انہوں نے اپنے تعلیمی منصوبوں اور علمی اداروں کی تشکیل میں بیرونی ملکوں کے تعلیمی مشیروں کو پورا اختیار دے رکھا ہے اور ان ملکوں سے صرف درسی کتابیں نہیں درآمد کر رہے ہیں، وہ ان ملکوں میں اپنے تعلیمی وفود بھیجتے ہیں؛ تاکہ وہ مغربی ماہرین تعلیم اور اساتذہ کی تربیت میں نشوونما حاصل کریں، پھر ان کو ممالک اسلامیہ کے تعلیمی منصوبوں اور پالیسیوں کی تشکیل وتربیت کی پوری آزادی بھی دیتے ہیں کہ جس طرح چاہیں ان کا نقشہ بنائیں اور ان کا جو رخ چاہیں متعین کریں۔

اس کے نتیجے میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جو اپنے عقائد وافکار اور اپنے اخلاق وسیرت سب میں ذہنی انتشار کا شکار ہے، فکر مغربی اور فکر اسلامی کے درمیان تذبذب کی حالت بھی بسا غنیمت تھی، لیکن اس نے اکثر اوقات اپنے ملک وملت اور اپنے معاشرہ کے سارے معتقدات

ومسلمات اور اصول واقدار سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔

تعلیم کی یکسانیت کی وجہ سے آج مغرب میں عوام اور قیادت یا جمہور اور حکومت میں کسی گہری اور وسیع نظریاتی، ذہنی وفکری خلیج کا سراغ نہیں ملتا، وہاں صرف ایک طرز اور ایک آئیڈیل اور ایک قسم کے اصول ونظریات اور مقاصد ونصب العین پائے جاتے ہیں، وہاں مختلف طبقات اور سوسائٹی کے افراد کے درمیان کسی قسم کی ذہنی اور نفسیانی رسہ کشی نہیں اور اسی وجہ سے یہ ممالک اندرونی سازشوں اور بغاوتوں سے محفوظ ہیں۔

مغرب کے بعد ان مشرقی ممالک کا نمبر آتا ہے جو مدت دراز سے اپنا کوئی عقیدہ نہیں رکھتے اور ان کو حقائق پر یقین نہیں جن کی ایمان بالغیب اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات وہدایات پر بنیاد ہے، ان کے پاس متعین آسمانی تعلیمات یا محفوظ آسمانی صحیفے بھی نہیں ہیں، وہ صرف ان قومی روایات اور جماعتی وشخصی مفادات کی حامل ہیں جن کو یہ تعلیمی نظام اور پروگرام چیلنج نہیں کرتے اور کسی جگہ ان دونوں کا کراس نہیں ہوتا، چنانچہ یہ ممالک بھی اسی طرح اس تضاد سے محفوظ ہیں جو مغربی نظام تعلیم پیدا کرتا ہے؛ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ انہوں نے اس نظام تعلیم سے صلح وصفائی کرلی ہے اور دونوں میں پوری مفاہمت پائی جاتی ہے، یا انہوں نے اپنے آپ کو ان تعلیمی وتربیتی نظریات کے مطابق ڈھال لیا ہے اور اسی لئے انقلابات اور سازشوں کا تناسب یہاں بہت کم اور تضاد بھی بہت کم یا اتنا کمزور ہے کہ قومی زندگی پر اس کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوتا، ملک سے غداری اور قومی خیانت کے واقعات شاذ ونادر ہی ہوتے ہیں اور یہاں بھی عوام اور رہنما طبقہ میں وہ وسیع خلیج حائل نہیں ہے جو ہمیں اسلامی ملکوں میں نظر آتی ہے، ان ممالک کے امراض اور ان کے عیوب دوسری نوع کے ہیں اور اس کے اسباب وعوامل بھی بالکل دوسرے ہیں

جن کا تعلق ان کی تاریخ، ان کے قومی مزاج، مخصوص عقائد دینی حاسہ کی کمزوری، شعور کی کمی اور نظام تعلیم وتربیت کے فساد سے ہے۔

جہاں تک اسلامی ممالک کا تعلق ہے، وہاں یہ کشمکش اور عجیب تضاد بڑے وسیع پیمانہ اور مختلف سطح پر پایا جاتا ہے، وہاں ایک طرف حکومت اور جمہور میں کشمکش ہے، دوسری طرف اعلیٰ تعلیم یافتہ اور کم پڑھے لکھے یا ناخواندہ لوگوں میں رسہ کشی ہے، تیسری طرف دیندار اور آزاد خیال اور ترقی پسند افراد دست وگریباں ہیں اور یہ سب نتیجہ ہے اس نظام تعلیم کا جو مغربی ملکوں سے درآمد کیا جارہا ہے یا مغربی ذہن اور نظام تعلیم کے خطوط پر خود ان ملکوں میں تیار کیا جارہا ہے اور اس کے نتیجہ میں ایک ایسی نسل پیدا ہورہی ہے جو ان عقائد اور حقائق کو پوری طرح ہضم اور قبول نہیں کرپاتی، جن پر اس کے معاشرہ اور اس امت کی بنیاد ہے، اس لئے کہ یہ نظامِ تعلیم جس طرح کے خیالات کی آبیاری اس کے دل ودماغ میں کرتا ہے وہ ان حقائق اور عقائد سے کھلے طور پر متصادم ہیں جو اس معاشرہ کے لئے ناگزیر ہیں، کبھی خارق عادت طریقہ پر یا کسی بیرونی اثر سے وہ اس کو قبول کرتی ہے تو لازما اس کے نتیجے میں یہ نظامِ تعلیم ضرور کمزور پڑتا اور دبتا ہے؛ لیکن بہت شاذ ونادر ہوتا ہے۔

جب یہ طبقہ اس نظام کے آغوش میں تربیت پاکر نکلتا ہے تو قوم کے عقیدہ، خیالات اور جذبات سے اس کی کشمکش شروع ہوجاتی ہے، اگر وہ قوی الارادہ ہوتا ہے تو وہ رجعت پسندی کے ملبہ کو (جیسا کہ اس طبقہ کے معین افراد یہ اصطلاح استعمال کرتے ہیں) راستہ سے ہٹا کر اپنی قوم وملک کو ماضی کے بارگراں سے رہائی بخشنا چاہتا ہے، اس موقع پر ایک ایسی طویل کشمکش برپا ہوتی ہے، جس پر ملت کی ساری توانائیاں اور صلاحیتیں بے دریغ خرچ ہوتی ہیں اور اندرونی خانہ جنگیوں کا ایسا

سلسلہ شروع ہوتا ہے، جو بیرونی جنگوں سے بڑھ جاتی ہے، یہ ان ممالک کا قصہ ہے جہاں ایسی قیادتیں برسر اقتدار تھیں جو انقلابی، قوم پرستانہ اور لادینی فلسفوں اور دعوتوں پر یقین رکھتی تھیں۔

اگر اس طبقہ کی قوت ارادی کمزور ہوتی ہے اور وہ طاقتور شخصیت سے محروم ہوتا ہے تو وہ احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کے اندر ان عقائد اور مقاصد کی طرف سے دلی نفرت پیدا ہو جاتی ہے، وہ آئے دن اس کے برخلاف سازشوں میں مصروف رہتا ہے، غیر ملکوں اور بیرونی طاقتوں سے ساز باز کر لیتا ہے اور عوام کے قومی جذبہ اور دباؤ اور علماء ودعوت دین کے علمبرداروں کے اثر ورسوخ سے پہلی فرصت میں چھٹکارا حاصل کر لینا چاہتا ہے، چنانچہ اس کے نتیجہ میں غداری کے واقعات بار بار پیش آتے ہیں اور یہ ممالک مستقل طور پر بے یقینی، خوف ودہشت، ذہنی انتشار اور شبہ وبے اعتمادی کی فضا میں رہتے ہیں۔

اس غیر فطری اور غیر ضروری صورت حال سے چھٹکارا پانے کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہے کہ اس پورے تعلیمی نظام کو یکسر تبدیل کر دیا جائے اور اس کو ختم کر کے نئے سرے سے ایک نیا نظامِ تعلیم تیار کیا جائے جو اس ملت اور امت کے قد وقامت پر راست آتا ہو اور اس کی دینی ودنیاوی ضروریات پورا کر سکتا ہو۔

یہ عالم اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ، اس کی سب سے اہم اور ناگزیر ضرورت، وقت کی آواز اور اسلامیانِ عالم کا سب سے بڑا فرض ہے۔

اس مسئلہ کا حل خواہ وہ کتنا ہی دشوار گذار نظر آ رہا ہو اور صبر آزما اور دقت طلب ہو، اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس نظامِ تعلیم کو از سرِ نو ڈھالا جائے اور اس کو امت مسلمہ کے عقائد، زندگی کے نصب العین، مقاصد اور ضروریات کے مطابق بنایا جائے اور اس کے تمام اجزاء سے مادیت،

خدا سے سرکشی، اخلاقی وروحانی قدروں سے بغاوت اور جسم وخواہشات کی پرستش کی روح اور اسپرٹ کو ختم کیا جائے اور اس کے بجائے تقوی، انابت الی اللہ، آخرت کی اہمیت اور فکر اور پوری انسانیت پر شفقت کی روح اس میں جاری کردی جائے، اس مقصد کے لئے زبان وادب سے لے کر فلسفہ اور علم النفس تک اور علوم عمرانیہ سے لے کر اقتصادیات ومعاشیات تک صرف ایک روح پیدا کرنی ہوگی، مغرب کے ذہنی غلبہ اور تسلط کا خاتمہ کرنا، اس کی قیادت وامامت کا انکار کرنا پڑے گا، اس کے علوم ونظریات پر علمی تحلیل وتجزیہ اور بے لاگ تنقید کا مسلسل اور جرأت مندانہ عمل کرنا ہوگا اور یہ ثابت کرنا ہوگا کہ مغرب کی کامیابیوں اور پیش قدمیوں نے انسانیت اور تہذیب کو کتنا بڑا نقصان پہنچایا ہے، اس راہ میں اگرچہ بہت سے سنگ گراں ہیں اور نتائج بھی بہت تاخیر سے ظاہر ہو سکتے ہیں؛ لیکن یہ تجدد پسندی، آزاد خیالی اور مغرب کی ذہنی غلامی کی اس طوفانی موج کو روکنے کا واحد طریقہ ہے جس نے عالم اسلام کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہلا کر رکھ دیا ہے اور اسلام کے فکری واجتماعی ڈھانچہ اور ملت ابراہیمی کے شیرازہ کے لئے ایک چیلنج بن گئی ہے اور جس کے نتیجہ میں مسلم اقوام کے پرجوش اسلامی جذبات، ان کی سادہ دلی اور گرمجوشی، ان کی قربانیاں اور سرفروشیاں اور اخلاص ووفا کی قیمتی سوغات (جس کا ان حکومتوں کے قیام اور غیر ملکی اقتدار سے آزادی میں سب سے بڑا اور براہِ راست دخل ہے) افرنگیت اور مغربیت کے تنور کی حقیر ایندھن بن رہی ہے، سادہ لوح، بے زبان، سچے مخلص مسلم عوام، خاموشی اور سکون کے ساتھ بکریوں کے ریوڑ کی طرح کسی نامعلوم منزل کی طرف ہنکائے جارہے ہیں اور یہ طبقہ ان کی قسمت کا مالک بن گیا ہے'' (۱)

---

(۱) اسلامی ملکوں میں نظام تعلیم کی اہمیت: ۲۱-۲۳، حضرت مولانا ابوالحسن ندوی

عصری مدارس اور عصری علوم محتاجِ اصلاح

اسلامی نظریہ تعلیم

شخصیت کی تعمیر، فطری صلاحیتوں کے ابھار واستعمال کی ترغیب ، اور جذبہ خدمتِ خلق کی تحصیل۔

مغربی نظریہ تعلیم

عیسائی عقیدہ، تہذیب کا فروغ، پر تعیش زندگی کی تحریص، اور ڈگری کے ذریعہ شہرت وناموری کا فریب، اور تہذیبِ اسلامی کے تشخص وامتیاز کی پامالی

نصاب

متعلقہ علوم وفنون کے اتنے مواد کی فراہمی جو ہر مضمون کی ضرورت پوری کر سکے ، اسکی تسہیل ، پھر درجہ بدرجہ تدوین اس طور پر کہ ہر مضمون میں اخلاقِ اسلامی کا عنصر اوراس کی روح کارفرما ہو۔

نصاب

ہر مضمون میں یورپ کا محض تقلیدی مواد جوزیادِ معلومات کا کام کرتا ہو، مگر تخلیقی صلاحیتوں کوابھار کر تحقیقی میدان میں سرگرم کرنیکی صلاحیت نہ رکھتا ہو، جس کے ذریعہ بس کسی سند کا حصول اور چند ٹکوں کا وصول ہو سکے۔

نظام

باحیاء اور پاکیزہ ماحول ، بلند کردار ، ہمدرد وملنسار، خوش عقیدہ ومتبع سنت ، اساتذہ، اور سہولت وسائل کی فراہمی

نظام

لڑکوں اورلڑکیوں کا اختلاط، صلیبی کلچر اور مسیحی ماحول اور مخالف اسلام ذہن سازی وہ بھی کمرشیل بنیادوں پر۔

نتیجہ

خداترس، پاکباز، انسانیت نواز ایک دوسرے کے ضرر سے محفوظ ، ایک دوسرے کو فائدہ پہنچانے والے منظّم ومتحد معاشرہ اورمہذب وروبہ ترقی سماج

نتیجہ

خدا فراموش ، دین بیزار ، بداخلاق ، حیاء وحجاب سے عاری ، نہایت خود غرض، اورآخرت سے یکسر غافل وبے پرواہ سوسائٹی کا وجود ، جس کا عقیدہ

کی تشکیل، یعنی انسانیت کی تکمیل۔

ثبوت کے لئے

اسلامی نظامِ تعلیم کے رد میں پیدا شدہ دینی وعصری علوم کے ماہرین پر نظر ڈالی جائے کہ وہ اپنے اپنے فنون میں یکتائے زمانہ اور نادر روزگار ہونے کے ساتھ ساتھ، صورت وشکل، کردار وعمل اور خدمتِ خلق کے اعتبار سے کیسے کامل ومکمل اور مخلص و بے لوث تھے۔اس کے ساتھ علم وہنر میں حقائق میں مہارت کا یہ عالم تھا کہ وہ کائناتی حقائق جو معلومات کی تنگی اور مشاہدہ کے محدود وسائل کی وجہ سے انسانی عقل سے بالا تر تھے اور جن کے بارے میں موجودہ معلومات کی تنگی اور مشاہدہ کے محدود وسائل کی وجہ سے انسانی عقل سے بالاتر تھے اور جن کے بارے میں موجودہ معلومات ومزعومات کو عقائد کا درجہ اور توہمات کا ٹیکہ دیکر اسی پر اکتفاء کرلیا گیا تھا، انہیں توہمات

وعمل مسیحیت سے قریب اور اسلام سے دور ہو، جس میں ایمان ویقین شکوک وشبہات سے مبدل اور اخلاق واعمال ایثار وقربانی سے عاری ہوں۔

ثبوت کے لئے

جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی اکثریت کا حال دیکھ لیا جائے جو تکلف وتصنع کو اخلاق اور اخلاقِ اسلامی کو تشدد سے تعبیر کرتے ہیں، جن کی نظر میں یورپین اقوام ہی خوش نصیبی اور ترقی کی ضامن ہیں، ان کی تقلید جامد کے بغیر زمانہ میں پنپنا اور رفتارِ ترقی کا ساتھ دینا ناممکن ہے، بہت سوں کی مغربی غلامی کا یہ حال ہے کہ وہ اسلام کی تعریف بدلنے اور قرآن کی نئی تعبیریں وتشریح کے حق میں نظر آتے ہیں، یورپ کا ہر اعتراض ان کو اپنے مذہب پر ایسا داغ نظر آتا ہے کہ اس کو مٹانے کے لئے وہ اس حکم کو حذف کردینے پر آمادہ ہیں، اور اس کی حفاظت کرنے والے ملاوں سے سخت چڑ ہے۔ان لوگوں کو اولا دینداری دقیانوسی محسوس ہوتی ہے، اور اگر ادھر کچھ رغبت بھی ہوتی ہے تو وہ

کی جکڑ سے آزاد کر کے تحقیقات وانکشافات کا ایسا سلسلہ قائم فرمایا جو آج تک پورے کروفر کے ساتھ رواں دواں ہے ، یورپ کی سائنسی ترقی اور تخلیقی دوڑ اگر چہ بہت آگے بڑھ گئی، اور بڑھتی جارہی ہے، مگر تاریخِ اقوام ناطق اور چشمِ فلک گواہ ہے کہ خود یورپ نے یہ دولت مسلمان سائنسدانوں کی شاگردی میں حاصل کی ہے ، آٹھویں صدی ہجری تک جدھر دیکھو مسلم سائنسدانوں ہی کا غلغلہ اور شور مچا ہوا تھا ؛لیکن شامتِ اعمال سے اس کے بعد مسلمانوں کا یہ علمی ورثہ یورپ کی میراث بن گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کی نظروں سے اس حقیقت کو چھپا دیا گیا۔

اسلام کو علماء اسلام سے سمجھنے اور حاصل کرنے کے بجائے دشمنان اسلام یا ان کے شکار مسلم اسکالرز کے ذریعہ حاصل کرنے کو ترجیح دیتے ہیں ، نتیجۃً اسلام کی کوئی نئی تعبیر اور خود ساختہ تصویر لیکر میدانِ دعوت میں اتر جاتے اور اہلِ اسلام کیلئے دردسر بن جاتے ہیں، ان کا حال عربی کے اس مقولہ کا ہوجاتا ہے ’’اگر تو نہیں جانتا تو یہ ایک مصیبت ہے اور اگر جانتا ہے تو یہ اس سے بڑی مصیبت ہے‘‘۔

تعلیم اور اسلاف

چناں چہ جس دور میں یہ تمام علوم وفنون اہل اسلام کے ہاتھوں پروان چڑھ رہے تھے، ان علوم وفنون سے انسان کو انسانیت کا سبق ،شرافت کا درس ، اخلاق فاضلہ میں رسوخ ،حق وباطل میں تمیز وپہچان کی صلاحیت ، بھر پور طریقے پر حاصل ہوتی رہی اور انسان ہدایت کی شاہراہ پر گامزن اور صراط مستقیم پر قائم تھا ، سائنس کا ہر سبق اس کے لیے وجود خداوندی اور توحید باری کا سبق تھا ،ٹکنالوجی کے فنون اس کے لئے قدرتِ خداوندی پر یقین کا باعث بن جاتے تھے، تاریخ کے واقعات اور قوموں کے

عروج وزوال کی داستانیں اس کے لئے عبرت وموعظت کے اسباق قرار پاتے تھے ،اور وہ ان سے ہدایت حاصل کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا: غرض یہ کہ تمام علوم وفنون اس کی رہنمائی کرتے تھے اور وہ رضائے الٰہی وقرب خداوندی کی دولت سے مالا مال ہو جاتا تھا۔(۱)

زوالِ اسپین کے بعد

مگر اسپین کے زوال کے بعد جب یہ تمام علوم وفنون (جس کو ہمارے اسلاف نے ایمانی فراست اور روحانی حرارت کے ذریعہ پروان چڑھایا تھا اور ان علوم وفنون سے انسانیت کی خدمت لیتے رہے) الحاد ودہریت کے شکار لوگوں ،خدا ورسول کے باغیوں، انسانیت وشرافت سے محروم لوگوں ،حرص وہوس کے پجاریوں کے ظالمانہ ومجرمانہ پنجے اور قبضے میں چلے گئے ،تو ان علوم وفنون کو ان کے اصل مقصد ومنشاء کے خلاف استعمال کیا جانے لگا اور اپنے ذاتی مفادات کے لیے ان کا کھلے طور پر استحصال کیا جانے لگا۔اور یہ ملحد وزندیق اور اہلِ حرص وہوا لوگ اپنی مکاری وعیاری، چالاکی وچالبازی سے شعبۂ تعلیم پر چھاتے ہی چلے گئے، یہاں تک کہ ان علوم وفنون کو انھوں نے خدا اور رسولوں سے بغاوت، مذہب وایمان سے عداوت ،انسانیت وتہذیب سے تلعب واستہزاء اور اخلاقی اقدار کی تحقیر وتوہین کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔

خلافت عثمانیہ کے زوال کے اسباب:

علامہ ابوالحسن ندویؒ خلافتِ عثمانیہ کے زوال کی تاریخ اور وجوہات کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

> ’’سب سے بڑا مرض جو ترکوں میں پیدا ہوا تھا وہ جمود تھا اور جمود بھی دونوں طرح کا علم وتعلیم میں بھی جمود اور فنون جنگ اور عسکری تنظیم وترقی میں بھی............علمی جمود اور ذہنی اضمحلال اس وقت صرف ترکی اور اس کے علمی اور دینی حلقوں کی خصوصیت نہیں تھی ، واقعہ یہ ہے کہ پورا عالم

(۱) جواہرِ شریعت:۱۸

اسلامی مشرق سے مغرب تک ایک علمی انحطاط کا شکار تھا، دماغ تھکے تھکے سے اور طبیعتیں بجھی بجھی سی نظر آتی تھیں اور ایک عالمگیر جمود اور افسردگی چھائی ہوئی تھی ، اگر ہم احتیاطا آٹھویں صدی سے اس ذہنی اضمحلال کی ابتداء نہ کریں تو اس میں شبہ نہیں کہ نویں صدی وہ آخری صدی تھی ، جب جدت فکر، قوت اجتہاد اور ادب وشاعری، حکمت وفن میں ندرت اور تخلیق کے آثار نظر آتے ہیں، یہی وہ صدی ہے جس میں مقدمہ ابن خلدون جیسی مفکرانہ تصنیف عالم اسلام کو حاصل ہوئی، دسویں صدی سے بہت واضح طور پر افسردگی ، شدت تقلید اور نقالی کے آثار نظر آنے لگتے ہیں، یہ افسردگی اور اضمحلال کسی خاص شعبہ اور کسی خاص فن کے ساتھ مخصوص نہیں تھا، دینی علوم ، شعر وادب ،انشاء وتاریخ تعلیمی نصاب ونظام سب کے سب کم وبیش اس سے متاثر نظر آتے ہیں، پچھلی صدیوں کے علماء کے تذکرے اور کتب سوانح پڑھیے ،سینکڑوں ناموں میں ایک ایسے شخص کا ملنا مشکل ہوگا جس پر عبقری (genius) کے لقب کا اطلاق درست ہو یا جس نے کسی موضوع پر کوئی نئ چیز پیش کی ہو، یا کسی خاص علم میں اس نے کوئی گرانقدر اضافہ کیا ہو......سوائے مجدد الف ثانی کے مکتوبات اور شاہ ولی اللہ دہلوی کی حجۃ اللہ البالغۃ ،شاہ رفیع الدین کی تکمیل الاذہان ، شاہ اسماعیل شہید کی چند ایک تصانیف ...... صرف علم دین پر منحصر نہیں، ادب وشاعری بھی اپنی زندگی اور تازگی کھو چکی تھی اور ان پر بھی تقلید وتتبع کا غلبہ تھا، نثر وانشا پردازی کو تکلف وتصنع وقافیہ پیمائی، لفظی صناعی اور عبارت آرائی نے بے رونق اور بے روح بنا رکھا تھا، دوستوں کے خطوط ، تاریخ کی کتابیں اور دفتریں تحریریں اور فرامین سے بھی اس عیب پاک نہیں تھے، کہیں کہیں ادب وانشاء کا کوئی ایسا نمونہ آجاتا ہے جو اس زمانے کے مذاق عام سے الگ اور پست سطح سے بلند

نظر آتا ہے‘‘

پھر آگے فرماتے ہیں کہ:

’’سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی ہی سے ترک تنزل وانحطاط، علمی پسماندگی اور جمود کا شکار ہو چکے تھے، تاریخ انسانی کا یہ وہ اہم ترین عہد ہے جس کا اثر بعد کی صدیوں پر نقش ہے، یورپ اس میں اپنی لمبی نیند سے بیدار ہوا تھا اور ایک جوش وجنوں کی حالت میں اٹھ کر غفلت اور جہالت کے اس طویل زمانہ کی تلافی کرنا چاہتا تھا، وہ ہر شعبہ حیات میں گریز ترقی کر رہا تھا، طبعی قوتوں کو مسخر، کائنات کے اثرات کو منکشف اور نا معلوم سمندروں اور اقلیموں کی دریافت کر رہا تھا، ہر علم وفن میں اس کی فتوحات اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کے اکتشافات جاری تھے، اس مختصر سی مدت میں اس کے یہاں ہر علم میں بڑے بڑے محقق، موجد اور مجتہد فن پیدا ہوئے، کوپرنیکس copernicus گلیلو galilio کیپلر kepler اور نیوٹن newton وہ عالم اور محقق تھے، جنھوں نے ہیئات وطبعیات کا ایک جدید نظام پیدا کر دیا، سیاحوں اور جہاز رانوں میں کولمبس columbus واسکوڈی گاما vasco da gama اور میگلن manglin جیسے عالی ہمت، اولوالعزم پیدا ہوئے، جنھوں نے نئی دنیا اور نا معلوم ممالک دریافت کئے۔

علم وصنعت کے میدان میں ترکوں کی پسماندگی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ سولہویں صدی مسیحی سے پہلے ترکی میں جہاز سازی کی صنعت شروع نہیں ہوئی تھی، اٹھارہویں صدی عیسوی میں ترکی پریس ومطابع حفظانِ صحت کے مراکز اور فوجی تعلیم طرز کے مدارس سے روشناس ہوئے، اٹھارویں صدی کے آخر تک ترکی کی نئی ایجادات اور ترقیوں سے اس قدر بیگانہ تھا کہ جب قسطنطنیہ کے باشندوں نے

دارالسلطنت پر ایک غبارہ baloon کو پرواز کرتے ہوئے دیکھا تو اس کو سحر یا کیمیا کی کرشمہ سازی سمجھے، نہ صرف یورپ کی چھوٹی چھوٹی سلطنتیں ترکی سے اس میدان میں بازی لے جا چکی تھیں؛ بلکہ مصر بھی بعض مفید نئی چیزوں سے فائدہ اٹھانے میں پیش قدمی کر چکا تھا، ترکی سے چار سال پہلے مصر میں ریلوے کا نظام قائم ہو چکا تھا، ڈاک ٹکٹ بھی چند مہینے پہلے مصر میں رائج ہو چکا تھا۔

جب ترکی کا یہ حال تھا جو عالم اسلام کا قائد تھا تو دوسرے عرب ممالک کا جو ترکی کے زیر اثر یا دست نگر تھے جو کچھ حال ہوگا، اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، چھوٹی چھوٹی نئی صنعتیں بھی ابھی ان ملکوں میں رواج پذیر نہیں ہوئی تھیں، ایک فرانسیسی سیاح موسیو والنی volney (جس نے اٹھارویں صدی میں مصر کی سیر کی ہے اور شام میں چار سال تک مقیم رہا ہے) اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے کہ ''یہ ملک صنعت میں اس قدر پیچھے ہے کہ اگر تمہاری گھڑی خراب ہو جائے تو غیر ملکی کے علاوہ کوئی درست کرنے والا نہیں ملے گا'' (۱)

پھر مسلمانوں کا تنزل صرف حکمت وعلوم نظریہ اور صنعت وحرفت ہی میں نہ تھا؛ بلکہ یہ ایک ہمہ گیر اور عمومی انحطاط تھا جو مسلمانوں پر پورے طور پر محیط تھا، حتی کہ وہ اپنے جنگ میں بھی یورپ سے پیچھے رہ گئے ہیں جن میں ترکوں کو درجۂ امامت واجتہاد حاصل تھا اور ان میں ان کی فوقیت کا دنیا کو اعتراف تھا؛ لیکن یورپ اپنی ایجاد واجتہاد اور تنظیم کی بدولت فنون حربیہ میں بھی ترکوں سے بہت آگے بڑھ گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی فوجوں نے ۱۷۷۴ء میں عثمانی افواج کو شرمناک شکست دی اور دنیا پر ظاہر کر دیا کہ ترک جنگی طاقت میں عیسائی قوموں سے پیچھے رہ گئے ہیں'' (۲)

---

(۱) زعماء الإصلاح فی العصر الحدیث، الدکتور أحمد أمین

(۲) انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر: ۱۹۰-۱۹۴

اور آج کے دور میں علم وتعلیم نام ہی اس بات کا ہے کہ مذہب وایمان کو فضول اور بیکار چیز سمجھا جائے، اخلاقی اقدار جیسے شرم وحیاء تواضع وانکساری، احسان وسلوک وغیرہ کو عجز وکمزوری پر محمول کیا جائے اور انسانی اقدار کو دقیانوسی ٹھہرایا جائے اور اس کے برعکس ہر بے حیائی اور بے شرمی کو تعلیم کا لازمہ اور ہر بے ایمانی اور بداعتقادی کو عقل وشعور کا نتیجہ اور ہر بداخلاقی وبدتہذیبی کو روشن خیالی کا اثر قرار دیا جائے۔(۱)

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ فرماتے ہے:

''(میکالے کا) سب سے بڑا مشن یہ تھا کہ ہندوستان کے باشندوں بالخصوص مسلمانوں کو اپنے سارے تہذیبی ورثے کے بارے میں شدید احساس کمتری کا شکار بنا کر ان کے دلوں پر مغرب کی ہمہ گیر بالا دستی کا سکہ بٹھا دیا جائے، اور نئی نسل کو ہر ممکن طریقہ سے یہ یقین کر لینے پر مجبور کر دیا جائے کہ اگر دنیا میں ترقی اور سربلندی چاہتے ہو تو اپنی فکر، اپنے فلسفے، اپنی تہذیب، اپنی معاشرت اور اپنے ماضی پر ایک حقارت بھری نظر ڈال کر مغرب کے پیچھے پیچھے آؤ اور اپنی زندگی کا ہر راستہ اسی کے نقوش قدم میں تلاش کرو'' (۲)

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ فرماتے ہے:

''یہ مغربی نظام تعلیم درحقیقت مشرق اور اسلامی ممالک میں ایک گہرے قسم کی لیکن خاموش نسل کشی کے مرادف تھا، عقلائے مغرب نے پوری نسل کو جسمانی طور پر ہلاک کرنے کی فرسودہ اور بدنام طریقہ کو چھوڑ کر اس کو اپنے سانچے میں ڈھال لینے کا فیصلہ کیا اور اس کام کیلئے جا بجا مراکز قائم کیئے، جن کو تعلیم گاہوں اور کالجوں کے نام سے موسوم کیا'' (۳)

مریم جمیلہ فرماتی ہیں:

---

(۱) جواہر شریعت: ۱۹ (۲) ہمارا نظام تعلیم، ص: ۴۸

(۳) مسلم ممالک میں مغربیت اور اسلامیت کی کشمکش: ۲۴۷

''مسلمان ماں کو کسی بھی قیمت پر اپنے بچوں کو عیسائی مشینری اسکول، یا کانونٹ کو بھیجنے راضی نہ ہونا چاہیے، جہاں ان بچوں کو پوری طرح اپنے مذہبی ومعاشرتی ورثا سے الگ کردیا جاتا ہے۔اگر چہ یہ بھی یقین کرنا چاہیے کہ سرکاری اسکول بھی کچھ زیادہ تسلی بخش سامان مہیا نہیں کرتے''(۱)

نومسلم مغربی مصنف محمد اسد فرماتے ہیں:

''مسلم نوجوانوں کی مغربی تعلیم ان کو رسول اللہ ﷺ کے پیغام پر ایمان ویقین رکھنے اور اپنے آپ کو اس مخصوص الٰہی تمدن وتہذیب کا نمائندہ سمجھنے کے قابل نہ رکھے گی جو اسلام لے کر آیا ہے''

اس کے بعد پھر آگے چل کر فرماتے ہیں:

''یعنی جو کچھ بھی ہو، اس میں شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ ''ان روشن خیالوں'' کے اندر دینی عقائد بڑی تیزی کے ساتھ کمزور ہوتے جارہے ہیں، جن کی تعلیم مغربی بنیادوں پر ہوئی ہے)''۔

پھر آگے ایک عجیب بات فرماتے ہیں کہ:

''ہماری (مسلمانوں کی) پوری تعلیمی پسماندگی اور بے بضاعتی ان مہلک اثرات کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی جو دینی بنیادوں پر مغربی تعلیم کی اندھی تقلید کی وجہ سے مرتب ہوں گے''(۲)

بعض بلکہ اکثر لوگ آج مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کا رونا روتے ہیں اوران کو مشورہ دیتے ہیں کہ جو کچھ بھی اور جیسا بھی بن پڑے وہ عصری علوم حاصل کریں ایسے لوگ محترم محمد اسد صاحب کی اس عبارت کو بار بار پڑھیں اور غور کریں کے انہوں نے کیا فرمایا ہے؟

بلاشبہ پسماندگی بری چیز ہے مگر مغربی تعلیم پر اندھا دھند فریفتہ ہونا اوراس کو جوں کا توں از اول تا آخر لے کر خوش ہوجانا، ایمان اور دینی بنیادوں پر کیا مہلک اثرات مرتب

---

(۱) Islam and Women Today-10

(۲) Islam at the Cross Road P.100

کرتا ہے؟ اس کا موازنہ تعلیمی پسماندگی سے کیا جائے تو اس پسماندگی کی کوئی حیثیت نہ ہوگی بشرطیکہ ایمان واسلام کی قدر دل میں ہو۔

مغرب نے تعلیم کو کاروبار بنا دیا ہے، اسلام میں تعلیم خدمت اور مشن ہے، تعلیم کا مقصد ملازمت قرار دیا گیا، راتوں ورات امیر بننے کی خواہش پیدا کی، عزت کا معیار دولت کو قرار دیا، سیکولرزم یعنی اسلامی مذہبی احکام سے بے اعتنائی اور دین کو محض چند رسوم ورواج کا مجموعہ سمجھا جانے لگا، اور عقائد، تجارت، معاشرت، اور معیشت سیاست سے دین کو نکالا، اس کی جگہ انسان پرستی humanism اور موجودیت یعنی خدا کی جگہ انسان کو خود مختار بنا کر اس کی خدائی کا اعلان آخرت کے مقابلہ دنیوی زندگی پر اصرار، اور العیاذ باللہ خدا کے اقتدار کا خاتمہ سیکولرزم کے روپ میں مذہبی اور اخلاق کے بجائے مادہ اور جسم کو ترجیح دینے کے لئے مادہ پرستی (materilism) کو فروغ دیا اور وحی اور عقل کو چھوڑ کر تجربیت (empirism) نتائجیت ایجابیت اور افادیت پسندی کو عام کیا، اسلام میں تجدید کی کوشش کرنا دین کو دنیوی ترقی کا ذریعہ نہ سمجھنا، مغربی نظریات کو عین اسلامی قرار دینا، یہ سمجھنا کہ سود کے بغیر معیشت نہیں چل سکتی، سگریٹ ونسوار پینا، فحش فلموں، گندے ڈراموں، اور گانوں کو گناہ نہ سمجھنا، مغربی لباس کو تفاخر کے طور پر پہننا، کھیل کود کو پیشہ اور مقصد حیات بنانا وغیرہ۔(۱)

عالمی سطح پر wto اور gat کے ذریعہ اقوام عالم کو ایک ایسی لادین اور سیکولرزم تعلیمی پالیسی میں شامل ہونے پر مجبور کر دیا ہے جو محض معاشی حیوان پیدا کر سکتی ہے۔

زندگی کے چند اہم شعبوں میں اسلامی ومغربی عقائد ونظریات کا موازنہ پیش خدمت ہے:

ش	اسلامی فکر	ش	مغربی فکر
(۱)	انسان اللہ کو راضی کرنے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے ہر	(۱)	انسان اپنی مرضی کے مطابق جو کرنا ہو بلا روک ٹوک کرے۔

(۱) اسلامی اور تہذیب مغرب کی کشمکش

	وقت تیار رہے۔		
(۲)	اخروی کامیابی کو اپنا ہدف بنائے	(۲)	دنیوی ترقی کے لیے جو چاہے کرے۔
(۳)	دنیا کی طرف بقدرضرورت شریعت کے حدود و قیود میں رہ کر التفات کرے۔	(۳)	دنیا کی محبت ہی سے ترقی حاصل ہوگی۔
(۴)	عفت، عصمت، حیا، نکاح، معاشرت ومعیشت، اخلاق ہر چیز میں شریعت کا پابند رہے۔	(۴)	مرداورعورت کو بالکلیہ آزادی حیاء کو بیماری کا نام دیا گیا؛ نکاح کی کوئی ضرورت نہیں۔
(۵)	عورت اور مرد کے الگ میدان عمل اور اسلامی معاشرے میں متقی اورفاجر میں فرق۔	(۵)	مساوات مردوزن اور فاجراور متقی کا کوئی فرق نہیں۔
(۶)	انسان کے ظاہری و باطنی ہرقول عمل میں اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت لازم، حلال وحرام کا معیار قرآن و حدیث اور صحیح اجتہاد۔	(۶)	انسان پر نہ اللہ کی اطاعت لازم، نہ رسول کی بلکہ حلت وحرمت کا اختیار فرداورارکانِ پارلیمینٹ کو حاصل۔
(۷)	معیشت اورمعاشرت میں سادگی، قناعت، انفاق اور صلہ رحمی عبادت اور کارِثواب۔	(۷)	ذاتی منافع کا محرک انسان خود ہے، لہٰذا صرف اپنے فائدے کو پیش نظر رکھنا اور ہرممکن سرمایہ میں اضافہ کرنا چاہیے۔سود سے ہو، چاہے رشوت سے ہو، چاہے سٹہ سے ہو، اورٹھاٹھ باٹ طرزِ زندگی۔
(۸)	مآخذ علم قرآن، حدیث، اجماع	(۸)	مآخذ علم،انسانی عقل اورمشاہدہ

	اور قیاس صحیح اس میں اول الذکر دو اصل اور ثانی الذکر کی حیثیت ثانوی۔		وتجربہ اور مذہب کی عدم مداخلت۔
(۹)	مقصد علم: حقوق اللہ اور حقوق العباد کی معرفت کے بعد اس پر عمل درآمد۔	(۹)	انسانی صلاحیتوں کی نشوونما، تاکہ دنیوی زندگی کامیابی سے گذر سکے۔
(۱۰)	غایت علم: دنیا میں اللہ اور رسول کی اطاعت تاکہ آخرت میں کامیابی سے ہمکنار ہوجائے۔	(۱۰)	غایت علم: دنیا کی تسخیر تاکہ العیاذ باللہ، اللہ اور قدرت کا مقابلہ کر سکے۔
(۱۱)	سیاست اور مذہب ساتھ ساتھ اسی لیے خلافت کا قیام تاکہ دنیا دین وآخرت دونوں میں فرد اور معاشرہ کامیابی اور سلامتی سے گذر جائے۔	(۱۱)	جمہوریت: یعنی سیاست اور دین میں تفریق صرف دنیا کی کامیابی اور کسی پر غلبہ حاصل ہوجائے۔(۱)

اکابرینِ امت کا عصری تعلیم کے تعلق سے اظہارِ خیال

۲۹/اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس کے وقت شیخ الھند حضرت مولانا محمود حسنؒ کے خطبۂ صدارت کے یہ تاریخی فقرے ہمارے کانوں میں ابھی بھی گونج رہے ہیں:

> ''اے نونہالانِ وطن جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غمخوار، جس میں میری ہڈیاں پگھلی جارہی تھیں، مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف سے بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے تاریخی مقاموں دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا''

(۱) مقالہ مولانا حذیفہ وستانوی، تعلیم اور سماجی خرابیاں، پیش کردہ برموقع سیمینار، جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا، زیر نگرانی: مولانا آزاد نیشنل اردو، یونیورسٹی، حیدرآباد، ۱۲، جنوری تا ۲۱ جنوری: ۲۰۱۰ء

باوجود یہ کہ دیوبند کی خالص دینی تعلیمی درسگاہ کے بالمقابل علی گڑھ پر خالص دنیوی تعلیم کا غلط لیبل چسپاں کردیا گیا ہے، لیکن کیا ہم بھول جائیں کہ سرسید نے جس درسگاہ کا خواب دیکھا تھا اس کے متعلق انہوں نے خود کہا تھا: ''فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا، نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور لا الہ الاّ اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر''

لدھیانہ مشن اسکول کو خطاب کرتے ہوئے سرسید فرماتے ہیں:

''یاد رکھو کہ اسلام جس پر تم کو جینا ہے اور جس پر تم کو مرنا ہے، اس کو قائم کرنے سے ہماری قوم قوم ہے، اے عزیز بچے! اگر کوئی آسمان کا ستارہ ہوجائے، مسلمان نہ رہے تو ہم کو کیا وہ ہماری قوم میں نہ رہا''

دوسری طرف مولانا ابو الکلام آزاد جدید تعلیم کے علم برداروں کے خلاف قلم اٹھاتے ہیں تو اسلئے نہیں کہ انہیں جدید تعلیم سے کوئی خلاف تھا، بلکہ اسلامی نقوش کے مٹنے کا درد تھا جو ان الفاظ میں ظاہر اہوا

''میں جو نئے تعلیم یافتہ حضرات کا ہمیشہ شاکی رہتا ہوں تو اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کی ہر گذشتہ خوبی کو ان سے دور پاتا ہوں اور ان کی جگہ کوئی نئی خوبی مجھے نظر نہیں آتی، ہماری گذشتہ مشرقی معاشرت، اوضاع واطوار، اخلاق وعادات، طریق وبود وماند، یہ سب کے سب انہوں نے ضائع کردیئے، اخلاق وتمدن کے بعد مذہب کا نمبر آیا اور جدید تعلیم وتہذیب کے مندر پر مذہب کی قربانی چڑھائی گئی'' مانا کہ مذہب کی قربانی کے خلاف اس پر جو احتجاج کا نشانہ نئے تعلیم یافتہ حضرات بنائے گئے، لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ علماء کا طبقہ عصری تعلیم کا مخالف تھا محض جواب ترکی بہ ترکی ہے، جدید تعلیم سے متعلق علمائے دیوبند کی فکر کا محور مذہبِ اسلام اور اسلامی تہذیب وتمدن کا تحفظ وبقاء تھا اور آج کے حالات نے اس کی حقانیت پر اپنی مہرِ تصدیق ثبت کردی ہے، جامعہ ملیہ کی تاسیس کے موقع پر حضرت شیخ الہندؒ کی اپنے نظریہ تعلیم کی وضاحت دوررس فکر کا

ایسا نمونہ ہے جو اسی سال کے بعد کہنہ اور بوسیدہ نہیں ہوا، اسے دہراتے ہوئے ایسا نہیں لگتا کہ کوئی پرانی بات دہرائی جارہی ہو؛ بلکہ یہ کل بھی سچ تھا اور آج بھی سچ ہے،۔

فرماتے ہیں کہ:

"آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ میرے بزرگوں نے کسی بھی وقت کسی اجنبی زبان سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم وفنون حاصل کرنے پر کفر کا فتوی نہیں دیا، ہاں یہ بیشک کہا کہ: انگریزی تعلیم کا آخر اثر یہی ہے جو عموماً دیکھا گیا کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگ جائیں یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب اور اپنے مذہب والوں کا مذاق اڑائیں یا حکومت وقت کی پرستش کرنے لگیں تو ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کے لئے جاہل رہنا اچھا ہے"

چنانچہ ۱۹۲۰ میں شیخ الہند نے جس جامعہ ملیہ اسلامیہ کا سنگ بنیاد رکھا وہ "عصری علوم کی اعلیٰ تعلیم کیلئے ایک ایسی آزاد درسگاہ تھی جس کا تمام تر نظامِ عمل اسلامی خصائل اور قومی احساسات پر مبنی ہو"۔

مسلم لیگی اخبار "منشور" (دہلی) کے مدیر مسٹر حسن ریاض ۹ر جون ۱۹۴۰ء کے اداریہ میں لکھتے ہیں کہ:

"گذشتہ تیس برس سے مسلمان بچے بالعموم صرف انگریزی اسکولوں میں تعلیم پارہے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس دور کے جتنے تعلیم یافتہ ہیں وہ اسلامی کلچر، اخلاق اور اسلامی تصورات سے بالکل نابلد ہیں"

ڈاکٹر ہنر کا قول ہے:

"ہمارے انگریزی اسکولوں میں پڑھا ہوا کوئی نوجوان ہندو یا مسلمان، ایسا نہیں جس نے اپنے بزرگوں کے مذہبی عقائد کو غلط سمجھنا نہ سیکھا ہو" (۱)

---

(۱) مسلمانانِ ہند: ۱۴۲ بحوالہ فتاری رحیمیہ: ۲/۱۲۵

ہاتف نے کہا فردوس میں ایک روز حالی سے
مخاطب ہوئے یوں سعدی شیرازی
کچھ کیفیت مسلم ہندی کی تو بیاں کر
درماندۂ منزل ہے کہ مصروفِ تگ وتاز
مذہب کی حرارت بھی ہے کچھ اس کے رگوں میں
تھی جس کی فلک سوز کبھی گرمیٔ آواز
باتوں سے ہوا شیخ کی حالی متاثر
رورو کے لگا کہنے کہ اے صاحب اعزاز
جب پیرِ فلک نے ورق ایام کا پلٹا
آئی یہ صدا پاؤ گے تعلیم سے اعزاز
آیا مگر اس سے عقیدہ میں تزلزل
دنیا تو ملی طائر دین کر گیا پرواز
دین ہوتو مقاصد میں بھی پیدا ہو بلندی
فطرت ہے جوانوں کی زمین گیرد زمین تاز
بنیاد لرز جائے جو دیوار چمن کی
ظاہر ہے کہ انجام گلستاں کا آغاز
پانی نہ ملا زمزم ملت سے جو اس کو
پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز
یہ ذکر حضور شہہ یثرب نہ کرنا
سمجھیں نہ کہیں ہند کے مسلم مجھے غماز
خدما نتوان یافت ازاں خار کہ کشتیم
دیبا نتواں یافت ازاں پشم کے رشتیم

اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں:

''آج کل تعلیم جدید کے متعلق علماء پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ جدید تعلیم سے روکتے ہیں اور اس کو ناجائز بتلاتے ہیں؛ حالانکہ میں بہ قسم کہتا ہوں کہ اگر تعلیم جدید کے یہ آثار نہ ہوتے جو علی العموم اس وقت اس پر مرتب ہورہے ہیں، تو علماء اس سے ہرگز منع نہ کرتے، لیکن اب دیکھ لیجئے کہ کیا حالت ہورہی ہے، جس قدر جدید تعلیم یافتہ ہیں، بہ استثناء شاذ ونادر نہ ان کو نماز سے غرض ہے، نہ روزے سے، نہ شریعت کے کسی دوسرے حکم سے، بلکہ ہر بات میں شریعت کے خلاف چلتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ: اس سے اسلام کی ترقی ہوگی'' (۱)

اور فرماتے ہیں کہ:

''مدارس اسلامیہ میں بیکار ہوکر رہنا لاکھوں کروڑوں درجہ انگریزی تعلیم میں مشغول رہنے سے بہتر ہے، اس لئے کہ گو لیاقت اور کمال نہ ہو؛ لیکن کم ازکم عقائد تو فاسد نہ ہوں گے، اہلِ علم سے محبت تو ہوگی، اگرچہ کسی مسجد کی جاروب کشی ہی میسّر ہو، یہ جاروب کشی انگریزی میں کمال حاصل کرنے اور وکیل، بیرسٹر وغیرہ بننے کہ جس سے اپنے عقائد فاسد ہوں اور ایمان میں تزلزل ہو اور اللہ اور رسول اور صحابہ و بزرگانِ دین کی شان میں بے ادبی ہوکر جو اس زمانے میں انگریزی کا اکثری بلکہ لازمی نتیجہ ہے اور یہ ترجیح ایک محبّ دین کے نزدیک تو بالکل واضح ہے، ہاں جس کو دین کے جاننے کا غم ہی نہ ہو وہ جو چاہے کہے'' (۲)

سرسید مرحوم لکھتے ہیں کہ:

''اسی طرح لڑکیوں کے اسکول بھی قائم کئے گئے جن کے ناگوار طرز نے یقین دلایا کہ عورتوں کو بدچلن اور بے پردہ کرنے کیلئے یہ طریقہ نکالا گیا ہے'' (۳)

---

(۱) فضل العلم والعلماء: ۸ (۲) حقوق العلم: ۶۳، ۶۴، بحوالہ فتاوی رحیمیہ: ۲۲/۱

(۳) اسباب بغاوتِ ہند

آرنیبل مسٹر فضل حق وزیر اعظم صوبۂ بنگال نے ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل منعقدہ پٹنہ کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے فرمایا:

''جس قسم کی تعلیم (کالج اور اسکولوں میں ان کو دی گئی ہے، دراصل اُس نے اُن کو نہ دنیا کا رکھا ہے، نہ دین کا، اگر ایک مسلمان بچہ نے اونچی سے اونچی تعلیم کی ڈگری حاصل کر بھی لی؛ لیکن اس کوشش میں مذہب کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تو اس کا ڈگریاں حاصل کرنا قوم کیلئے کیا مفید ہوسکتا ہے؟ مفید اس وقت ہوسکتا ہے کہ جب مسلمان رہ کر ترقی کریں، کیا خوب کہا اکبر الہ آبادی نے

فلسفی کہتا ہے کیا پروا ہے گر مذہب گیا
میں یہ کہتا ہوں، بھائی یہ گیا تو سب گیا(۱)

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کا ارشادِ گرامی ہے کہ:

''انگریزی تعلیم کا آخری اثر یہی ہے جو عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگ جائیں، یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب اور مذہب والوں کا مذاق اڑائیں یا حکومت وقت کی پرستش کرنے لگیں تو ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کے لئے جاہل رہنا ہی اچھا ہے''(۲)

حضرت مولانا ابوالحسن ندویؒ قرآن کی آیت کریمہ ''قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا وَّقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ'' (اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو ایسی آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں اور جس پر تندخو اور سخت مزاج فرشتے مقرر ہیں جو اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جس کا ان کو حکم دیا جاتا ہے وہ بجالاتے ہیں)، اس آیت کے تحت ان طلباء کے تعلق سے فرماتے ہیں جنہیں

(۱) ''مدینہ'' (سہ روزہ) بجنور، ۹/اکتوبر ۱۹۳۸ء
(۲) خطبۂ صدارت جلسہ افتتاحیہ مسلم نیشنل یونیورسٹی علی گڈھ ۱۹۲۰ء

دینی تعلیم سے دور رکھ کر صرف اسکول کی غیر اسلامی ماحول میں تعلیم دی جاتی ہے:

''کیا اس آیت کا مطلب اس کے سوا اور کچھ ہوسکتا ہے کہ اپنے بچوں کو اپنے گھر والوں کو ایسی چیزوں سے بچاؤ جو آگ تک لے جانے والی ہیں جن کا انجام یہ ہونے والا ہے کہ دوزخ میں جائیں، ورنہ وہ کونسے انسان ہیں جو اپنے بچوں کو آگ کی طرف جاتے ہوئے دیکھیں اور ان کو نہ روک لیں؟ اب صورتحال اس وقت یہی ہے بچوں کی دینی تعلیم کا انتظام نہ کرنا بچوں کو اس ماحول کے بالکل حوالہ کردینا اور ان کو اس کے رحم وکرم پر چھوڑ دینا جو اس بات کا نہ مکلّف ہے نہ اس بات کا مدعی، نہ اس بات کا اہل کہ بچوں کو وہ تعلیم دے گا جس پر نجات موقوف ہے، پیغمبروں کی لائی ہوئی وہ تعلیم جس سے ناواقفیت کے نتیجہ میں ایمان کا خطرہ ہے، آخرت کی ہلاکت ہے تو اب یہ دیکھنا چاہئے کہ اس بات کو بچے کے لئے کیسے گوارا کیا جارہا ہے؟ موجودہ تعلیمی نظام صرف لادینی (secular) ہی نہیں وہ ایک مثبت ومعین نظام تعلیم (sestem of education hindu mythoositive logy) ہے، ہندون مالا اس میں شامل ہے، انگریزوں کے زمانے کی تعلیم سیکولر تھی، بلی، کتے کے قصے ہوتے تھے اور ہم میں سے بہت سے لوگوں نے انگریزوں کے عہدِ حکومت میں انگریزی پڑھی ہے، اس وقت زبان سکھانے والی ابتدائی کتابوں میں کسی کے عقیدہ پر اثر نہ پڑتا تھا، نہ کسی مخلوق کا تقدس پیدا ہوتا تھا اور نہ اس کائنات میں کسی مخلوق کا تصرف واختیار معلوم ہوتا تھا، اس وقت بھیڑیئے، چیتے، بندر اور لومڑی اور بلی، کتے کے قصے بچے پڑھتے تھے، ویسے کے ویسے ہی گھر آتے تھے جیسے جاتے تھے، لیکن اب صورتحال حال یہ نہیں ہے، سرکاری نصابی کتابوں میں عقیدہ پر اثر ڈالنے والے اسباب، قصے کہانیاں اور مضامین ہوتے ہیں اور جو کسر کتابوں میں

باقی رہ جاتی ہے، وہ ماسٹر صاحبان پوری کرتے ہیں، بچوں کو کچھ اجتماعی کام ایسے کرنے پڑتے ہیں جو اسلام کے عقیدۂ توحید کے منافی ہیں؛ لہٰذا موجودہ تعلیمی نظام سے بچے کا ایمان کیسے سلامت رہے گا؟ اگر خارجی واضافی دینی تعلیم کا انتظام نہیں ہے کہ اسکول میں جو کچھ پڑھ کر آتا ہے، اس کی اصلاح کی جاتی ہے اور اگر اس کو کوئی ایمانی توحیدی (d0se) دیا جاتا ہے، صباحی یا شبینہ مکتب ہیں، تعلیمی حلقے ہیں، کوئی دینی کتاب سنائی جاتی ہے ایسا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ............آج یہ حالت ہو رہی ہے کہ ایک بڑے طبیہ کالج کے جس کی ایک تاریخ ہے، ایک طالب علم سے کوئی مضمون لکھوانا تھا یا خط لکھوانا تھا، تو سوچا کہ یہ صاحب تو طب کی کتابیں پڑھتے ہیں جو عام طور پر عربی فارسی میں ہیں، بہت نیچے اتر آئیں تو اردو میں ہیں، ان سے کہا: آپ لکھئے، وہ لکھتے رہے، لوگ سمجھتے رہے کہ لکھ لیا، دیکھا تو وہ ہندی میں تھا، ان سے کہا گیا کہ آپ یونانی طب پڑھتے ہیں اور اردو نہیں لکھ سکتے؟ انہوں نے کہا کہ: ہمیں تو یہی پڑھایا گیا ہے، تو ایک ایسی نسل تیار ہونے کا محض اندیشہ نہیں، مشاہدہ میں آرہا ہے، دین کی بنیادی چیزوں سے ناواقف، بنیادی عقائد سے ناواقف، اللہ اور رسول اللہ ﷺ کا ہمارے دل میں جو عقیدہ بسا ہوا ہے اس سے ناواقف............آنکھوں سے دیکھا گیا ہے کہ سیرت پر تقریر کرنی ہے، اسلامیہ اسکول ہے، کالج ہے، جامعہ ہے اور ایک مسلمان نوجوان طالب علم کو کسی نے سیرت کا مضمون دیا، وہ ہندی میں لکھ کر لایا اور اردو میں پڑھا، الفاظ تو اردو اور رسم الخط ہندی اور رسم الخط تو وہ چیز ہے کہ آرنلڈ ٹوائن بی (toynbeearnold) جو اس زمانہ کا بڑا فلسفی، مؤرخ (philosopherhistotian) ہے، اس نے لکھا ہے کہ اب کسی کتب خانہ کو آگ لگانے کی ضرورت نہیں، رسم الخط بدل دینا کافی

ہے، اس سے اس قوم کا رشتہ اپنے ماضی سے بالکل ٹوٹ جائے گا اور اس کی پوری تہذیب اس کے لئے بے معنی ہو کر رہ جائے گی اور پھر جس طرف چاہے لے جاؤ، جو چیز چاہے کسی ملت کو اس کے ماضی سے، اس کے مذہب سے، اس کی تہذیب سے، اس کے کلچر سے ملاتی ہے، وہ رسم الخط ہے، رسم الخط بدلا نسل بدل گئی۔

آج سے ساٹھ برس پہلے اکبر مرحوم نے کہا تھا:

شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے (۱)

(۱) ماخوذ از: دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی
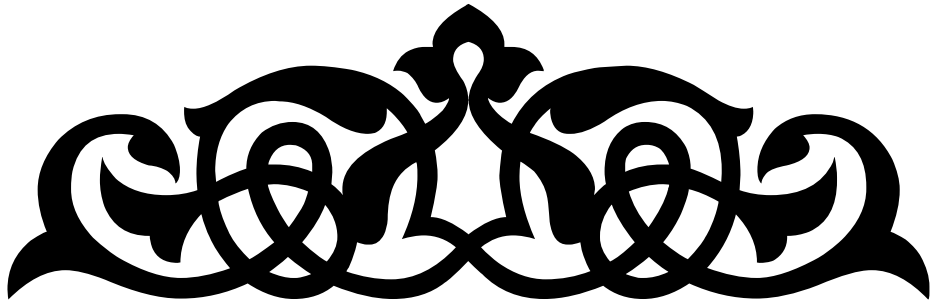
عصری تعلیم کے نظام ونصاب میں چند ناگزیر تبدیلیاں

اس سلسلہ میں امتِ مسلمہ میں (ہمارے ناقص مطالعہ کے مطابق) دو نقطۂ نظر
ئے جائے ہیں، ایک وحدت تعلیم کہ عالم اور ڈاکٹر کے فرق کو ختم کر دیا جائے، قدیم
نے کی طرح ایک انجنیئر کو ایسا منہاج اور مزاج دیا جائے کہ وہ حافظ ہو اور ڈاکٹر کو ایسا
ب پڑھایا جائے کہ وہ ضروریات دین سے بھی اچھی طرح واقف ہو، اس کے لئے
ری نظام تعلیم کے ابتدائی دس سالہ نصاب میں یہ تبدیلیاں لائی جائیں۔

لمانوں کے تعلیمی نظام کا حقائق نامہ

مسلمانوں کو جہاں بھی سیاسی، فکری اور حکمرانی کا غلبہ حاصل رہا، وہاں ان کے
م تعلیم کے لئے جو نصاب تجویز کیا گیا اس میں علوم کی اسلامی اور دینی تقسیم نہیں تھی،
ں تک کہ برصغیر میں بھی ڈھائی سے تین سو سال پہلے ''درس نظامی'' کے نام سے جو
ب تجویز کیا گیا تھا یہ نصاب بھی دین و دنیا کی ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر مرتب کیا گیا تھا
وہ تمام مضامین بھی اس میں شامل تھے جن کی اس زمانے میں ضرورت تھی جیسے حکومت
ت کی زبان فارسی، سائنسی علوم میں ریاضی، علم ہیئت وفلکیات، علم طب (میڈیکل)، علم
سہ (انجنیئرنگ) چنانچہ مدارس کے فارغ التحصیل لوگ عصری تقاضوں پر پورے اترتے
دوسروں کی فکری رہنمائی کے لئے موزوں ہوتے تھے، اس نظام میں مردم سازی کی
ں عظیم الشان صلاحیت تھی اور اس سے جامع الصفات قسم کے افراد معاشرے کا اہم
ہ اور کردار بنے۔

درس نظامی کے بانی اور اس نظامِ تعلیم کی جامعیت کے متعلق حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ اپنی کتاب ''ہمارا تعلیمی نظام'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''ملا نظام الدین سہالویؒ نے اپنے مدرسہ کے لئے تعلیم کا ایک نظام اور نصاب مرتب کیا، اس کو عمل کے تجربہ میں لائے، اس نظام تعلیم کی اہم خصوصیات کے پیش نظر ہی ہندوستان کے باقی تمام مدارس نے بھی اسی کو اپنا لیا اور ہندوستان پر انگریز سامراج کے تسلط تک ہندوستان میں یہی تعلیمی اداروں میں یہی نظام تعلیم بنیادی حیثیت سے نافذ کیا''۔

یہ نظام تعلیم علوم عربیہ، تفسیر، حدیث فقہ، عقائد وکلام، فلسفہ ومنطق، ریاضی طب اور ہندسہ وغیرہ تمام علوم کا جامع تھا، درس نظامی چونکہ تمام دینی اور دنیوی علوم پر مشتمل تھا، اس لئے اس نظام تعلیم کے فارغ التحصیل مسلمان طلباء عملی زندگی کے ہر شعبہ کی ذمہ داریاں اٹھالینے کی استعداد رکھتے تھے، چنانچہ ہر شخص اپنے ذوق اور صلاحیتوں کے مطابق زندگی کے جس شعبہ کو پسند کر کے اختیار کر لیتا اس میں اس کو ترقی کے تمام مواقع میسر رہتے تھے۔

غرض یہ کہ اس نظام تعلیم کے زیر تربیت کبار علماء، مفسرین، محدثین، فقہاء، متکلمین، فلاسفہ، ادباء اور مصنفین کی طرح ماہرین طب وسائنس، بڑے بڑے آفیسر اور ماہرین قانون بھی پیدا ہوئے، یہ لوگ علم وفن کے میدان میں مکمل دستگاہ رکھتے تھے۔

اس نظام تعلیم کا بنیادی اور اساسی مقصد یہ تھا کہ آدمی اپنے دین میں مکمل رسوخ حاصل کرے اور اپنے عقائد میں پختگی پیدا کر کے اپنی عملی زندگی کو دینی بنیادوں پر استوار کرے، نیز اپنے معتقدات اور عمل کی صحت ودرستگی کے دلائل سے کما حقہ واقف ہو سکے؛ تاکہ اجنبی نظریات اس کو کسی دھوکہ میں مبتلا نہ کر سکیں اور ہوا وہوس غلط راستوں پر ڈال دینے

میں کامیاب نہ ہوسکے،اسی وجہ سے فراغت کے بعد طالب علم بے خوف وخطر طب وسائنس کا شعبہ اختیار کر لے یا فلسفہ ومنطق کا ،خواہ تفسیر، حدیث اور فقہ وقانون کے شعبوں کو اپنالے ،اس کے راہ راست سے بھٹکنے کا کوئی اندیشہ نہ ہوتا تھا''(۱)

لمانوں کے نظام تعلیم پر برطانوی سامراج کا حملہ

۱۷۵۷ء میں ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت قائم ہوئی،اس میں شک ں کہ اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ دوسری قومیں بھی آباد تھیں؛ ن مسلمان نہ صرف اکثریت میں تھے؛ بلکہ حکومت بھی ان کے پاس تھی اوراس وقت کا وستان علم وفن اور تجارتی مرکز کے اعتبار سے مرجع خلائق تھا۔

انگریزوں نے حکومت وسلطنت مسلمانوں سے چھینی تھی؛ لہٰذا اگر اندیشہ تھا تو لمانوں سے اور تعلیم یافتہ بھی مسلمان تھے، اس لئے انگریزی حکومت اور برطانوی مراج نے مسلمانوں کو معاشرہ میں تعلیم یافتہ، باعزت اور روشن خیال (شرعی حدود میں ت نظر وفکر کے معنی میں) ہونے کے باوجود پست وذلیل، ناکارہ اور غیر تعلیم یافتہ قدامت پسند ہونے کا طعنہ دینے کے لئے ایک طویل المیعاد منصوبہ بنایا جس کے اہم اء ومقاصد یہ تھے۔

مسلمانوں کو مفلس وقلاش بنادیا جائے، ان کا سارا وقت دووقت کی روٹی حاصل کرنے میں صرف ہوجائے، مذہب وسیاست، ملک وملت کے اعلیٰ تصورات ان کے ذہنوں سے محو ہوجائیں۔

مسلمانوں کو جاہل اور پسماندہ بنادیا جائے، چنانچہ resumption act 1882ء کے ذریعہ برصغیر میں سارے اوقاف پر حکومت نے قبضہ کرلیا، تمام دینی مدارس کے سوتے سوکھ گئے، مدارس بند ہوگئے، مزید برآں دینی تعلیم کے خلاف اور ملا کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کی ایک فضا پیدا کردی؛ تاکہ کسی

ہماری تعلیم نظام: ۷۰-۷۵

صاحب حیثیت خاندان کا فرد ادھر کا رخ نہ کرے۔

- جدید مغربی تعلیم کا ڈھانچہ ہندؤوں اور عیسائی مشنریوں کی مرضی کے مطابق تیار کیا گیا اور مسلمانوں کو دیدہ ودانستہ پیچھے دھکیلا گیا؛ تاکہ وہ آئندہ نہ بڑھ سکیں۔

چنانچہ مذکورہ بالا تینوں مقاصد کی تکمیل کے لئے سب سے بہترین میدان تعلیم کا ،ان تھا، بقول ایک مغربی فلاسفر کے:

”if you want to dsry a nation destroy ist education“ (اگر تم کسی قوم کو تباہ کرنا چاہتے ہو تو اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کی تعلیم کو تباہ کردو)

چنانچہ ”slow poisoning“ کے ذریعہ جو صورت حال ہمارے سامنے آئی ،و جودہ نظام تعلیم کے بانی لارڈ میکالے کے اس منصوبہ کے عین مطابق تھی جو اس نے ،تاریخی یادداشت مرتبہ ۱۸۵۳ء میں مقبوضہ ہندوستان کے گورنر کو پیش کی تھی۔

اس تاریخی یادداشت میں مسلمانوں کو موجودہ نظام تعلیم سے کاٹ کر فاتح قوم کے م ونصاب تعلیم میں ڈھالنے کے لئے اس نے پوری ڈھٹائی سے اپنے مقاصد کو کھول ، بیان کئے جس کے مطابق اس کا سب سے بڑا مشن یہ تھا کہ ہندوستان کے باشندوں ،وص مسلمانوں کو اپنے سارے تہذیبی ورثے کے بارے میں شدید احساس کمتری کا ر بنا کر ان کے دلوں میں مغرب کی ہمہ گیر بالادستی کا سکہ بٹھا دیا جائے اور نئی نسل کو ہر ن طریقہ سے یہ یقین کر لینے پر مجبور کر دیا جائے کہ اگر دنیا میں ترقی اور سربلندی چاہتے ؤ اپنی فکر، اپنے فلسفے، اپنی تہذیب، اپنی معاشرت اور اپنے سارے ماضی پر ایک رت بھری نظر ڈال کر مغرب کے پیچھے پیچھے چلے آؤ اور اپنی زندگی کا ہر راستہ اسی کے ش قدم میں تلاش کرو۔

چنانچہ اس رپورٹ کے آخر میں تعلیمی نظام ونصاب بدلنے کی اصل غرض وغایت کو یت واشگاف میں اس طرح بیان کرتا ہے:

”ہم فی الحال اپنے محدود ذرائع کے ساتھ سب لوگوں کی تعلیم کا

بندوبست نہیں کر سکتے ،ہمیں اس وقت بس ایک طبقہ پیدا کرنے کی سعی کرنی چاہئے جو ہمارے اور ان کروڑوں انسانوں کے مابین ترجمانی کے فرائض انجام دے سکے جن پر ہم اس وقت حکمراں ہیں ،ایک ایسا طبقہ جو خون اور رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہو مگر ذوق ،طرز فکر ،اخلاق اور فہم وفراست کے نقطۂ نظر سے انگریز ، پھر اس کام کی ذمہ داری اس طبقے پر چھوڑ دیں کہ وہ اس ملک کی بولیوں کو سنوارے اور مغربی علوم سے سائنسی اصطلاحات لے کر ان زبانوں کو مالا مال کرے اور آہستہ آہستہ انہیں اس قابل بنائے کہ ان کے ذریعہ ملک کی آبادی کو تعلیم دی جا سکے ...... ہمارے لئے یہ اشد ضروری ہے کہ ہم ہندوستانی نوجوانوں کے اذہان وقلوب کو بدل ڈالنے کی کوشش کریں ،ہم ان کو ہندوستانی ہی رکھیں ،لیکن ذہنی وفکری انداز ،خالصتاً انگریزی ہونا چاہئے‘‘۔

لمانوں کا نظام تعلیم دو شعبوں میں کیسے تقسیم ہوا؟

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد جب انگریزوں کے قدم ہندوستان کی سرزمین میں بوطی کے ساتھ جم گئے تو مسلمان مفکرین کو محسوس ہوا کہ اب سیاسی زوال وانحطاط کے ںھ مسلمانوں کے دین ومذہب اور ان کی قومی زندگی کی بھی خیر نہیں ہے ، کیوں کہ تاریخ مسلسل شہادتوں کے مطابق جب کوئی قوم کسی ملک کو فتح کرتی اور اس ملک کے ندوں پر سیاسی غلبہ واستیلاء پالیتی ہے تو فاتح قوم کا اثر نفوذ صرف مفتوح اقوام کے موں تک محدود نہیں رہتا؛ بلکہ وہ ان کے دلوں اور دماغوں کو بھی تسخیر کر لیتی ہیں اور اس کا ہ یہ ہوتا ہے کہ مفتوحہ اقوام اپنی قومی خصوصیات وروایات اور ملی شعائر کو نہ صرف نظر از کر دیتی ہے اور اب ان کے لئے فاتح قوم کی نقالی اور کورانہ تقلید ہی سرمایہ افتخار رہ ں ہے ، ہندوستان کے بیدار مغز مسلمان اربابِ فکر وعلم نے اس خطرہ کا اسی وقت اس کر لیا اور اس کا سد باب کرنے کے لئے انہوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کی ہم کی طرف توجہ کی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمان اربابِ فکر کا یہ اقدام نہایت عاقبت اندیشی اور دور
، پر مبنی تھا؛ کیوں کہ سیاسی طاقت وقوت سے محروم ہو جانے کے بعد تعلیم کے سوا ایسی کوئی
ری چیز باقی نہیں رہ گئی تھی جس کے ذریعہ مسلمان اپنی قومیت کا تحفظ کر سکتے اور مغلوب
م ہونے کے باوجود بحیثیت ایک قوم زندہ رہ سکتے؛ لیکن اس ایک ضرورت کے احساس
شریک ہونے کے باوجود خود ارباب فکر میں دو طبقے ہو گئے، ایک طبقہ جو علمائے کرام کا
،اس نے اپنی تمام تر توجہ قدیم نصاب درس کی تعلیم پر مرکوز کر دی، اس مقصد کے لئے
بی مدارس قائم کئے گئے اور ان کے ذریعہ دینیات، یعنی تفسیر، حدیث، فقہ اور ان کے
نھ عربی زبان سے متعلق بعض دیگر علوم اور عقلی فنون کی تعلیم کا ذوق پیدا کرنے کی کوشش
گئی، آج کل عام اصطلاح میں اس طبقہ کو قدیم تعلیم یافتہ گروہ کہتے ہیں جس کی وجہ غالبا
ہے کہ یہ گروہ، علم اور عمل، وضع اور سیرت دونوں کے لحاظ سے بالکل قدیم ہے اور یہ وہی
ہ ہے جو دینی مدارس کی نمائندگی کرتا ہے، اس کے برخلاف دوسرا طبقہ متجددین کا تھا، یہ
وگ تھے جنہوں نے مسلمانوں کی خیریت اسی میں سمجھی کہ مسلمان انگریزوں کی زبان
ان کے علوم وفنون کو سیکھیں اور صرف اتنا ہی نہیں؛ بلکہ تہذیبی اور تمدنی لحاظ سے بھی انہی
، رنگ میں رنگ جائیں، اس گروہ کو عام بول چال میں جدید تعلیم یافتہ گروہ کہتے ہیں
اس کی وجہ تسمیہ ظاہر ہے کہ یہ لوگ چال ڈھال، وضع وقطع اور فکر ودماغ کے اعتبار سے علماء
، گروہ کی ضد ہیں، بہر حال اس طرح مسلمانوں میں تعلیم کی دو قسمیں ہو گئیں، ایک قدیم،
ری جدید، ان دونوں قسم کی تعلیم کی درسگاہیں بھی الگ الگ قائم ہوئیں، جدید تعلیم کی
گاہ اسکول اور کالج کہلائی اور قدیم تعلیم کی درس گاہ کا نام بھی وہی پرانا، مدرسہ رہا۔

اگر چہ یہ دونوں درس گاہیں مسلمانوں کی تھیں اور ان کی کسی ایک نہ ایک ضرورت
تکمیل کرتی تھیں، لیکن یہ امر نہایت افسوس ناک تھا کہ دونوں میں ایک طرح کی رقابت،
وت کی حد تک پیدا ہو گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم تعلیم کے اصحاب کی شکل میں دیکھنے
، روادار نہ تھا، یہ صورت حال ایک عرصہ تک قائم رہی اور بڑی حد تک اب بھی قائم ہے۔

مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں یہ بات انتہائی وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ

مانوں کے صدیوں پر محیط نظام تعلیم میں علوم، اسلامی اور غیر اسلامی دو الگ الگ
وں میں تقسیم ایک مجبوری کے تحت وجود میں آئی تھی، یہ مسلمانوں کے دین کو باقی رکھنے
، لئے ایک عارضی انتظام تو ضرور تھا، لیکن دائمی اور ماڈل انتظام نہیں تھا، چنانچہ مولانا محمد
، عثمانی صاحب اپنی کتاب ''ہمارا نظام تعلیم'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''اس صورت حال نے ہندوستان کے علماء کرام کو چونکا دیا، ان کو علوم دینیہ کے ضائع ہوجانے کا شدت سے احساس ہونے لگا، چنانچہ علوم دینیہ کی حفاظت اور ان کی نشر واشاعت کے پیش نظر ان حضرات نے درس نظامی کی تعلیم کے لئے مدارس کھولنے کی طرف پوری توجہ دینی شروع کی، علماء کی ایک جماعت نے ان حضرات کی دعوت پر لبیک کہا، کم آمدنی حتی کہ فقر وتنگ دستی کو گلے لگایا اور علوم اسلامیہ کی حفاظت کے لئے اپنی زندگیاں وقف کردیں، یہی وہ بڑا سبب ہے جس کی وجہ سے دینی اور دنیاوی دو الگ الگ شعبوں میں مسلمانوں کا تعلیمی نظام منقسم ہوکر رہ گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ سرکاری اسکولوں اور کالجوں نے علوم دینیہ سے بیگانگی کا رویہ اختیار کرکے خالصۃً جدید علوم وفنون کی ترویج وتعلیم کو ہی اپنا محور ومقصد قرار دیا اور دینی مدارس نے جدید مروجہ علوم سے قطع نظر کرکے دینی علوم اور اس کے مقتضیات ہی کی تعلیم وتعلم کے لئے خود کو وقف کرلیا اور ہندوستان کے علماء کو خالص دینی مدارس کی ترویج وترقی اور اپنے پرانے طریقے کی بقاء کی کوششوں پر مجبور ہونا پڑا'' (۱)

ید وقدیم طبقے کو قریب لانے کی کوششیں

مذکورہ بالا دونوں طبقات کو قریب لانے کی کچھ کوششیں شروع ہوئیں، ان میں
، بعض کوششیں اختیاری طور پر اور سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کی گئیں، جب کہ بعض
نششیں ایسی تھیں کہ حالات نے دونوں طبقوں کو قریب آنے پر مجبور کیا، بہرکیف کوششیں

ہماری تعلیم نظام: ۷۷

ی بھی طور پر ہوں، تقسیم ہند سے پہلے کے تاریخی حالات کا تجزیہ کر کے یہ ضرور کہا جا سکتا
، کہ یہ کوششیں چار سطح پر ہوئیں۔

ی سطح: دونوں طبقوں کے تعلیمی اداروں کے فارغ التحصیل طلباء کا تبادلہ واشتراک عمل:

''دار العلوم دیوبند'' اور ''علی گڑھ یونیورسٹی'' دونوں مسلمانوں کے دین اور ان کی
ہم میں برطانوی مداخلت کے رد عمل میں ظہور پذیر ہوئے تھے اور مختلف الجہت ہونے کے
ث ان میں رقابت کا رشتہ بھی تھا، مگر دونوں اداروں کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس رہا، ان کی
ریں ان کی اپنی کمزوریوں پر مرتکز رہیں اور دونوں اداروں نے ان کمزوریوں کے ازالے
، لئے منصوبہ بندی کی اور ایک دوسرے سے معاونت طلبی میں بھی گریز نہیں کیا، ''علی گڑھ
یورسٹی'' کی سیکولر تعلیم پر تنقید ہوئی تو سرسید نے علی گڑھ میں دینیات کی تعلیم اہل دیوبند
، حوالے کر دی جب کہ ۱۹۰۶ء میں دار العلوم دیوبند کے صدر مدرس شیخ الہند مولانا محمود
ن نے ''علی گڑھ کالج'' سے یہ معاہدہ کیا کہ دونوں ادارے ایک دوسرے کے طلبہ کی تعلیم
، لئے خاص انتظام کریں گے ''دار العلوم دیوبند'' سے کچھ فارغ التحصیل طلبہ ''علی گڑھ
یورسٹی'' بھجوائے جائیں گے جنہیں وہاں انگریزی کی تعلیم دی جائے گی اور علی گڑھ سے
یزی خواندہ طلبہ ''دار العلوم دیوبند'' جا کر علوم اسلامیہ کی تعلیم پائیں گے۔

ری سطح: سیاسی وتحریکی پلیٹ فارموں پر مشترکہ مقاصد کے لئے جدوجہد میں شرکت:

مثال کے طور پر ۱۹۲۰ء میں تحریک خلافت کا زور ہوا تو اس تحریک نے علماء
انگریزی تعلیم یافتہ دونوں طبقات کو ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کر دیا اور ان دونوں طبقوں
باہمی کشمکش اور آویزش خود بہ خود ختم ہونے لگی، آپس کے میل جول و باہمی تبادلۂ خیال،
ں اور ملکی سیاست، بین الاقوامی حالات سے واقفیت ان تمام چیزوں کا ایک نہایت اچھا
یہ ہوا کہ ہر طبقہ میں اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کا احساس پیدا ہو گیا۔

ری سطح: دینی اور دنیوی علوم کی پیوندکاری والی درسگاہوں کا قیام:

دنیوی علوم کے ساتھ دینی علوم کی پیوندکاری کی آواز کبھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے
ہ سے اٹھی کہ مسلمانوں کو مغرب کی خالص تقلید نے ایک نہایت خطرناک راستہ پر ڈال

ہے، ان کے نصاب تعلیم میں اسلامیات و دینیات کو غیر معمولی اہمیت ہونی چاہئے
ب کہ دوسری طرف علماء کرام کے طبقہ سے بارہا یہ سننے میں آیا کہ مدارس عربیہ کے
ب تعلیم سے قدیم فلسفہ یونان وغیرہ ایسے غیر ضروری مواد کو خارج کر کے اس کی جگہ
ید علوم عصریہ کو شامل کرنا چاہئے۔

علی گڑھ یونیورسٹی کے حلقہ میں اصلاح کا جو نعرہ بلند ہوا تھا اس نے جامعہ ملیہ کی
ں میں جنم لیا اور دوسری جانب اصلاح نصاب عربی سے متعلق علماء کرام کے جو خیالات
، وہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے محسوس پیکر میں ظاہر ہوئے، اب اس وقت یہی چار ادارے یا
کے طرز پر قائم درسگاہیں مسلمانوں کی تعلیم کے مرکز یا ادارے سمجھے جاتے ہیں۔

- خالص دینی درسگاہ دار العلوم دیوبند اور اس کی طرز پر قائم دینی مدارس کا جال۔
- خالص دنیوی درسگاہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور اس جیسے دیگر اسکول و کالج۔
- دینی درسگاہ مگر کچھ دنیوی علوم کا پیوند ندوۃ العلماء لکھنؤ
- دنیوی درسگاہ مگر کچھ دینی علوم کا پیوند جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی۔

ی سطح: دعوت و تبلیغ کے حوالہ سے "تبلیغی جماعت" کے پلیٹ فارم پر اشتراک عمل:

اگرچہ اس سطح پر اشتراک عمل کا تعلق خالصۃً تعلیمی بنیادوں پر یا درسگاہوں کے
ن کسی معاہدہ کے تحت یا ایک دوسرے کے نصاب کے مواد آپس میں ضم کرنے
شترک کرنے سے نہیں تھا؛ لیکن پھر بھی دونوں طبقہ کے تعلیم یافتہ افراد جب دعوت کی
ت سے ایک جگہ جمع ہوئے تو قدیم و جدید کو آپس میں ایک دوسرے کو خوب سمجھنے،
ھنے، پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے اور سمجھانے کا موقع ملا، بہت سی نفرتیں دور ہوئیں،
یں سلجھ گئیں، تبلیغ سے منسلک جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں اپنے بچوں کو دینی مدارس میں
نے کا رجحان جب کہ دوسری طرف طبقۂ علماء نے دعوت و تبلیغ کی نسبت سے جدید تعلیم
حضرات سے مشاورتی اور پیشہ وارانہ خدمات حاصل کیں۔

البتہ ان کوششوں کے ثمر آور (friuitful) ہونے اور نتیجہ خیز ہونے کے متعلق
رسا منصفانہ تجزیہ کیا جائے تو معذرت کے ساتھ یہ کوششیں بھی تعلیمی نظام کی وحدت

، قیام اور علوم کی جدید وقدیم کی طرف اور اسلامی اور غیر اسلامی کی تفریق اور مسٹر وملاّ
، درمیان خلیج کو ختم نہیں کرسکیں، اس کی وجوہات یہ ہیں جس سے کسی کو اختلاف بھی
لکتا ہے؛ لیکن زمینی حقائق یہی ہیں کہ:

پہلی سطح یعنی فارغ التحصیل طلبہ کا ایک معاہدہ کے تحت اور ایک نظم کی شکل میں
لہ قرار نہیں رہ سکا، جب کہ دوسری سطح یعنی تحریک کے نتیجے میں حادثاتی طور پر جو
ذاک عمل قائم کردیا۔

جہاں تک تیسری سطح کا تعلق ہے تو حقیقت واقعہ یہ ہے کہ ندوۃ العلماء اور جامعہ
اپنی عمارتوں کی شکل سے نہیں نکل سکے، یعنی نہ تو ان دونوں اداروں کے بانیوں نے اس
ز پر دوسرے مثالی ادارے قائم کئے اور نہ ہی ان دونوں اداروں کے فارغ التحصیل طلباء
، اس محنت اور جد وجہد مسلسل سے اس فکر کے حامل تعلیمی ادارے برصغیر کے کونے
نے میں قائم کئے جیسے کہ دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل طلباء نے دینی مدارس قائم
؛ جب کہ علی گڑھ یونیورسٹی کی فکر کے حامل طلبہ نے اسکول وکالج اور جدید یونیورسٹیوں
، نام قائم کئے؛ بلکہ ایک نیٹ ورک قائم کردیا۔

جہاں تک چوتھی سطح کا تعلق ہے وہ کوشش یقینی طور پر بحیثیت مجموعی نہایت کامیاب
ں؛ لیکن یہ کوشش عوامی سطح پر بالغان کے لئے تھی اور کسی ایسے تعلیمی نظام کے تصور کو پیش
ں کرتی جس کو لائحہ عمل کے طور پر رکھتے ہوئے اس کی بنیاد پر کچھ ماڈل مدارس واسکول
م کرلئے جائیں؛ بلکہ تبلیغی جماعت کی سرگرمیوں میں درکار ''وقت نکالنے'' سے شروع
ا تھا اور اس کے لئے بالغ ہونا ضروری ہے جب کہ تعلیمی ادارے میں قیمتی وقت تو
پن اور نو جوانی یا قبل از بلوغ کا ہوتا ہے۔

لہٰذا کم سن طلباء وطالبات جن کو نہ تبلیغی جماعت والے کرتے تھے، نہ دینی مدارس
لے کہ وہ ان مطلوبہ عمر کو پہنچے ہوئے ہوتے تھے اور ان کی تعلیم کے لئے ان کے پاس کوئی
لہ اور لائحہ عمل نہیں تھا کہ اسکول والے اپنے تعلیمی اداروں میں داخلے کی ترغیب کے لئے
ِی حد کم سے کم کرتے جارہے تھے؛ یہاں تک کہ اب ڈھائی سال کے بچے کو بھی

ابطہ اسکول (مونیٹری) میں داخلہ دیا جاتا ہے۔

چنانچہ کم سن طلباء وطالبات کی تعلیم کا ایسا نظام ابھی تشنۂ تعبیر تھا جو ان کو دینی دنیوی علوم بھی پڑھائے اور ان کی تربیت بھی اسلامی فکر واسلامی ذہنیت اور اسلامی ارو ماحول کے سایہ میں ہو اور وہ لارڈ میکالے کے اس فلسفہ کو پلٹ کر ایسا تصور پیش یں کہ:

''ایک ایسی قوم تیار کی جائے جو رنگ ونسل کے اعتبار سے ہندوستانی ہو یا انگلستانی، جرمن ہو یا آسٹریلین، جاپانی ہو یا چینی، افریقن ہو یا امریکن؛ لیکن اپنی ذہنی سوچ، اپنی وضع وقطع، اپنے اخلاق وکردار میں اسلامی سانچے میں ڈھلی ہوئی ہو''۔

اور بالخصوص یہ اسلامی ماحول، تعلیمی اداروں میں بالکل ابتدائی عمر سے فراہم کیا ئے۔

مدارس اور اسکول وکالج میں زیر تعلیم طلباء کا تناسب

مذکورہ بالا نوعیّتوں کے جن تعلیمی اداروں کا ذکر آیا، درحقیقت ان میں دو تعلیمی ے یعنی دارالعلوم دیوبند اور علی گڑھ یونیورسٹی کی طرز پر قائم دینی مدارس اور اسکولوں بجوں کا ایک نیٹ ورک اس کا سروے کیا گیا تو پتہ چلا:

''ان دونوں نیٹ ورک میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کو اعداد وشمار کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اس کا ایک محتاط تناسب یہ بنتا تھا کہ ایک ہزار میں سے ایک طالب دینی مدرسہ میں زیر تعلیم ہوتا تھا، جب کہ ۹۹۹ طلباء اسکولوں اور کالجز کے نیٹ ورک سے منسلک ہوتے تھے اور ان ایک فی ہزار میں بھی شہری ومقامی طلباء کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی یا آٹے میں نمک کے برابر''۔

یہ تو اس نیٹ ورک کا حال تھا جو دارالعلوم دیوبند کی طرز دینی مدارس کی نمائندگی تا تھا جب کہ اسکولوں اور کالجوں کے نیٹ ورک میں جو علی گڑھ یونیورسٹی کی نمائندگی

ے تے تھے (کاش کہ وہ علی گڑھ یونیورسٹی کی نمائندگی کر رہے ہوتے تو اتنا غم نہ تھا) لیکن قیقت اس نیٹ ورک کا نظام مکمل طور پر سیکولر بن گیا تھا سوائے اسلامیات کے ایک مون کے جو ایک مضمون سے زیادہ تفریح طبع کا باعث بنا ہوا تھا اور لارڈ میکالے کے صد کو پورا کر رہا تھا (جو اس نے ۱۸۵۳ء کی اپنی یاداشت میں بیان کیا تھا) اس میں طلباء ایک کثیر تعداد زیر تعلیم تھی۔

ں طبقات کے متضاد خیالات وافکار کا ایک منظر

تعلیم یافتہ ہونے کا دعوی کرنے والے دونوں طبقات کے درمیان خیالات وافکار ے اعتبار سے جو فرق تھا اور ہر طبقہ اپنے گروہ کی نمائندگی کرنے اور دوسرے گروہ کے ملق تبصرہ کرنے میں جو جارحانہ رویہ رکھتا تھا، اس کا ایک منظر مولانا سید مناظر احسن یلانی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

”تعلیم کے دو مستقل سلسلے ایک ساتھ ملک میں جاری ہیں، ایک طرف جوامع وکلیات یونیورسٹیوں اور کالجوں کی تعلیم اور ان کے تعلیم یافتہ حضرات ہیں اور دوسری طرف دینی مدارس ومکاتب اور ان کے پڑھے ہوئے علماء وفضلاء ہیں، ہر ایک دوسرے کے علم اور دوسرے کے نقطۂ نظر سے ناواقف ہیں اور ان کو ناواقف بنا کر رکھا گیا ہے؛ لیکن اسی کے ساتھ علم کا دعوی دونوں کو ہے، عوام ان کے ہاتھوں میں فٹ بال کی گیند بنے ہوئے ہیں، ایک نہ ختم ہونے والی کشمکش ہے جو جاری ہے، ایک صماء، بکماء، عمیاء فتنہ ہے، اس کے مفاسد دن بہ دن بڑھتے چلے جارہے ہیں کہ وہ کس کا ساتھ دیں، کس کی بتائی ہوئی راہوں پر چلیں، مولوی جب ان کے پاس آتے ہیں تو جدید تعلیم یافتوں کی مغرب زدگیوں، دینی بے باکیوں، غلامانہ ذہنیتوں کا ماتم کرتے ہیں، ان کی منڈی ہوئی داڑھیوں، بود وباش کے یورپین طریقوں کو شہادت میں پیش کر کر کے محمد رسول اللہ ﷺ کی امت کے دلوں میں ان کی نفرت کا بیج بوتے ہیں، ان کا مذاق اڑاتے

ہیں، بھری مجلسوں میں انہیں منبر و محراب سے رسوا کرتے ہیں۔

اور یہی حال جدید تعلیم یافتوں کا ہے کہ مولویوں کی قدامت پرستیوں، تنگ نظریوں، غربت کی وجہ سے ان کی پست زندگی کے نمونوں پر فقرے کستے ہیں، ان پر چھچھوری حرکتوں کا الزام لگاتے ہیں، مسلمانوں کو معمولی جزئی غیر منصوص مسائل پر طیش دلا دلا کر لڑانے کا انہیں مجرم ٹھہراتے ہیں۔

ایک طبقہ عوام کی گردنیں پکڑ کر آگے کی طرف دھکیل رہا ہے، دوسرا ان ہی بیچاروں کا دامن پکڑ کر پیچھے کی طرف گھسیٹ رہا، نتیجہ یہ ہے کہ علم کے دونوں نمائندے گھر کی اس منحوس لڑائی میں ذلیل و رسوا ہو رہے ہیں، نہ ان کا اثر قائم ہوتا ہے، نہ ان کی بات چلتی ہے، مسلمانوں کو نہ دین پر عمل کرنے کا موقع ملتا ہے، نہ دنیا میں آگے بڑھنے کی توفیق میسر آتی ہے۔

اور سچ تو یہ ہے کہ دنیا اگر مسلمانوں کی برباد بھی ہو جائے تو اس سے تسلی مل سکتی تھی کہ دین تو ان کا باقی ہے، لیکن آج تعلیم کے ان دو مختلف الجہت نظام کے مختلف نتائج نے جو صورت حال پیدا کر دی ہے، اس کا آخری انجام یہ دیکھا جا رہا ہے کہ غیر شعوری طور پر مسلمانوں کے اندر (العیاذ باللہ) دین کی نفرت پرورش پا رہی ہے اور جن کی رسائی ہے جب انہیں کا اقتدار عوام کے قلوب سے مٹ رہا ہے تو کیا بات صرف انہی لوگوں تک محدود ہو کر رہے گی؟ دین کے عالموں کی رسوائی یقین مانئے خدانخواستہ اگر اس کا سلسلہ یونہی جاری رہا تو (لا فعلہ اللہ) ایسا معلوم ہوتا ہے کہیں خود دین کی رسوائی پر اس ناپاک تحریک کا خاتمہ نہ ہو، خاکم بدہن خدانخواستہ اگر ایسا ہوا اور جو حالات ہیں ان کو دیکھتے ہوئے کیا کہا جا سکتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے، تو اس کا الزام صرف ایک ہی طبقہ پر ہوگا؟

مصیبت کا احساس سب کو ہے، لیکن اس کا علاج کیا ہے؟ کیا اسکولوں اور کالجوں کے نام نہاد دینیات کے کورس کے اضافہ سے اس مصیبت کا

خاتمہ ہو جائے گا، یا پھر عربی تعلیم گاہوں میں انگریزی چند ریڈرس یا روشن خیال مولویوں کے نزدیک جس چیز کا نام سائنس ہے، اس مولویانہ سائنس کی تعلیم کا دینی مدارس میں اجراء اس مرض کا علاج ہے؟۔جس سوراخ میں بار بار ہاتھ دینے کے بعد بچھوؤں کے ڈنک کے سوااور کسی چیز کا تجربہ نہ ہوا، اسی سوراخ میں بار بار ہاتھ دیے چلا جانا اور تب نہیں تو اب کی جھوٹی امیدوں میں تسلی ڈھونڈنا، کیا ایمانی عقل اس پر راضی ہوسکتی ہے؟ آزمائی ہوئی تدبیروں کے آزمانے کا آخری نتیجہ اور کیا ہوسکتا ہے؟ مرض کے اسباب کی غلط تشخیص اوراسی غلط تشخیص کی بنیاد پر مریض کا جو غلط علاج ہو رہا ہے، اہل بصیرت اس تماشے کو تقریبا پون صدی سے دیکھ رہے ہیں اور دل ہی دل میں کڑھ رہے ہیں:

خوشی ہے سب کو کہ آپریشن میں خوب نشتر یہ چل رہا ہے
کسی کو اس کی خبر نہیں ہے مریض کا دم نکل رہا ہے

میرے نزدیک تو ان ساری تباہ کاریوں اور بربادیوں کے انسداد کی واحد تدبیر کوئی نئی تدبیر نہیں ؛ بلکہ نظام تعلیم کی وحدت کا قدیم اصول ہی ہوسکتا ہے، ہمیں کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے ؛ بلکہ بزرگوں کے سینکڑوں ؛ بلکہ اب تو ہزار سال بھی کہا جاسکتا ہے، الغرض اتنے طویل تجربوں کے بعد تعلیم کی جو راہ بنادی تھی اگر اسی راہ پر پھر غور کیا جاتا تو میں سمجھتا کہ موجودہ مشکلات کے حل کی راہ اسی سے پیدا ہوسکتی تھی'' (۱)

اسی نقطۂ نظر کی دعوت دیتے ہوئے حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ اپنی ٖاب ''ہمارا تعلیمی نظام'' میں اس سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

''قیام پاکستان کے بعد علماء کو توقع تھی کہ ایک آزاد اسلامی مملکت کے لئے ایک جدید ترین نظام تعلیم یقیناً مرتب کرلیا جائے گا جو کہ قدیم وجدید

پاک وہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت: ۲۵۳-۲۵۵

دونوں نظامہائے تعلیم کو یکجا کر کے خالص دینی بنیادوں پر مرتب ہوگا جس میں دین و دنیا دونوں کے علوم کو متناسب مقدار میں جمع کیا جائے گا؛ مگر صد افسوس کہ پاکستان اپنے قیام کے اول روز سے ہی مسلسل سیاسی بحرانوں اور شدید اقتصادی مشکلات میں گھرا رہا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسی کو یہ مہلت ہی نہ مل سکی کہ جدید و قدیم نظام تعلیم کو یکجا کر کے ایک متفقہ جدید نظام تعلیم ترتیب دیا جا سکتا، چنانچہ دینی مدارس میں آج بھی وہی نظام تعلیم معمولی تغیر کے ساتھ رائج ہے جو ہندوستان میں مسلمانوں کے ہاں رائج چلا آرہا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں آج بھی دو متوازی نظام تعلیم رائج ہیں، ایک تو وہ نظام ہے جو سرکاری اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں رائج ہے جس میں دین کی بعض بنیادی باتوں کی زیادتی کر کے خالصتاً جدید علوم کی تعلیم دی جاتی ہے اور دوسرا نظام ان قدیم طرز کے دینی مدارس میں جاری ہے جس میں معمولی ترمیمات کے ساتھ درس نظامی ہی کو پڑھایا جاتا ہے"(۱)

ا نظریہ وحدتِ تعلیم

جب ان احوال کے پیش نظر یہ طئے پایا کہ ایک دین و دنیا اور دینی و عصری تعلیم کا ۔ جامع نصاب ایسا مرتب کیا جائے کہ یہ ملا اور مسٹر کی تفریق ختم ہو جائے۔ سب سے دہ زیر غور امر یہ تھا کہ بچوں کو کس عمر سے داخلہ لیا جائے، موجودہ مدارس اور قدیم ولس میں تو چھ سال سے کم بچی/اور بچے کے داخلہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی، لیکن موجود لراسکولوں میں سوچی سمجھی اسکیم کے تحت کم عمر بچوں اور بچیوں کو داخلہ دلانے کا رجحان ستا جا رہا ہے، اس کے لئے مختلف ترغیبات دی جاری ہیں، اس کا مقصد سوائے اس کے ہ نہ تھا کہ جس خام مال کو اپنے سانچے میں ڈھالنے اور اپنے نقوش ثبت کرنے کے لئے پھر اس کی (finishing) آخری تزئین و آرائش کے لئے چھ سال کی عمر سے محنت کی

ہمارا نظام تعلیم: ۸۷-۹۷

ں تھی، اس محنت کو دوسال کی عمر سے شروع کر دیا جائے؛ تا کہ جولوگ (بلکہ اس زمانہ
ں میں کثیر تعداد یہی کرتی تھی) گھروں میں بچوں کو رکھ ۶ر سال کی عمر میں قدیم یا جدید
یم کا سلسلہ شروع کراتے تھے، ان بچوں کونفسیاتی طور پر اپنے رنگ میں ایسا رنگا جائے
، باوجود والدین کی خواہش کے، بچے وہ راستہ اختیار کریں جو سیکولر نظام تعلیم چاہتا ہے
بچوں کے رجحان کو دیکھ کر والدین بھی اسی راستہ کو اختیار کرنے پر مجبور ہوں، واضح
ہے کہ ماہر نفسیات کی تحقیق کے مطابق ۵ر سے ۶ر سال کی عمر تک بچوں کے مزاج
نفسیات کے بہت سے پہلو مکمل ہو جاتے ہیں اور اس عمر کے بہت سے نقوش ایسے ثبت
تے ہیں کہ جن کے اثرات زندگی کے آخری مراحل تک نہ صرف قائم؛ بلکہ مزید توانا
تے چلے جاتے ہیں۔

گو کہ اس مرحلہ پر تعلیم کے کئی مثبت پہلو بھی تھے، لیکن ان تمام پہلوؤں میں پردہ
ں پہلو غالب تھا کہ لارڈ میکالے کے مقاصد کے تحت قائم یہ ادارے ان نوخیز ذہنوں
، سفید و بے داغ کاغذ پر مغربی طرز معاشرت کے اولین نقوش ثبت کر رہے تھے،
ٹے بچے اور بچیاں غیر شعوری طور پر اسی سانچے میں ڈھل رہے تھے، بلکہ جو ادارہ جس
ر مغرب کی نقالی اور مغربی طرز معاشرت کے ایٹی کیٹس سکھانے میں پیش پیش ہو، اس کو
ں قدر معیاری اور ماڈل اسکول سمجھا جاتا تھا۔

ایک عجیب لطیفہ یہ کہ اس دور میں ''مونٹیسری'' طرز کی تعلیم کی دھوم تھی اور اس کی
ہیر اس انداز میں کی جاتی تھی کہ یہ اعلیٰ ترین ذہن کے حامل بچوں کے لئے ایک
یڈیل طریقۂ تعلیم ہے یا اس طریقۂ تعلیم کے ذریعہ آپ کا بچہ ذہانت کے اعلی معیار پر پہنچ
ئے گا، جب کہ دوسری طرف اس طرز تعلیم کی بانی ''مادام مونٹیسری'' کے حالات اور اس
، طریقۂ تعلیم کی وضاحت جو خود انہوں نے کی ہے وہ یہ ہے کہ: یہ جدید طریقۂ تعلیم ان
پیشل بچوں'' کے لئے ہے جن کی ذہنی سطح (metal level) کم ہوتی ہے، جن کے
ے مشاہداتی آلات اور ساز و سامان (visual aids) کے ذریعہ تعلیم دینے کا تصور
، تا کہ کند ذہن اور حافظہ و یادداشت کے کمزور بچے بآسانی چھوٹی موٹی چیزوں کے نام

دیر کو دیکھ کر یاد کرلیں، جب کہ K G کنڈرٹن جس میں مشاہداتی کے بجائے
اشت اور غیر مرئی تعلیمی وسائل کے ذریعہ سے تعلیم دینے اور یاد کرانے پر زور ہے؛
ن غیر واقعاتی ترغیبات اور خیالی اشتہارات میں اس قسم کے اداروں اور ان کے پس
ہ کام کرنے والے ذہنوں کو بڑی مہارت ہوتی، وہ بدنما چیز کو خوشنما اور خوشنما کو بدنما
از میں پیش کرنے میں ماہر ہوتے ہیں۔

ل ازابتدائی تعلیم شعبے (pre-primary education)

day care cent

جس کو نئی اصطلاح میں (play group) بھی کہا جاتا ہے، اس میں ڈیڑھ
ں تک کے بچے داخل کئے جاتے ہیں، بنیادی طور پر یہ شعبہ ملازمت پیشہ خواتین کے
ں کے لئے دن گذارنے اور ان کی دیکھ بھال کے لئے مختص ہوتا ہے، جب کہ بعد میں
ں کی یہ تخصیص نہیں رہی؛ بلکہ جو خواتین جس قدر فارغ ہیں، ان کا اس قسم کے (day
care cent) میں بچوں کو داخل کرانے کا رجحان اسی قدر زیادہ ہے اور آج کل
satus symbo) شمار ہوتا ہے۔

یسری

اس میں عموماً ڈھائی سال تک کے بچوں کو داخلہ دیا جاتا اور اس میں تدریس کے
ۓ مونٹیسری وسائل کی تعلیم (montessori apparatus) اور بعض مرتبہ غیر
یسری وسائل تعلیم (non montessori apparatus) استعمال کئے
تے ہیں۔

ری:

اس شعبہ میں عموماً ساڑھے تین سال سے پانچ سال تک کے بچوں کو داخلہ دیا جاتا،
ں میں زبانی یاد کرانے اور معمولی سا لکھانے کا کام بھی کرایا جاتا ہے۔

،،جی:

اس شعبہ کو اگر یہ کہا جائے کہ یہ دراصل بچے کی اسکول کی تعلیم کے شروع کرانے

، لئے پل کا کام دیتا ہے تو غلط نہ ہوگا۔

الغرض جدید طبقہ نے قبل از ابتدائی تعلیم pre-primary education
، ذریعہ جو نظام رائج کیا، اس میں یقیناً بہت سے مثبت پہلو تھے؛ لیکن منفی پہلوؤں کا بھی
نے کسی قدر تفصیل سے تذکرہ کیا ہے جو کہ ان مثبت پہلوؤں پر غالب تھے اور پوری
بی فضا کو غیر اسلامی ثقافت اور خالص مغربی ذہن کے مطابق پروان چڑھایا جارہا تھا،
نچہ قبل از ابتدائی تعلیم کے مرحلہ میں دو تا تین سال تک یہ بچے اس ماحول میں تعلیم
مل کرتے تھے تو پھر پانچ یا چھ سال کی عمر میں ان کا حفظ قرآن کی طرف راغب ہونا تو
ر کی بات ہے؛ بلکہ اس حفظ قرآن سے برگشتہ کرنے کے تمام نفسیاتی حربے استعمال
ے جاتے، حفظ قرآن کی طرف راغب ہونا دور کی بات ہے؛ بلکہ حفظ قرآن سے برگشتہ
نے کی تمام نفسیاتی حربے استعمال کئے جاتے ہیں، ادھر دینی مدارس یا دینی تعلیمی
روں کے پاس قبل از ابتدائی تعلیم یا قبل از ابتداء حفظ کوئی منظّم تربیتی نظام بچوں کے لئے
ا؛ اس لئے پاکستان میں اس تمام صورتحال کو پیش نظر رکھ "اقراء روضة الأطفال"
تحت اس طریقہ کا منظّم، مربوط، عمر کی قید کے بغیر تربیتی نظام شروع کیا گیا، گرچہ مقصود
آن کا حفظ ہوگا؛ لیکن اس مقصد کے لئے انہوں نے داخلے کے وقت کوئی عمر کی قید نہیں
ں، بلکہ چھوٹے بچوں کا بھی داخلہ لیا، جب تک بچے اور بچیاں حفظ کی عمر کو پہنچتی تو انہیں
امی ماحول وثقافت سے مزین درس گاہ، دلچسپ نصاب اور اسلامی تہذیب وثقافت
، سانچے میں ڈھلے ہوئے اساتذہ ومعلمات فراہم کئے گئے، اس کے لئے ابتداء بیک
ت دو شعبے شروع کئے گئے۔

) شعبہ روضہ: اور اس کے ذیلی شعبے روضہ الف، ب اور ج بھی عمر کے اعتبار سے
طئے ہوئے۔

) شعبۂ حفظ: اور اس کے ذیلی شعبے قاعدہ اور ناظرہ بھی عمر کے اعتبار سے طے ہوئے۔

شعبہ روضہ عموماً ۳ رسال سے ۵ رسال کی عمر کے بچوں اور بچیوں کے لئے ہے، یہ عمر
ں میں تعلیم سے زیادہ تربیت اور مختلف اچھی عادات کو ان میں رائج کرنے کے لئے

ائی اہمیت رکھتی ہے، ماہرین نفسیات کا بھی یہی کہنا ہے، ماہرین نفسیات کی یہ تحقیق تو اپنی
،ہم آنحضرت ﷺ کے درج ذیل دو ارشادات کی روشنی میں کہ ''کل مولود یولد
ں فطرة الإسلام'' (ہر بچہ اسلام کی فطرت پر پیدا ہوتا ہے) اسی طرح آنحضرت ﷺ
یہ ارشاد بچوں کی تربیت کے سلسلہ میں ایک ماخذ اور منبع کی حیثیت رکھتا ہے۔

''كل مولود يولد على الفطرة فأبواه يهودانه أو ينصرانه
أو يمجسانه'' (۱)

''ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے بعد اس کے والدین اس کو
یہودی، عیسائی یا مجوسی آتش پرست (مشرک) بنا دیتے ہیں''

اس لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ ان کو ابتدائی ماحول ایسا فراہم ہو کہ وہ اسلامی
رت پر برقرار رہ سکیں، اس کہ لئے ''اقراء'' کے ذمہ داروں نے درج ذیل ہلکے پھلکے
امین ''شعبہ روضہ'' میں شامل کیے۔ جس میں اسلامیات، دین کے حوالہ سے بنیادی
ئد، ارکان اسلام، اسلامی تاریخ، خصوصا سیرت نبوی ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کی سیرت،
لمہ، مختلف اوقات کی مسنون دعائیں، اخلاقیات میں: اچھے عادات واخلاق پر مشتمل
، زبان یاد کرائے جاتے، اس کے علاوہ عربی زبان کے ہلکے پھلکے جملے سکھائے جاتے
ں میں کچھ الفاظ، ہفتہ دنوں کے نام، اعضائے جسمانی کے نام، کچھ پھلوں جانوروں
لرد وپیش موجود اشیاء کے باتصویر سمجھائے جاتے۔ البتہ اہتمام اس بات کا ہوتا کہ وہ
اویر جاندار چیزوں کی نہ ہوں، اس سے بچوں کے معصوم اذہان عربی زبان کی سحر انگیزی
، متاثر ہوتے، اس میں اردو کے حروف تہجی بھی سکھائے جاتے، اس کے علاوہ بامقصد
ئی اردو نظمیں بھی یاد کرائی جاتیں، اور انگریزی میں بامعنی بامقصد اور اسلامی عقائد
لاق میں سے کسی عقیدہ اور اخلاقی درس پر مشتمل نظمیں یاد کرائی جاتیں۔ الفاظ اور نظموں
، صحیح تلفظ کے لئے سمعی کیسٹ (audio cassette) سے بھی مدد لی جاتی۔

۳/تا ۵/سال کے بچوں کے لئے ایسی خوشخطیاں اور کلرنگ بک ڈیزائن کی گئیں

صحيح البخاري، كتاب الجنائز، باب ما قيل في أولاد المشركين، حدیث نمبر:۱۳۸۵

، میں اول تو اشیاء کی تصاویر جاندار کی نہ ہوں اور دوسرا اہم کام جو زبانی اور تحریری
اب دونوں میں اختیار کیا گیا وہ متعدد اسلامی اصطلاحات اور شعائر پر مشتمل الفاظ کا
ل کرنا تھا، مثلا، نماز، روزہ، خانہ کعبہ (بمع تصویر) گنبد خضراء (مع تصویر) اس کا نتیجہ
وا کہ بچوں کے کان شروع ہی سے ان الفاظ سے مانوس ہوگئے۔یعنی اسلامی ماحول
، وہ تمام طرز اور طریقے اختیار کئے گئے جو اسکول کی مغربی ماحول میں اپنائے جاتے
، ۔اسی طرز پر شعبہ ناظرہ اور قرآن بھی شروع کیا گیا اور مناسب انداز میں دیگر
یزی وغیرہ کے مضامین بھی شامل کئے گئے۔

جب یہ مراحل طئے ہوجاتے تو اس کے بعد بچے کو دینی یا دنیوی تعلیم حاصل کرنے کا
یار ہوتا، اس کے لئے ''اقراء حفاظ اسکول'' کا قیام عمل میں لایا گیا، جس میں حفظ قرآن
تکرار کو برقرار رکھتے ہوئے، کچھ تجوید اور اسلامیات کی تعلیم کو شامل کرتے ہوئے اسکول
علیم دی گئی، اس کے فارغ طلبہ ایسے استعداد کے حامل ہوتے کہ وہ کسی بھی اسکول کے
نم میں داخلہ کے اہل ہوتے اور مدرسۂ عربی کی ابتدائی درجات میں سماجاتے۔

پھر اقراء سکنڈری اسکول کی شروعات کی گئی جس سے نظام تعلیم کی دوئی کا خاتمہ ہو، اس
، حفظ قرآن کے تکرار کے ساتھ زبانوں کی تعلیم دی جاتی جس میں اردو، انگریزی، عربی کی
ریس پر خصوصی توجہ دی جاتی اور ہر زبان کی تدریس کے لئے اس کے ماہرین کو استعمال کیا
ا، اس کے علاوہ سائنس، ریاضی، کمپیوٹر کی تعلیم دی جاتی یہ مرحلہ ششم سے ہشتم تک ہوتا۔

اقراء سکنڈری اسکول کے پہلے مرحلے میں وہ اپنی مرضی سے عصری مضامین کو
یار کرنے طلباء کو اختیار ہوتا، لیکن جب یہ طلبہ جماعت نہم میں پہنچتے ہیں تو وہ متوسطہ
middl) کی سطح سے ثانوی تعلیم کے لیول پر آجاتے ہیں اور یہاں ان کو گروپ
ائنس یا جنرل گروپ اور پھر سائنس میں بھی بائیولوجی یا کمپیوٹر گروپ) کے اختیار،
امین کے تعین، نظام امتحان، وامتحانی پرچوں اور ان کے شیڈول اور طریقہ کار میں
قراء اسکول'' ثانوی تعلیمی بورڈ (میٹرک بورڈ کا پابند ہوتا ہے، لیکن اس کے باوجود اس
لہ پر بھی اقراء اسکول میں چند نمایاں اسلامی مضامین کی تدریس کا سلسلہ جاری رہتا ہے،

ا حفظ قرآن کے اعادہ کا ایک پیریڈ، اسی طرح عربی زبان کی تدریس اور تفسیر وحدیث
تدریس کے لئے ''ریاض الصالحین'' کی تدریس کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اس طرز تعلیم
،نمایاں نتائج کے لئے ''اقراء روضة الاطفال'' سے متعلق کارپورٹ کا مطالعہ تمام
یلات کو واضح کردے اور اس طریقہ کار کی خوبیوں کو واضح کرے گا۔

اسی طرز پر انہوں نے اقراء کالج بھی شروع کیا ہے، اس کے نتائج بھی قابل دید
ں۔اس طرح انہوں نے ملاّ اور مسٹر کی تفریق کو ختم کر کے ''وحدت تعلیم'' کا عملی نمونہ
ں کیا ہے، مدارس کی افادیت کا انکار نہیں؛ البتہ اسکولس اس انداز میں قائم کر کے عصری
م کے ایک بڑے طبقہ کو مغربیت کا شکار ہو رہا ہے ان کو دین سے قریب لایا جاسکتا ہے۔

چونکہ ہمارے ناقص اور محدود مطالعہ کے مطابق وحدتِ علم والے نقطہ نظر کو عملی جامہ
انے میں روضة الاطفال کے ادارے نے جتنی شاخیں بڑھائیں اور جتنے افراد
لے اتنا کام کسی اور نے نہیں کیا (لیکن یہ ادارہ پاکستان میں چلتا ہے) اس لئے ہم نے
ں کے نظام کو بالتفصیل نقل کیا ہے۔

حضرت مولانا خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی نقشبندی بھی دار العلوم امام ربّانی میں اسی
ۂ نظر کے داعی ہیں، ظاہر ہے کہ یہی محنت عصری علوم کے متشرع ماہرین اور صاحب
ن ربانی علماء کے باہمی تعاون اور دوش بدوش کام کرنے کو چاہتا ہے۔

حضرت مولانا خود اپنے اس سلسلہ میں مدعا کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

''حضرات! دور حاضر میں ہماری امت کو دو طرح کے افراد کی شدید ضرورت ہے:
اولا ایسے علمائے دین کی جو ایک طرف تو تقوی وطہارت، اخلاص وللّٰہیت، علم کی
گہرائی اور عمل کی پاکیزگی میں اکابر واسلاف کا نمونہ اور ان کے ذوق ومزاج کے
امین ووارث ہوں اور دوسری طرف اپنے زمانے اور گرد وپیش کے مزاج کو
اور جدید تعلیم یافتہ طبقے بالخصوص نوجوانوں کی الجھنوں اور نفسیات کو اچھی طرح
سمجھتے ہوں اور ان سے ان کی زبان میں بات کرسکتے ہوں، نیز اسلام کو اس طور پر
پیش کرسکتے ہوں کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں سے تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی اسلام کے

دین فطرت اور مسائل زندگی کے واحد حل ہونے کا یقین حاصل ہو جائے، ساتھ ہی ان (علماء) کے دل ودماغ ومزاج پر بگڑے ہوئے معاشرہ کے لئے غصہ اور نفرت کے بجائے داعیانہ ہمدردی اور خیر خواہی کے مثبت جذبات کا غلبہ ہوا اور وہ محبت اور دل سوزی کے ساتھ نہ صرف مسلمانوں؛ بلکہ پوری ملکی اور انسانی برادری کے سامنے بھی اسلام کا محبت بھرا پیغام اچھے سے اچھے انداز میں، زبان قال اور زبان حال سے رکھ سکیں۔

- ثانیاً ہماری ایک قومی ضرورت یہ بھی ہے کہ قانون، انتظامیہ، سول سروسز، دفاع، صحت، تعلیم، اقتصادیات، صحافت، ادب، سائنس، انجینیر نگ، صنعت وحرفت، تجارت...ان سب شعبوں میں جانے والے لوگ ''مسلمان'' بن کر وہاں جائیں اور اپنے اپنے دائرہ عمل میں وہ اسلام کی نمائندگی کریں، وہ ان شعبوں کی فنی مہارت کے ساتھ ایمان داری ودیانت داری اور جذبۂ خدمت کے لحاظ سے اپنی الگ پہچان رکھتے ہوں ان کا پختہ عقیدہ ہو کہ ان کی یہ پیشہ وارانہ مشغولیت صرف مال کمانے کا ذریعہ نہیں؛ بلکہ وہ ان کے لئے خدمت خلق، دعوتِ دین اور رضائے الٰہی کے حصول کا بھی ذریعہ ہے، دار العلوم امام ربانی دراصل ان دونو قسموں کے افراد کو تیار کرنے کے لئے قائم کیا گیا ہے، اس کا نصابِ تعلیم، نظام تعلیم وتربیت، قیام وطعام، لباس اور رہن سہن کا نظام، ۲۴ گھنٹے کا نظام الاوقات، کھیل کود اور ورزش وغیرہ کا نظام سب کچھ اسی نصب العین کو پیش نظر رکھ کر مرتب کیا گیا ہے اور خوب سے خوب تر کی تلاش کا عمل بھی مسلسل جاری ہے، ہمارے پیش نظر یہ ہدف بھی ہے کہ دینی علم کا حصول صرف غریب اور نادار اور دیہاتی گھرانے کے بچوں کا فرض نہیں ہے، خوش حال اور روشن دماغ گھرانوں کے بچوں کو بھی قرآن وحدیث کے علم سے اپنے دل ودماغ کو منور کرنے کا موقع ملنا چاہئے....(عقل مندوں کے لئے اشارہ کافی ہے)''۔(۱)

ماہنامہ الفرقان لکھنو مارچ ۲۰۱۴ء، جمادی الاول ۱۴۳۵ھ

ر انقطۂ نظر: عصری تعلیم دینی ماحول میں

آج امت مسلمہ میں ایک طرف عصری علوم کا رجحان بھی بڑھا اور دوسری طرف
، کے نقصانات کا ادراک بھی ہوا، تو ایسے اسکولس قائم ہورہے ہیں جس میں ناظرہ
ٰن، اذکار نماز اور اخلاقیات کا ایک گھنٹہ رکھا جاتا ہے، اور حتی الامکان اپنے اسٹاف کو
ِدشرع کا پابند بنایا جارہا ہے، وقتاً فوقتاً ملکی حالات کے اعتبار سے ممکنہ گنجائش سے فائدہ
تے ہوئے اپنا نصاب تیار کرنے کی فکر بھی ہورہی ہے، کبھی کبھی اہل اللہ کو بلا کر ذہن وفکر
پرورش کی جارہی ہے، اس سلسلے میں بڑا اہم کام تسہیل سیریز کا ہے جو آفریقہ والوں نے
م دیا، ذی روح تصویروں سے احتیاط کی گئی اور ڈرائنگ، ریاضی کو اسلامی مزاج کے
بق پیش کیا گیا، انگریزی زبان نہایت معیاری رکھی گئی، طباعت بھی نہایت اعلیٰ ہے،
ید، فقہ، عقائد، اخلاق اور تاریخ کا احاطہ کیا گیا، بڑے خاصے اہمیت کی چیز ہے، دوسرا کا
ں سلسلے میں ''اہم چیریٹیبل ٹرسٹ'' (ممبئ) دینیات والوں کا ہے، گہرے تجربے کے بعد
ں نے پرائمری وسکنڈری، ایام تعلیم وایام تعطیل کے لئے مکتب اور اسکول، کالج کے طلبہ
لبات کے لئے ہلکا پھلکا، نہایت مرتب، دیدہ زیب، منظّم نصاب تیار کیا ہے، تیسرا کام
ِ سلسلے میں مولانا الیاس ندوی بھٹکلی کا ہے، انہوں نے اسلامیات کے نام سے دس سالہ
ِیز کو ترتیب دیا، جس میں ان سارے مضامین، تاریخ، تجوید، اخلاقیات، عقائد کا احاطہ
گیا۔ ہماری معلومات کے مطابق اتنا ہی کام سامنے آیا، باقی اور بھی کام ہوئے ہوں گے
ناً یہ کام مزید ردوبدل اور تجربات کے باہمی تبادلے کا متقاضی ہے۔

بلاشبہ اس سلسلہ میں مولانا غلام محمد صاحب وستانوی وستانوی بانی ومہتمم جامعہ اسلامیہ
عت العلوم، اکل کواں، نندربار، مہاراشٹر کی غیر معمولی اور نمایاں خدمات ہیں، حضرت نے اس
ِ پر بہت سے اسکول اور کالجس قائم کئے؛ بلکہ اب یونانی میڈیکل کالج کے بعد ایم بی ایس
لج بھی کھول چکے ہیں، حضرت کا مطمحِ نظر یہی ہے کہ دینی ماحول میں عصر ابتدائی، ثانوی اور اعلی
ٰ تعلیم دی جائے، اس سلسلہ میں حضرت نے جو پیش رفت فرمائی ہے، اتنا بڑا کارنامہ موجودہ
نے میں کسی نے انجام نہیں دیا، فجزاه الله أحسن الجزاء وحفظه الله ورعاه۔

ر انقطۂ نظر: دینی اقامت گاہوں کا قیام:

کم سے کم درجے میں امتِ مسلمہ کو یہ آسان حل اپنا لینا چاہئے کہ ہندوستان کے ف صوبہ جات سے آئے ہوئے طلبہ کے مسلم ہاسٹلس کا قیام عمل میں لایا جائے، مختلف ہوں میں تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ سستے اخراجات کم فیسوں میں طلبہ کے لئے کرایہ ، مکان فراہم کئے جائیں اور اس میں ایک مربی عالم دین کو نگران طئے کیا جائے ، طلبہ میں دعوت وتبلیغ کی محنت کا رنگ چڑھایا جائے ؛ تاکہ ان کے دین وایمان کی ظت ہوسکے ، یہ حل بہت آسان بھی ہے ، مالیاتی اعتبار سے کم بوجھ والا ہے ، قلیل نتعداد لوگ بھی اس کو انجام دے سکتے ہیں ، مغربی ممالک میں مقیم طلباء تو اسکے بہت دہ ضرورت مند ہیں۔

ظامیہ کی خدمت میں کچھ اہم گذارشات:

چاہے وحدتِ تعلیم کا نقطۂ نظر ہو، یا عصری ماحول میں دینی تعلیم کے اسکولس ہوں یا دینی اقامت گاہوں یعنی مسلم ہاسٹلس کا قیام، جیسے انتظامیہ یہ چاہتی ہے کہ طلبہ کو شریعت کا پابند بنایا جائے اور اللہ کے احکام کو ان میں زندہ کیا جائے، اسی طرح وہ خود بھی ملازموں کے ساتھ برتاؤ میں، ماتحتوں کے ساتھ لین دین کے مسائل میں اور پارٹنرس اپنے معاملات میں حلال وحرام کا لحاظ رکھیں ، طئے ہونے والے معاہدات کو اہل علم کی نگاہ سے گذاریں، خود اسٹاف وعملہ سے پودہ کا اہتمام کریں، اس کے بغیر اسلام کے نام پر چلائے جانے والے ادارے اسلام کی بدنامی اور غلط نمائندگی کا ذریعہ بنیں گے۔

اہلِ علم یا دین دار حضرات کی نگرانی میں چلائے جانے والے ان اداروں کا مذہبی مزاج سیکھنا بھی ضرور ہے، اسی طرح عصری تعلیم کا معیار باقی رکھنا بھی ضروری ہے ، چاہے دینیات کا نظام جتنا بھی مستحکم اور بڑے بڑے علماء کے بیانات ہورہے ہوں، لیکن عصری تعلیم معیاری نہیں ہے تو اس قسم کے ادارے ہرگز مغرب زدہ طبقہ کو قریب کرنے کا ذریعہ تکرار نہیں بن سکتے۔

مسلمان سائنسدانوں کے امتیازات وخصوصیات

بجرباتی طریقۂ کار:

کسی بھی علمی تحقیق، ایجاد، اکتشاف کے تعلق سے مسلمانوں نے اس پر بحث ونظر
ں اکتفا نہیں کیا؛ بلکہ انہوں نے تجربات بھی کئے، یونانی اور ہندی تو بیشتر نظریات قائم
نے پر ہی اکتفا کرتے تھے۔ (اس کو عملی جامہ نہیں پہناتے تھے، اس کو عملی جامہ نہ
انے کی وجہ سے بہت سارے نظریات علمی تحقیق سے متعلق یکجا ہوئے، جس میں صحیح
غلط کے درمیان فرق اور خط فاصل قائم کرنا مشکل ہوگیا، پھر) مسلمانوں نے ان تمام
ریات کو تجربات کی کسوٹی پر پرکھا (چنانچہ مسلمان سائنسداں ہر نظریہ قائم کرنے کے بعد
، پر سرچ، تحقیق اور تجربہ بھی کرتے تھے، جس سے صحیح اور غلط نظریہ واضح ہوجاتا تھا، یہ
باتی) یہ طریقہ مسلمانوں ہی کی ایجاد ہے۔

چنانچہ مسلمانوں نے سابقہ تمام نظریات کو تجربات کی کسوٹی پر پرکھا ہے، انہوں
، سابقہ نظریہ قائم کرنے والے کی شہادت پر نظر نہیں کی؛ بلکہ ہر نظریہ کو عملی کسوٹی پر
ما ہے، اس طرح سابقہ نظریات کی اغلاط کی اصلاح کی گئی، یہ لوگ نہ صرف سابقہ
ریات کو جانچتے اور پرکھتے تھے؛ بلکہ خود نظریہ قائم کرتے اور اس کو تجربہ اور تحقیق کی کسوٹی
ھ کر اس کی حقانیت اور صداقت کو اجاگر کرتے۔

جن مسلمان سائنسدانوں کو اس فن میں مہارت تھی، ان میں جابر بن حیان،
رزمی، رازی، حسن بن ہیثم، ابن النفیس سرفہرست ہیں۔

جابر بن حیان کہتا ہے: " وملاك كمال هذه الصنعة العمل والتجربة، من لم يجرب لم يظفر بشيء أبدا" (۱) اس صنعت کا کمال عمل اور تجربہ ہے، ص تجربہ نہیں کرتا، وہ کچھ نہیں پاتا۔

اپنی کتاب ''خواص کبیر'' میں کہتا ہے:

" إننا نذكر في هذه الكتب خواص ما رأيناه فقط دون ما سمعناه، أو قيل لنا، وقرأناه بعد أن امتحناه وجربناه، فما صح أوردناه، وما بطل رفضناه، وما استخرجناه نحن أيضا قاسيناه على أحوال هؤلاء القوم" (۲)

''ہم نے ان کتابوں میں صرف ان چیزوں کے خواص کا تذکرہ کیا ہے جن کو ہم نے دیکھا ہے، نہ کہ صرف سنا ہے، یا ہم کو بتلایا گیا ہے یا ہم نے جس کو پڑھا ہے اس کے جانچ پڑتال کرنے اور تجربہ کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد، اس میں جو صحیح ہے اس کو ہم نے ذکر کیا ہے، اور جو غلط اور باطل ہے اس کو ہم نے ٹھکرا دیا ہے، جس کو ہم نے استنباط کیا ہے اس کو بھی اس قوم کے احوال پر قیاس کیا ہے''۔

اس لئے جابر بن حیان وہ پہلا شخص شمار ہوتا ہے جس نے علمی طریقۂ کار میں تجربہ کو ل کیا۔

اور ایک جگہ وہ کہتا ہے کہ:

" فمن كان دربا كان عالما حقا، ومن لم يكن دربا لم يكن عالما، وحسبك بالدربة في جميع الصنائع أن الصانع الدرب يحذق، وغير الدرب يعطل"

كتاب التجربة: لابن حيان، ضمن مجموعة مصنفات في علم الكيمياء للحكيم جابر بن حيان، ۱۹۲۸

) كتاب خواص الكبير: ۲۳۲

''جو شخص تجربہ کرتا ہے وہ حقیقی عالم ہے اور جو شخص تجربہ نہیں کرتا وہ عالم ہی نہیں۔ تمام صناعات اور ایجادات میں یہ بات مسلّم ہے کہ تجربہ کرنے والا حاذق ہوتا ہے اور غیر مشاق بے کار رہوتا ہے''۔

رازی دنیا کا پہلا طبیب ہے جس نے اس تجرباتی طریقہ کار کو اختیار کیا، چنانچہ اس ، دواؤں کو انسان پر استعمال کرنے سے پہلے جانوروں پر اس کا تجربہ کیا خصوصاً بندروں یہ طریقۂ کار (بہت کم مدت سے) پوری دنیا میں اس وقت رائج ہے، چنانچہ وہ اس حوالہ ، کہتا ہے:

"عندما تكون الواقعة التى تواجهنا متعارضة مع النظرية السائدة يجب قبول الواقعة ، حتى وإن أخذ الجميع بالنظريات السائدة تأييدا لمشاهير العلماء" (۱)

''جب کوئی واقعہ یا حادثہ جس سے ہم کو واسطہ پڑتا ہے اور یہ لوگوں میں رائج نظریہ سے متعارض ہوتا ہے تو ہم اس واقعہ کو قبول کرتے ہیں، چاہے تمام لوگ مشاہیر علماء کی تائید میں اس نظریہ کی تائید نہ کریں''۔

اس سے پتہ چلا کہ بسا اوقات تمام لوگ بڑے اور مشہور علماء کے آراء سے متاثر تے ہیں اور ان کے نظریات پر تکیہ کیئے رہتے ہیں، کبھی تجربہ کسی نظریہ سے متعارض ہوتا ، تو اس وقت نظریہ کو رد کرنا پڑتا ہے۔ اسی تجرباتی طریقہ کار کی وجہ سے ابن الہیثم، اقلیدس، موس کے نظریات کی علمی قدر و منزلت کے باوجود ان کو تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

اسی تجرباتی طریقہ کار کے ذریعہ انسان کو یہ پتہ چلتا ہے کہ حقیقت تک کیسے پہنچا سکتا ہے، صحیح اور درست حقیقتِ حال کیسے دریافت کی جاتی ہے؟

) عملی طریقۂ کار

کسی بھی نظریہ کو عملی جامہ پہنانا اور اس کو عملی شکل دینا یہ بھی مسلمانوں کا ہی عظیم رنامہ ہے۔

ابن ابی صبیعة : طبقات الأطباء :۱/۷۷،۷۸

گذشتہ سائنسداں نت نئے نظریات قائم کرتے ،اکثر وبیشتر یہ نظریات بالکل صحیح
تے ؛ بلکہ ان کی صحت اور قوت کے باوجود یہ نظریات صرف کاغذی حد تک ہوتے ،
ن ان نظریات کی عملی تطبیق اور تنفیذ نہ ہوتی ،اسی کو عملی طریقۂ کار کہتے ہیں ،ان مختلف
ریات کو عملی جامہ پہنا کر اس کو انسان کے آرام وسہولت کے لئے مفید بنانا ضروری
،۔

جب مسلمان بحیثیت دنیا کے معمار اور مصلح کے منظر عام پر آئے تو اس طرح
لمان ہر پرانے نظریہ کو عملی جامہ پہنا کر اس کو لوگوں کے لئے مفید ذریعہ بنانے لگے۔

اس کی مثال موسی بن شاکر کی اولاد کا سیرابی کے آلات اور پہاڑوں کی
ریوں پر پہنچانے والے آلات کی ایجاد ہے،اسی طرح باریک اور نازک گھڑیوں کی
باد یہ ساری چیزیں قدیم نظریات کی اساس پر ہوئی ہیں ، ہاں البتہ اسی میں انہوں
، کچھ اپنے نظریات کو بھی شامل کر کے مفید آلات کی ایجاد کی اور اس کے ذریعے
ں کو نفع پہنچایا۔

اسی طرح زہراوی نے کئی ایک آلاتِ جراحی ایجاد کی ،مثلاً اسے نظریاتی طور یہ پتہ
کہ جب دواء براہِ راست خون سے لگتی ہے تو اس کا بجلد اثر ہوتا ہے،تو اس نظریہ کی وجہ
ےاس نے حقنہ کی ایجاد کی ،اس سے دواء بجلد خون تک پہنچائی جاتی ہے“ (۱)

اسی طرح ابن بیطار نے اسی (۸۰) سے زیادہ دوائیں معرض وجود میں لائیں ،
سے ہی جابر بن حیان نے کیمیائی اشیاء کو ایسی چھتری کی ایجاد کے لئے استعمال کیا جو پانی
ے متاثر نہیں ہوتی اور ایسے کاغذ بنائے جو اہم معلومات لکھنے کے لئے استعمال ہوتے ہیں
اس پر آگ اثر نہیں کرتی ۔(۲)

۲) علمی امانتداری

علمی امانت داری کا اصول بھی ایک نیا اصول تھا جو اسلام کی آمد کے بعد ہی ظاہر

حضارة الإسلام وأثرها في الترقي العالمي : جلالي مظهر: ۳۳۲،۲۳

) حضارة العرب :۴۷۵-۴۷۶

ہے، دین اور اخلاق کے نہ ہونے کی وجہ سے صرف شہرت اور نفع کے حصول کے لئے
ف ایجادات کولوگوں نے اپنی جانب منسوب کیا۔
گرچہ علمی امانت داری کا تقاضا تو یہ تھا کہ کسی کے بھی فکری اور علمی حقوق کا تحفظ کا
رام کیا جاتا اور کسی بھی محنت اور جدو جہد اور ایجاد کو اسی کی جانب منسوب کیا جاتا ہے؛
ن مسلمان سائنسدانوں کی تحقیقات اور ایجادات کا بکثرت سرقہ کیا گیا اور اس کی نسبت
کے بہت بعد آنے والے یورپین سائنسدانوں کی طرف کردی گئی۔
اور یہ بات بھی کسی پر مخفی نہیں ہے کہ خون کی چھوٹی دوران (pulmonar
circulatio) کے محقق اور مفتش ابن النفیس کی اس تحقیق کو جس نے اسے نہایت
یک بینی کے ساتھ اپنی کتاب (شرح تشریح القانون) میں نوٹ کی تھی اور یہ بات بہت
نے سے مخفی تھی، اس کو بعد کے زمانے میں غلطی سے ایک انگریز ڈاکٹر ''ولیام ہارفی''
جانب منسوب کیا گیا، جس نے خون کی دوران کی ابن النفیس کی وفات کے بعد تین
ریوں سے بھی زائد مدت گذرنے کے بعد دریافت کیا اور لوگوں کو دوران خون کی
بقت معلوم کرنے والے کی حیثیت سے ابن النفیس کا نام معلوم نہ تھا، پھر ڈاکٹر محی
ین التطاوی نے اس کا اکتشاف کیا۔
اسی طرح ایٹالی ڈاکٹر الباجو نے ۹۵۴ھ=۱۵۴۷م میں ابن النفیس کی (شرح
ریح القانون) کے کئی اقسام کا لاطینی ترجمہ کئے، ان ابحاث میں سے ایک بحث خون
آنتوں سے متعلق تھی، ایک اسپین ڈاکٹر جس کا نام ''سرفیتوس'' تھا، یہ پیرس یونیورسٹی کا
ر تھا، اس کو الباجو کا ابن النفیس کی کتاب کا ترجمہ مل گیا، اس پروفیسر کو اس کے عقائد
خلط ملط کی وجہ سے یونیورسٹی سے نکال دیا، اس کو اور اس کی کتابوں کو جلا دیا گیا، اس کی
ں کتابیں بغیر جلی ہوئی محفوظ رہیں، جن میں خون کی دوران کے متعلق ابن النفیس کی
اب کا الباجو کا کیا ہوا ترجمہ بھی تھا، بعد کے لوگوں نے اس کتاب کے اس کے پاس
جود ہونے کی وجہ اس کتاب کی نسبت اس کی طرف کردی۔ کہ اس کا سہرا اس کے سر جاتا
، پھر ہارفی کے سر، یہ خیال ۱۳۴۲ھ/۲۹۲۴ء تک قائم تھا یہاں تک کہ مصری طبیب ڈاکٹر

، الدی التطاوی نے اس وہم کو ختم کیا، انہوں نے شرح تشریح القانون پر برلن کے کتب
نہ میں ایک نسخہ پایا، اور اس سلسلے میں انہوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل۔(۱)
سماجی علم اور سوشل کی نسبت فرانسیسی یہودی ''دور کائم'' کی جانب کی گئی ہے،
انکہ اس علم کے بانی اور موجد علامہ ابن خلدون ہیں۔
اسی طرح ''روجر بیکون'' کی کتاب ''cepus majus'' کی فصل خامس یہ
ف اور صرف ابن الہیثم کی کتاب المناظر کا حرف بحرف ترجمہ ہے، اس نے بغیر اس کو
، کے مؤلف کی جانب منسوب کئے ہوئے ترجمہ کیا ہے۔
مسلمانوں کے ساتھ یہ علمی خیانت بہت زیادہ ہوئی، لیکن مسلمانوں نے کبھی اس
، خیانت کا ارتکاب نہیں کیا؛ بلکہ ہر تحقیق اور ایجاد کو اس کے حقیقی بانی اور موجد کی جانب
منسوب کیا۔ بلکہ مسلمان علماء اور سائنسدانوں اور محققین کی کتب گذشتہ فلسفیوں کے
وں سے بھری پڑی ہیں،، جیسے بقراط، جالینوس، سقراط، ارسطو وغیرہ۔

تطور الفکر العلمی عند المسلمین :۲۰۸، محمد صادق العضیلی
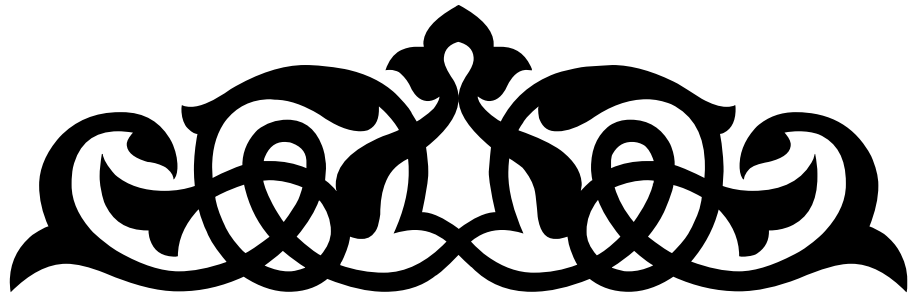
مسلمان اطباء اور ان کے کارنامے

جس طرح مسلمان علماء اور اہلِ علم نے دیگر علوم وفنون کی آبیاری کی اور ان کو بامِ عروج تک پہونچایا، نت نئے ایجادات کے ذریعہ موجودہ سائنس کو ترقی کی راہ دکھائی، وہیں علمِ طب کے حوالے سے بھی ان کے کارنامے کچھ کم نہیں ہیں، اس علم وفن کے اس گوشہ، خدمتِ خلق کے اس پیشہ کو بھی انہوں نے اپنے تجربات، اپنی قلمی جولانیوں اور فکری توانائیوں کی آماجگاہ بنایا، خود مغربی مفکرین اور اطباء کو مسلمان اطباء کی عظیم خدمات اور اس فن کے بامِ عروج تک پہونچانے میں اس کے رول اور کردار کا اقرار اور اعتراف ہے۔

آج کل علمِ طب کی ہیئت وصورت کے مکمل طور پر بدل جانے کے باوجود اس علم طب کی اصل بنیاد گذشتہ مسلمان اطباء کی دواسازی اور علم طب سے متعلق وضع کردہ قواعد وضوابط پر ہی ہے۔ پیچیدہ اور دشوار گذار امراض کے لئے وہی گذشتہ اصول آج بھی نسخۂ کیمیا اور حرفِ آخر ہیں۔

خود مغربی علماء اور مفکرین کو مسلمانوں کے طب اور دواسازی کے میدان میں مسلمان علماء اور حکماء کے بلندیٔ مرتبت اور اس فن میں ان کے مقامِ بلند کا اعتراف ہے کہ اس فن کے ابتدائے بانی اور اس کی داغ بیل رکھنے والے مسلمان علماء ہی ہیں۔

برطانیہ انسائیکلوپیڈیا میں ہے جس کی عربی عبارت براہِ راست لکھی جارہی ہے:

”والحقّ أن كثيراً من أسماء الأدويةِ وكثيراً من مركّباتها المعروف حتّٰى يومنا هذا، وفى الحقيقة المبنى العام للصيد لةالحديثة، فيما عداالتعديلات الكيمياو ية

الحديثة الحال، قد بدأ العرب" (۱)

''حق تو یہ ہے کہ بہت ساری دواؤں کے نام اور اس کے بہت سے مشہور و معروف مرکبات آج تک جس پر طب جدید کا اعتماد ہے سوائے چند کیمیاوی مشمولات کے، اس کی ابتداء عربوں نے ہی کی ہے''

اس تحریر کے اور مسلمان اطباء کے کارناموں اور ان کی طبی خدمات کے ذکر کے ذریعہ ایک تو مسلمانوں کی اس فن میں ان کی خدمات اور اس کو ترقی کی راہ دکھانے میں ان کے کردار کو اجاگر کرنا ہے اور دوسرے خود مسلمانوں کو یہ باور کرانا مقصود ہے کہ وہ مغرب کی مادی ترقیات اور نت نئے ایجادات اور طبی اور علمی میدان میں ان کی ترقی سے مرعوب اور حیران و ششدر نہ ہوں؛ کیونکہ اس ساری ترقی کی بنیاد اور اس قافلہ کے سالار اول اور اس فن کے سرخیل مسلمان ہی رہے اور اس کی عمارت کی پہلی بنیاد اور داغ بیل مسلمانوں ہی نے رکھی ہے، ہاں اس کے ساتھ یہ پیشِ نظر رہے کہ ان علماء اور اطباء نے جہاں اس فنِ طب کی خدمت کو اپنا پیشہ بنایا اور اس میں کامل مہارت اور حذاقت کے ذریعہ تاریخ کے صفحات میں اپنے نام درج کروائے ہیں، وہیں اس کے ساتھ ان کا خاص وصف یہ بھی رہا ہے کہ انہوں نے اپنے دین وایمان کے ساتھ سودا کبھی گوارا نہیں کیا، اور اپنے دین و مذہب کے ساتھ ان کا لگاؤ اور تعلق ہر قدم پر قائم رہا۔

(۱) خالد بن یزید (۸۵ھ)

علوم وفنون کا شیدا خالد بن یزید حضرت امیر معاویہ کا پوتا تھا، جس کو دیگر علوم وفنون کے ساتھ علم طب سے خصوصی دلچسپی اور لگاؤ تھا، اس کے علوم وفنون کے ساتھ لگاؤ کا اندازہ اس طرح لگایا جاسکتا ہے کہ شاہی خاندان کے فرد ہونے اور جس دور میں بنی امیہ میں خلافت اور حکمرانی کے لئے رسہ کشی اور خلفشار برپا تھا، تمام شاہی کروفر اور تصنع سے دور علوم وفنون کی آبیاری اور خدمت کے لئے وقف ہو گیا تھا۔

(۱) أحكام الأدوية في الشريعة الاسلامية، ص:۱۴۵

علمی کارنامے:

اس کے علمی کارناموں میں سب سے برتر اور بلندتر کارنامہ یہ ہے کہ اس نے نت نئے علوم وایجادات، طب، سائنس سمیت مختلف علوم کے ماہرین کو اپنے یہاں جمع کیا، قدیم یونانی اور قبطی زبانوں کی مشہورِ زمانہ کتابوں کے عربی میں ترجمہ کرائے، گرچہ اس کی شہرت بحیثیت کیمیاداں زیادہ ہوئی، حالانکہ ابن ندیم (۱) اور ابن خلکان (۲۲۴/۲) دونوں کے بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ خالد کی طب کے تعلق سے معلومات بھی کافی وسیع تھیں۔

بہرحال اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے ہی قدیم علمی کتابوں کے ترجموں کا آغاز کیا، اس کی نگرانی میں طب سے متعلق جن کتابوں کا ترجمہ ہوا ان میں ''کتاب الحرارت''، ''کتاب الصحیفة الکبیر''، ''کتاب الصحیفة الصغیر'' وغیرہ شامل ہیں (۲)

مذہبی رنگ اور دین سے وابستگی:

اس نے نہایت نیک طینت اور صالح طبیعت پائی تھی، شاہی خاندان کا فرد اور رکنِ رکین ہونے کے باجود شاہی تکلفات سے ہمیشہ دور ہی رہا، فن طب اور کیمیاء میں کامل مہارت کے ساتھ دینی علوم میں بھی کمال حاصل کیا۔

(۲) جابر بن حیّان (۱۹۸ھ = ۸۱۷ء)

جابر بن حیان فن کیمیاء کا باوا آدم تسلیم کیا جاتا ہے، اسے سونا بنانے کی عجیب دھن تھی، جس نے اسے علمِ کیمیاء پر تجربات کروائے۔

اس کی پیدائش ۱۲۰ھ مطابق ۷۳۷ء میں ہوئی، یہ ایک غریب گھرانے کا فرد تھا، باپ عطار (دوائی فروخت کرنے والا) تھا، تربیت کا سارا بوجھ ماں پر آن پڑا، بچپن میں کوفہ اپنے رشتہ داروں کے پاس بھیج دیا گیا، سن شعور کو پہنچا تو کوفہ کے علمی ماحول سے

---

(۱) کتاب الفہرست، ص: ۳۵۴ (۲) دیکھئے تاریخ الطب: حکیم سید محمد حسان نگرامی

متاثر ہوا، اور مدرسہ کی مروجہ تعلیم حاصل کی، اس کی کھوجی طبیعت نے اسے کیمیا داں بنا دیا۔ (CHEMISTRY)

علمی خدمات اور کارنامے

۱۔ عمل تصعید یعنی دوا کا جوہر اڑانا (SUBLIMATION) اس طریقہ کو سب سے پہلے اسی جابر نے اختیار کیا، تا کہ لطیف اجزاء کو حاصل کر کے دواؤں کو مزید مؤثر بنایا جا سکے۔

۲۔ جابر نے قلماؤ کرنے (CRYSTALLISTION) کا طریقہ دریافت کیا اور اس نئے طریقہ سے دواؤں کو قلمایا۔

۳۔ جابر نے دھات کو بھسم کر کے کشتہ بنانے (OXIDISATION) کا نازک طریقہ دریافت کیا، کسی دھات کو جڑی بوٹیوں کے ساتھ کس طرح آنچ دے کر بھسم کرتے ہیں، اس میں صحیح اندازے اور تجربے کی ضرورت ہوتی ہے۔

۴۔ جابر کی ایک بڑی اور مفید ایجاد قرعِ انبیق ہے (DISTILLATION APPARATUS)

(۳) ابوالحسن علی بن سہل رَبّن طبری (۲۵۱ھ=۸۷۰ھ)

یہ فن طب کا ماہر تھا، اس نے اس فن کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی، پھر بغداد کے جملہ اسپتالوں کا نگراں مقرر ہوا، یہ مرو کا باشندہ تھا، اسکے والد قابل طبیب تھے، وہ بغداد آ کر مقیم ہو گیا، اس نے بغداد کے دستور کے مطابق درس دینا شروع کیا، چونکہ وہ کامل مہارت رکھتا تھا، اس لئے اس کے یہاں فن طب کے طلبہ کا ہجوم ہو گیا، علی بن سہل کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ فن طب کا مشہورِ دنیا طبیب زکریا رازی کا استاذ ہے۔

علمی خدمات اور کارنامے

علی بن سہل ایک روشن دماغ اور باکمال طبیب تھا، اس کی اس طبی مہارت کی وجہ سے سرکاری اسپتالوں کا نگراں مقرر کیا گیا، اس طرح اسے بے شمار مریضوں کے علاج

ومعالجہ کا موقع ملا اوراس نے خوب تجربات حاصل کیئے ،اور علاج کے نت نئے طریقے ایجاد کیئے اوراپنے ان تجربات اور مجربات کو ڈائری میں نوٹ کرتا رہا، پھراس کو مرتب کر کے کتابی شکل دی اوراس کا نام ''فردوس الحکمت'' رکھا۔

یہ کتاب ابجد کے اصولوں پر مرتب کی گئی ہے جیسا کہ آج کل انسائیکلو پیڈیا کا طرز ہے،عربی زبان میں اس قدر محیط اور جامع کتاب نہیں لکھی گئی ،اس کتاب میں بیشتر طبی مباحث کا ذکر ہے۔

اورایک کتاب ''دین ودولت''اس قابل مصنف نے مرتب کی جواخلاقی تعلیم اور معلومات کا قابلِ قدر ذخیرہ ہے۔

مذہبی رنگ ومزاج

حقیقت یہ ہے کہ علی بن ربن سہل انسائیکلو پیڈیا کا موجد،حفظِ صحت کے اصول اوراحتیاط کے قاعدے بتانے والاطبیب حاذق،علم الاخلاق کا مالک،سماجی زندگی کوعمدہ طریقہ سے فروغ دینے والا اور دین ودولت کوتوازن کے ساتھ لے کر چلنے والا معلم اورعظیم شخصیت کا مالک تھا۔اس کا بڑا کارنامہ طبی انسائیکلوپیڈیا ہے

(۴)علی بن عباس مجوسی (م۳۸۴ھ)

طب یونانی جب اپنے عربی واسلامی دور میں نقل وترجمہ سے آگے بڑھ کرتصنیف وتالیف کے مرحلے میں داخل ہوئی،تو اسکوجن اطباء نے اسے پروان چڑھایااوراپنی گراں قدر تصنیفات کے ذریعہ تاریخ میں گہرے نقوش چھوڑے، ان میں ایک نمایاں نام ''الکتاب الملکی کامل الصناعۃ الطبیۃ'' کے مصنف علی بن عباس کا بھی ہے،بعض مؤرخین اسے عظیم اسلامی اطباء میں شمار کیا ہے اوراسکی تصنیف کو''طبی انسائیکلو پیڈیا'' قرار دیتے ہوئے اسے محمد بن زکریا رازی کی کتاب ''کتاب الحاوی''اور بوعلی سینا کی کتاب ''القانون فی الطب'' سے بعض اعتبارات سے بہتر قرار دیا ہے۔

علی بن عباس المجوسی کے حسب ونسب،تاریخِ پیدائش اور ابتدائی حالاتِ زندگی

پر کوئی روشنی نہیں ملی، حاجی خلیفہ نے وفات ہجری ۳۸۴ھ اور جارج سارٹن نے عیسوی ۹۹۴ء تحریر کیا ہے۔

پروفیسر براؤن نے ان کو مسلمان کہا ہے، مجوسی اس کی نسبتِ اسمی سے ظاہر ہے کہ اس کا باپ یا دادا ان کے قدیم زرشتی مذہب کا پیرو تھا، واندیک امریکائی نے اپنی کتاب "اکتفاء القنوع بما هو المطبوع" میں علی بن عباس کا لقب علاء الدین بیان کیا ہے، اور ظاہر ہے کہ اس قسم کے القاب مخصوص بالاسلام ہیں۔

علمی خدمات اور کارنامے

علی بن عباس نے اپنے استاذ ابو ماہر موسیٰ بن سیار سے کسبِ فیض کرنے کے علاوہ خود بھی تحصیلِ علم میں محنت کی اور فنِ طب میں مہارت اور درک پیدا کر لیا، ابن ابی صیبعہ نے تحریر کیا ہے کہ "وہ ماہر طبیب تھا، فن طب میں اسے امتیازی حیثیت حاصل تھی، تاریخِ طب میں متعدد باتوں کی تحقیق وایجاد کا سہرا علی بن عباس عباسی کے سر جاتا ہے۔

۱۔ وہ پہلا طبیب ہے جس نے شرائین واوردہ کے درمیان عروقِ شعریہ کا جال ہونے کا تصور دیا۔

۲۔ پہلا طبیب ہے جس نے ریوی سل کو عسیر العلاج مرض قرار دیا اور اس کا سبب پھیپڑے کی مسلسل حرکت بتلایا۔

۳۔ اس نے احتباس بول کی صورت میں قاثاطیرہ CATHAER کے ذریعہ پیشاب جاری کرنے کا طریقہ بتلایا۔

۴۔ اس نے سب سے پہلے یہ بتلایا کہ وضعِ حمل کے دوران بچہ خود باہر نہیں آتا، بلکہ رحم اپنی حرکت کے ذریعہ اسے باہر ڈھکیلتا ہے۔

۵۔ اس نے اپنی کتاب میں بہت سے دلچسپ سریریاتی مشاہدات بیان کئے ہیں۔

۶۔ اس نے اطباء پر برابر اسپتالوں میں حاضری دینے اور وہاں داخل مریضوں کا معائنہ کرنے اور ان کے ذریعے تجربہ حاصل کرنے پر زور دیا۔

اس کی مذکورہ بالا تصنیف کی حیثیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ابن

سینا نے اس کے بارے میں کہا ہے کہ ''اگر'' کامل الصناعۃ'' پہلے میری نظر سے گزری ہوتی تو مجھے ''القانون'' لکھنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

علی بن اسحاق مجوسی کی حذاقت اور مہارت:

علی بن اسحاق المجوسی کے پاس ایک مزدور آیا جس کو دردِ سر کی شکایت رہتی تھی، مجوسی نے اس مریض کا عجیب علاج کیا، اس نے مریض کے سر پر کئی مرتبہ چوٹ پہنچائی جس سے نکسیر کی شکل میں خون جاری ہوگیا اور مادۂ فاسدہ جو اس مرض کا سبب تھا خون کے ساتھ خارج ہوگیا، اس عمل سے مریض کو بہت سکون ہوا اور اس کا دردِ سر ہمیشہ کے لئے دور ہوگیا۔

(۵) ابو یوسف یعقوب بن اسحاق کندی (۲۵۴ھ/۸۷۳ء)

یعقوب کندی علم ہیئت اور نجوم کا ماہر، علم الاعداد اور اسکی خاصیتوں پر تحقیق کرنے والا پہلا محقق، ماہرِ ریاضی اور روشنی پر تحقیق کرنے والا عظیم دانشور تھا۔

یعقوب کندی کے والد خلیفہ مہدی اور ہارون رشید کے عہد میں کوفہ کے امیر تھے، یعقوب کے آباء واجداد اگر چہ طبقۂ امراء سے تعلق رکھتے تھے اور یعقوب کی پرورش اور تربیت بھی شاہانہ ماحول میں ہوئی تھی، مگر اسے علم وفن سے فطری لگاؤ اور کمالِ شغف تھا، وہ دولت وثروت اور سیاسی زندگی کے طمطراق کے بالکل قریب نہیں گیا۔

وہ شاہانہ زندگی کو چھوڑ کر علمی زندگی کو اختیار کیا اور علمی وفنی کتابوں کے مطالعہ میں مصروف ہوگیا۔

علمی خدمات اور کارنامے

یعقوب علمِ ہیئت کا ماہر اور علمِ نجوم کا قابل تھا اس نے اپنے کمالات فن کا بار بار ثبوت دیا ، وہ باکمال طبیب بھی تھا، علم ادویہ کے موضوع پر اس نے گہرا مطالعہ کیا، نئی نئی جڑی بوٹیوں کو تلاش کر کے اس پر تجربہ کئے، ان کی خاصیتوں اور اثرات کو صحیح صحیح معلوم کیا اور پھر ان کی درجہ بندی کی، پھر دواؤں کے استعمال میں وزن کا تعین یہ یعقوب کے

زبردست کارنامے سمجھے جاتے ہیں۔

اس نے علمِ طب کے سلسلے میں بے شمار کتابیں لکھیں، اس کے شاگرد اس کی کتابوں کے نقل کرنے اور مسودات کے صاف کرنے پر مشغول رہتے تھے، ''کتاب الطب البقراطی''، ''کتاب فی الغذاء والدواء''، ''کتاب تدبیر الاصحاء''، ''کتاب فی القرابادین''، ''کتاب الادویہ''، ''فساد الأخلاط''، ''کتاب فی الباہ'' یہ اس کی طب سے متعلق کتابیں ہیں، ان میں بعض کتابوں ''قرابادین'' اور ''کتاب فی الباہ'' کے مخطوطے آج بھی صوفیا لائبریری میں موجود ہیں۔

(۶) ثابت بن قرّہ حرّانی (۲۷۳ھ/۹۰۱ء)

ثابت حران کا باشندہ تھا، حران شمالی عراق میں ایک مردم خیز علاقہ تھا، ولادت مقامِ حران میں ۲۱۱ھ میں ہوئی۔

اس کا آبائی پیشہ صرافی تھا، ثابت نے تعلیم اپنے وطن میں حاصل کی اور ذہانت سے اپنی قابلیت میں اضافہ کیا، یہ فن طب میں علم تشریح الابدان میں باکمال فلسفی اور طبیب تھا، ساتھ ہی ساتھ علم ہیئت کا ماہر بھی تھا۔

علمی خدمات، مہارت اور کارنامے

بغداد میں ثابت بن قرہ نے محمد بن موسی شاکر کے قائم کردہ علمی ادارے میں گئی بیش قیمت کام کیے، کئی زبانیں جانتا تھا، اعلیٰ درجہ کا مترجم تھا۔

ثابت کے لئے بے شمار طبی علاج سے متعلق واقعات مشہور تھے، ایک واقعہ ہے کہ دربارِ خلافت جارہا تھا، بازار سے شور اٹھا کہ قصاب اچانک فوت ہوگیا، ثابت بن قرہ نے کہا: مرانہیں، لوگ حیرت زدہ ہوگئے، ادھر اس کی نعش کو غسل دینے کی تیاری ہورہی تھی، ثابت نے نبض دیکھی اور ملازم سے قصاب کے پیروں پر ضرب مارنے کو کہا، پانی منگا کر کوئی دوا ڈالی اور حریرہ تیار کرکے اس کو پلایا، قصاب نے آنکھیں کھول دیں، خلیفہ نے اس واقعہ کا طبی پہلو دریافت کیا تو ثابت نے بتایا کہ روزانہ میں جب راستہ سے گذرتا تھا تو

دیکھتا تھا کہ قصاب کلیجی کے پارچے پر نمک چھڑک کر کھایا کرتا تھا، اس کی یہ نازیبا حرکت مجھے ناپسند تھی، اور یہ یقین ہوگیا کہ ایک دن سکتہ کا مرض اس کولاحق ہوگا، چنانچہ خبر پاتے ہی میں نے سمجھ لیا اور قصاب کا علاج سکتے کے مرض کا کیا۔اب وہ کل سے حسبِ دستور اپنا کام کرے گا۔

ثابت نے ۷۷ رسال کی عمر پاکر ۲۸۸ھ میں وفات پائی۔

ثابت کے حکیمانہ اقوال

ثابت کے درج ذیل حکیمانہ اقوال بھی اس کی فنی مہارت اور دینی مزاج کا پتہ دیتے ہیں۔

بوڑھے آدمی کے پاس اچھا باورچی اور خوبصورت کنیز مت رکھو، کیوں کہ اچھا کھانا زیادہ کھا کر بیمار ہوگا اور کنیز اچھی ہوگی تو کمزوری زیادہ ہوگی۔

بغداد کے مشہور ریاضی دان ثابت ابن قرۃ (متوفی ۹۰۱ء) amecable numbers تلاش کرنے کے لئے ایک منفرد فارمولا دریافت کیا تھا، عجیب بات یہ ہے کہ سات سوسال بعد فرانس کے ممتاز ریاضی داں پیئر فیرمٹ pirre femat (۱۶۰۱-۶۵) نے ثابت ابن قرہ کے عین فارمولے سے ملتے جلتے کو استعمال کر کے second pair of amicable number دریافت کیئے، مگر آف کورس اس کا کریڈٹ کسی اور کو نہ دیا۔

(۷) ابوبکر محمد زکریا رازی (۳۰۸ھ=۹۳۲ء)

بقراطِ زماں، جالینوس العرب ابوبکر محمد بن زکریا رازی ایران کے بے حد مردم خیز شہر ''رے''میں ۱۷ راگست ۸۶۰ء میں پیدا ہوا، یہ شہر ایران کے موجودہ پایہ تخت طہران سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے، اسی نسبت سے اسے عربی میں رازی اور لاطینی زبان میں ریزر rhazar کے نام سے اس کی شہرت ہوتی ہے۔

لڑکپن لاابالی اور عود کا بجانا وغیرہ جیسے مشاغل میں گذرا، جب شادی ہوئی اور فکر

ِ معاش پیدا ہوئی تو کیمیا گری کی طرف متوجہ ہوا، کیمیا گری میں بھٹی کے کاموں سے آشوبِ چشم کا شکار ہوا پھر اڑتیس سال کی عمر میں وطن سے نکل کر تلاشِ علم کی جستجو میں بغداد پہونچا، وہاں علی بن سہل وغیرہ کے حلقہ درس میں شامل ہوا، اسپتالوں کا نگراں مقرر ہوا، مریضوں کو بڑی توجہ سے دیکھتا، بڑا سخی اور غریبوں کا ہمدرد واقع ہوا تھا، اکثر دوائیں، پرہیزی کھانے اپنی جانب سے مہیا کرتا، قیام کا نظم کرتا۔

علمی خدمات اور کارنامے

ابوبکر محمد بن رازی نے فن طب کو نہایت بامِ عروج تک پہنچایا، اس نے سرکاری اسپتالوں کے نظام میں اصول اور ضابطے قائم کئے، اور مختلف شعبوں میں باقاعدہ طبی سہولیات کو رائج کیا، دواؤں پر تحقیق مشاہدہ کے لئے باقاعدہ شعبہ جات قائم کیا، شفاخانوں میں ابتدائی طبی امداد (first aid) کا طریقہ پہلی مرتبہ ایجاد کیا۔

حکومتِ وقت ایک شہر میں نیا اسپتال قائم کرنا چاہتی تھی، چنانچہ رازی نے گوشت کے بڑے بڑے مختلف مقامات پر مناسب جگہوں پر آویزاں کروائے، اطباء کی ایک جماعت نے ان گوشت کے ٹکڑوں کا کئی روز مشاہدہ کرکے ان پر ہونے والے اثرات کی رپورٹ تیار کیا، جس مقام کا گوشت بہتر حالت پر باقی تھا وہیں اسپتال قائم کیا گیا۔

رازی نے دواؤں کے صحیح صحیح وزن کے لئے ''میزانِ طبی'' ایجاد کیا، میزانِ طبی (hydrostatale -balance) سے چھوٹی چھوٹی شئی کا وزن صحیح معلوم کیا جاتا ہے، یہ ترازو آج کل سائنس روم میں استعمال ہوتا ہے۔

رازی کا سب سے بڑا کارنامہ چیچک پر تحقیق ہے، یہ موذی مرض انتہائی خطرناک اور لاعلاج تھا، چیچک کے اسباب، احتیاط اور علاج دریافت کرکے تفصیل سے اس مرض پر کتاب تصنیف کی جو اس موضوع پر پہلی کتاب تھی، اور یورپ میں صدیوں پڑھائی جاتی رہی۔

رازی نے عملِ جراحی میں ایک کارآمد آلہ بنایا جس کو نشتر setion کہتے ہیں، رازی الکحل کا موجد تھا۔ ایک کتاب اس نے گردے اور مثانے کی پتھری پر تصنیف کی، جو

یورپ میں مقبول ہوئی اور عربی متن کے ساتھ فرانسیسی ترجمہ ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا۔

پیچیدہ امراض کے علاج کا صحیح طریقہ تجویز کرنا اس کے علم کا کمال تھا۔

ایک بار ایک رئیس زادے کو تھوک کے ساتھ خون آنے کا مرض لاحق ہوا، متعدد اطباء کا علاج کارگر نہ ہوا، تو رازی کو رجوع کیا، نبض وقارورہ دیکھ کر حیران ہوا کہ سل دق یا کسی ایسے مرض کی علامت نہیں، رئیس زادے کے حالاتِ سفر اور پانی پینے کے متعلق معلومات سے اس نتیجہ پر پہنچا کہ پانی کے ساتھ جونک پی لیا تھا، جو آنتوں کو زخمی کر رہی ہے، علاج کیا اور رئیس زادہ شفایاب ہوا۔

رازی علاج بالغذاء کا حامی تھا، اس کا قول تھا کہ جب تک علاج غذاؤں سے ممکن ہو دواؤں کا استعمال نہیں کرنا چاہئے۔

فن طب پر اس کی کتابیں تقریباً سو ہیں۔

اس عظیم طبیب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ''فن طب مردہ ہو گیا تھا جالینوس نے اسے زندہ کیا، وہ منتشر اور پراگندہ تھا رازی نے اس کو مرتب کر کے ایک شیرازے میں منسلک کر دیا، وہ ناقص تھا، اسے کامل کیا۔

رازی کی مشہور ترین کتاب ''الحاوی'' ہے، جو اس کے تجربات، خیالات اور نظریات کا نچوڑ ہے، دوسری کتاب اس کی ''المنصوری'' ہے، بہت سی کتابیں مختلف موضوعات پر ہیں، اکثر کتابوں کا ترجمہ یورپ کی مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔

رازی کی بلندی کا اندازہ اس سے کیجئے کہ: بین الاقوامی طبی کانگریس کا اجلاس ۱۹۲۳ء میں لندن میں ہوا تو اس میں رازی اور فنِ طب پر اس کی تحقیقات، کام اور نظریات پر خاص طور پر مضامین پڑھے گئے اور اسے فن طب کا امام تسلیم کیا گیا۔

دوسری مرتبہ رازی کی ہزار سالہ برسی فرانس کے شہر پیرس میں بڑی شان سے منائی گئی، یہ جشن ۱۹۳۰ء میں ہوا تھا۔

زکریا رازی کے فنّ طب میں مہارت اور حذاقت کے واقعات

بغداد کے ایک رئیس زادے کو دورانِ سفر خونی قئی (قئی الدم) کا مرض لاحق

ہو گیا، جب کسی طبیب کے علاج سے فائدہ نہیں ہوا تو شہرِ رے آیا، اور وہاں کے مشہور طبیب محمد بن زکریا رازی کو دکھایا، زکریا رازی نے نبض اور قارورہ دیکھا تو اسے سل دق اور پیٹ کے کسی مرض کی کوئی علامت نظر نہیں آئی، جس سے وہ مایوس ہوا مگر مرض کے بارے میں مسلسل غور کرتا رہا، اس نے مریض سے مسلسل سوالات کیئے، اور پوچھا کہ دورانِ سفر کس قسم کا پانی پیا ہے، رازی فوراً سمجھ گیا کہ ضرور اس نے پانی کے ساتھ کوئی جونک اپنی حلق میں اتار لی ہے، اور یہی جونک معدہ میں پہنچ کر خون چوس رہی ہے اور یہی خون بذریعۂ قئے خارج ہو رہا ہے۔

دوسرے دن رازی بغرضِ علاج کائی سے بھرے ہوئے دو برتن منگائے اور مریض سے کھانے کے لئے کہا: مریض کو پہلے تو کراہیت محسوس ہوئی، لیکن معالج کے حکم سے اس نے تھوڑی سی کائی کھانے شروع کی اور پھر بعد میں انکار کر دیا، مجبوراً رازی نے حکم دیا کہ اس کو لٹا کر اور ہاتھ پیر باندھ کر اسکے منہ میں زبردستی کائی ٹھونسی جائے، اس طرح ایک برتن ختم ہو گیا، اور دوسرے کی باری آئی تو مریض چلایا اور التجا کی کہ اب میں مزید نہیں کھا سکتا، مجھے قئی ہو رہی ہے، یہ سن کر رازی کو اس کی صحت کے کچھ آثار نظر آئے، اس نے مریض کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے تھوڑی سی کائی اور کھلا دی، اچانک مریض کو زور سے قئی ہوئی اور بہت سی کائی خون و بلغم کے ساتھ باہر نکل آئی، رازی کو اس کائی میں ایک جونک نظر آئی اور پھر مریض کو دکھا کر یوں کہا کہ: تیرے مرض کا سبب یہی جونک ہے، اب یہ مرض تجھے کبھی نہ ہوگا۔(۱)

زکریا رازی کے مطب کا عجیب انداز

زکریا رازی کے مطب کا بھی عجیب انداز تھا، وہ اپنے مطب میں سب سے پیچھے بیٹھتا تھا، اس کے آگے اس کے شاگرد بیٹھتے تھے، اور اس کے بعد اس کے شاگردوں کے شاگرد بیٹھتے تھے، اور پھر ان کے شاگرد بیٹھتے تھے، جب کوئی مریض آتا تو وہ سب سے پہلے آگے بیٹھے شاگردوں سے اپنا حال کہتا، ان کی سمجھ میں نہیں آتا تو وہ اپنے سے پچھلے

---

(۱) اخبار الطب کراچی: اپریل ۱۹۵۸ء

والے لوگوں کے پاس بھیج دیتے تھے، اگر ان کی بھی سمجھ میں نہیں آتا تو وہ اس سے زیادہ قابل کے پاس بھیجتے تھے، سب سے آخر میں زکریا رازی کا نمبر آتا تھا، یعنی جس کا کوئی علاج نہیں کر پاتا تو ہو رازی کے زیرِ علاج ہوتا۔

بلند اخلاقی اور مذھبی رنگ

رازی بہت ہی بلند اخلاق شخصیت کا مالک تھا، لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرتا، فقراء اور بیماروں کا خوب خیال اور اہتمام کرتا۔

(۸) سنان بن ثابت حرانی (۳۲۰ھ=۹۴۳ء)

سنان بن ثابت حرانی ماہر طبیب، ریاضی داں اور اچھا منتظم تھا، اس نے فن طب میں بہت سی اصلاحات کیں، اور ترقی دی، اس نے تقریباً ایک درجن بادشاہوں کا دور دیکھا اور ہر بادشاہ کے دور میں وزیر رہا

یہ عظیم طبیب حران میں پیدا ہوا، ثابت بن قرہ نے بنوموسیٰ شاکر کے ایماء پر ترکِ وطن کر کے پورے خاندان کے ساتھ بغداد میں سکونت اختیار کی، پیرانہ سالی میں جب ثابت بن قرہ مسلمان ہوا تو بیٹا سنان بن ثابت بھی بعمر چالیس سال حلقہ بگوشِ اسلام ہوا، اس نے شہرِ بغداد میں نامور اساتذہ سے اکتسابِ فیض کیا۔

۸۹۲ء میں خلیفہ معتضد کے دورِ خلافت میں ثابت بن قرہ جو افسر الاطباء کے اعلیٰ افسر منصب پر فائز تھا، اپنی پیرانہ سالی کے باعث اپنی جگہ لائق بیٹے سنان بن ثابت کو مقرر کیا، بعد ازاں اپنی لیاقت اور خوش انتظامی کے باعث آنے والے ایام میں ہر خلیفہ نے اپنے دور میں سنان کو ترقی دی اور وہ اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہوتا گیا اور بغداد کے جملہ شفاخانوں کا مہتمم رہا۔

طبی خدمات اور کارنامے

ملک میں شفاخانوں کا جال بچھا تھا، اسی دور میں مملکت میں غلط علاج سے ایک حادثہ ہوا، واقعہ ہے کہ ۹۳۱ء میں بغداد کے ایک عطائی طبیب کے غلط علاج سے ایک

مریض کی جان چلی گئی۔

اطباء کا امتحان اور رجسٹری

سنان بن ثابت نے غور کے بعد کئی اصلاحات کیں، اس نے حکم دیا کہ جملہ اطباء کو شمار کیا جائے اور ان کا امتحان لیا جائے، چنانچہ جملہ اطباء کو شمار کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اطباء کی تعداد ایک ہزار کے قریب ہے، اب اطباء کا باقاعدہ تحریری اور تقریری امتحان لیا گیا، ایک ہزار سات سو اطباء کامیاب ہوئے اور تین سو ناکام رہے، جو کامیاب ہوئے تھے ان کو حکومت نے رجسٹرڈ کر لیا، ان کو سرکاری سند دی گئی، مطب کرنے کا اجازت نامہ دیا اور ناکام کو مطب کرنے سے منع کر دیا گیا۔

گشتی شفاخانہ

سنان نے ہر ایک کو فائدہ پہنچانے کے لئے گشتی شفاخانہ کا طریقہ نکالا، اطباء کی ایک تعداد دواؤں اور دیگر ساز وسامان کے ساتھ محلے محلے گھومتی تھی اور مریضوں کا علاج کرتی تھی، لوگوں کو گھر بیٹھے علاج کی سہولتیں ہو جاتی تھیں۔

قیدیوں کا طبی معائنہ اور علاج

سنان نے علاج کے اس طریقہ کو بھی وسعت دی، اس نے قیدیوں کا جیل خانوں میں جا کر معائنہ کا طریقہ جاری کیا، وہاں ان کا علاج ہوتا تھا۔

مذہبی رنگ اور دینی مزاج

ایک بادشاہ کے اس کو نصیحت اور خیر خواہی کے مطالبہ پر اس نے اس کو جو غیظ وغضب کو قابو میں رکھنے کی نصیحت کی ہے اور اس کو قرآنی آیت کے بموجب "وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ" اور ارشادِ خداوندی "وَاَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوىٰ" اس سے اس کے مذھبی اور دینی مزاج کا پتہ چلتا ہے۔ (۱)

---

(۱) اخبار العلماء والحکماء: ۱/۸۴

(۹)ابو منصور موفق بن علی ہروی (۳۴۰ھ=۹۶۱ء)

موفق بن علی ہروی اپنے دور کا عظیم طبیب، علم الادویۃ کا زبردست ماہر اور اچھا سائنس داں تھا، ہرات (ایران) کا باشندہ تھا، اس شہر میں تعلیم حاصل کی اور پھر مطالعہ اور تجربہ میں مصروف ہوگیا، اس نے دواؤں کی طرف توجہ کی اور جڑی بوٹیوں پر تجربہ کئے، اس فن میں کمال پیدا کیا۔

علمی خدمات اور کارنامے

موفق بن علی کو طبی سائنس سے گہرا لگاؤ تھا، وہ علمِ نباتات (botany) کا محقق، علم الادویہ پر نئے نئے تجربہ کرنے والا، اپنے فن کا ماہر اور باکمال طبیب تھا، اس نے ہر جڑی بوٹی پر خود تجربہ کئے، ان کے خواص اور اثرات معلوم کئے، نیز نئے پودوں کی تلاش میں دور دور کا سفر کیا، ناموں کی تحقیق کی، خواص اور اثرات کی بناء پر دواؤں کی درجہ بندی کی، اس نے معدنی ادویہ کی بھی تحقیق کی۔

موفق کی مشہور کتاب ''حقائق الادویہ'' ہے، دورِ اول کی یہ پہلی اور مستند جامع کتاب ہے، کتاب بڑے سلیقے سے مرتب کی گئی ہے، اس میں آیورویدک دواؤں کے نام اور خواص بھی درج ہیں۔

حقائق الادویہ: یہ کتاب ''حقائق الادویہ'' یہ جامع کتاب کی حیثیت رکھتی ہے، کتاب کی ترتیب اس طرح ہے کہ جملہ ادویہ کو پہلے دو بڑی قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱۔معدنی دوائیں ۲۔نباتاتی اور حیوانی دوائیں

آج کل کی اصطلاح میں جن کو نامیاتی اور غیر نامیاتی (0rganic inorganic) کہتے ہیں، نامیاتی ادویہ کی مزید قسمیں کی گئی ہیں۔

اس ضخیم اور مستند کتاب میں پہلے کل پانچ سو پچاسی دواؤں کے نام اور ان کی صحیح پہچان بتائی گئی ہے، پھر ان سب کی خاصیت اور اثرات کے لحاظ سے ان کے چار درجے قائم کئے گئے ہیں: (۱) گرم وتر دوائیں (۲) گرم اور خشک دوائیں (۳) سرد اور تر دوائیں

(۴) سرد اور خشک دوائیں، اس درجہ بندی کے بعد ان کے فائدے اور نقصانات بتائے گئے ہیں۔

معدنی ادویہ

معدنی ادویہ میں موفق نے کئی نئی دوائیں دریافت کیں، مثلاً سوڈیم کاربونیٹ (sodiumcarbonate) اور پوٹاشیم کاربونیٹ (potassiumcar bonate) مشہور دوائیں ہیں، وہ ان کے فرق کو بتاتا ہے اور اثرات بیان کرتا ہے۔

موفق معدنی مرکبات بھی بتاتا ہے، ان میں ارسینک آکسائڈ اور اینٹی مونی اکسائڈ (antimony oyid) نیز سلی سیک آکسائڈ (silcil oxid) ان سب معدنی مرکبات کی اصلیت، خواص، اثرات اور فائدے اور نقصانات ہروی نے یہ سب باتیں بیان کی ہیں۔

(۱۰) عُریب بن سعید الکاتب قرطبی (۳۵۶ء= ۹۷۶ء)

اندلس کے دانشوروں میں عُریب بن کاتب قرطبی ایک خاص اہمیت کا مالک تھا، یہ الحکم ثانی ۹۷۶ء کے عہد میں گذرا ہے، عُریب قرطبہ میں پیدا ہوا، یہیں پرورش پائی، تعلیم کی تکمیل کے بعد مطالعۂ کتب میں مصروف ہوگیا اور علمِ طب کو خدمتِ خلق کے لئے اپنا پیشہ بنایا، اس نے طبی تحقیقات کا ایک خاص میدان اپنے لئے منتخب کیا، خلق اللہ کو اس سے بہت فائدہ پہنچا، عبدالرحمٰن جس کا زمانۂ حکومت طویل ترین ۹۱۲ء تا ۹۶۱ء تقریباً پچاس سال رہا ہے، اس نے عُریب کی فنی قابلیت دیکھ کر اسے اپنا طبیبِ خاص مقرر کیا، اس وقت سے عُریب زندگی بھر دربار سے منسلک رہا۔

علمی خدمات اور کارنامے

عُریب ایک عالی دماغ طبیب اور مستقل مزاج مفکر تھا، اس نے عورتوں کے امراض پر ریسرچ کیا، چنانچہ حمل سے متعلق تمام کیفیتوں کے سلسلے میں بڑی تحقیق وجستجو سے کام لیا، مشاہدے اور تجربے کئے، اور نتائج کو ڈائری میں قلم بند کرتا رہا، اس کے خاص

مضامین تھے:

(۱)حمل کا قیام......جنین اوراس کی ساخت (۲) زچہ اور بچّہ (۳) دایہ گری۔اس سے پہلے اس موضوع پر کبھی توجہ نہیں دی گئی تھی،اس نے تربیت یافتہ دایہ کا نصاب مرتب کرکے اس کی تعلیم وتربیت کا انتظام کیا۔

عُریب نے اپنے جملہ تجربات اور نظریات تفصیل سے قلم بند کیے، ان کو کتابی صورت میں الگ الگ مرتب کیا،علم طب کے اس خاص موضوع پر اس طبیب کی یہ تینوں کتابیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور اس علم سے متعلق یہ تینوں کتابیں سب سے پہلی تصنیف کہی جاتی ہیں۔

عُریب علم نباتات (botony) کا بھی ماہر تھا،اس نے اس اہم موضوع پر بھی ایک کتاب مرتب کی جس میں پودوں اور جڑی بوٹیوں سے متعلق اپنے تجربات بیان کیے ہیں۔

(۱۱) ابوالقاسم عمار موصلی (۳۸۸ھ=۱۰۵۵)

عمار موصلی امراضِ چشم،موتیا بند کا ماہر تھا (eye surgeon) اس نے موتیا بند کے سلسلے میں تحقیق کی اور اس کا علاج آپریشن کے ذریعہ ثابت کیا،مرض موتیا بند (cataract) تکلیف دہ مرض ہے،اور انسان آنکھیں رکھتے ہوئے مجبور ہو جاتا ہے، یہ مشہور طبیب الحاکم ۹۹۶ء کی عہد میں پیدا ہوا اور اس کے بیٹے کے عہد میں کام کیا۔

علمی اور طبی خدمات اور کارنامے

موصلی نے امراضِ چشم کے علاج سے متعلق ایک نیا طریقہ اختیار کیا اور بہت کامیاب رہا،اور یہ طریقہ آپریشن کا تھا،آنکھوں کے بعض امراض میں آپریشن کے ذریعہ علاج بہت کامیاب اور اطمینان بخش ثابت ہوا،موصلی آنکھوں کا پہلا سرجن تھا (eye surgen)۔

امراضِ چشم میں موتیا بند (catract) ایک عام مرض ہے جس میں آنکھوں کی

تپلی پر ایک باریک پردہ آجاتا ہے، موتیا بند کے لئے آپریشن کا طریقہ اسی مشہور ماہرِ امراض چشم کا ایجاد کردہ ہے، موصلی نے سرکاری اسپتال میں بے شمار مریضوں کی آنکھوں کا آپریشن کیا۔

عمّار موصلی نے آپریشن کے لئے ایک خاص قسم کا نازک آلہ ایجاد کیا، اس نے آپریشن کے اصول وقاعدے مقرر کئے، احتیاط اور علاج کا طریقہ بتایا، حفظِ ماتقدم کے اصول بیان کئے، اور اپنی یہ تمام باتیں اور تجربے قلم بند کئے، موصلی نے اپنی اس ڈائری کو کتاب کی صورت مرتب کرکے اس کا نام ''علاج العین'' رکھا، ''علاج العین'' امراضِ چشم اور علاج واحتیاط کے بارے میں مکمل اور جامع کتاب ہے، یہ کتاب یورپ میں بہت مقبول ہوئی، اور اس کا ترجمہ یورپین زبان میں کیا گیا۔

(۱۲) ابوالقاسم خلف بن عباس زہراوی (۳۹۵ھ = ۱۰۰۹ء)

ابو القاسم الزھراوی یورپین اسے ابو الکیس اور البوکسیس کہتے ہیں، قرطبہ کے قریب زہر نامی شہر جسے اندلس کا مشہور حکمراں عبدالرحمٰن الناصر نے قرطبہ سے چار میل دور آباد کیا تھا، وہاں پیدا ہوا، اس کی پیدائش ۹۳۶ھ کو ہوئی، ابوالقاسم نے ابتدائی تعلیم ختم کرنے کے بعد قرطبہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا، اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے علم طب کے شعبۂ جراحت (surgen) کی طرف خصوصی توجہ اور اس فن میں کمال پیدا کیا، زہراوی دنیا کا پہلا سرجن (surgen) تھا، تعلیم ختم کرنے کے بعد مطالعہ سے قابلیت بڑھائی، فن طب میں تجربہ حاصل کئے، اور شہرت کے بعد شاہی اسپتال میں اسے شعبۂ جراحت کا ذمہ دار بنایا گیا۔

علمی خدمات اور کارنامے

ابوالقاسم الزھراوی نے غور وفکر اور تجربہ کے بعد علاج کے دو طریقے مستقل ایجاد کئے: (۱) علاج دوا کے ذریعہ (۲) علاج آپریشن کے ذریعہ۔

ابو القاسم نے سرجری (آپریشن) کے ذریعہ علاج کے طریقے کو مرتب کیا

اور اسے ایک مستقل فن بنادیا، اس نے بتایا کہ کون کون سے امراض میں آپریشن ضروری ہے، سر سے پاؤں تک کے امراض کو اس نے بتایا، مثلاً حلق میں غدود کا بڑھ جانا (ٹونسل) بد گوشت، آنکھ میں موتیا بند کا مرض، پھوڑے، پھنسیاں وغیرہ۔

زہراوی نے آپریشن کے ذریعہ علاج کے طریقہ کو بہت ترقی دی، اس نے آپریشن کرنے کے لئے بہت سے آلات ایجاد کئے، یہ آلات مختلف مواقع پر استعمال کئے جاتے ہیں، اس طبیب نے سر سے پاؤں تک ایسے امراض جن میں آپریشن کی ضرورت پڑتی ہے، اس کے مطابق آلات بنائے، اس طرح اس عظیم طبیب نے جو آلات ایجاد کئے ان کی تعداد ۱۰۰ سے اوپر ہے، زہراوی نے آپریشن کے آلات میں صفائی پیدا کی اور ان کو سبک بنانے کی کوشش کی، تا کہ وہ اور زیادہ کارآمد ہوں، اس کے لئے اعلیٰ قسم کا فولاد استعمال کیا، زہراوی کے ایجاد کردہ آلات آج بھی مستعمل ہیں۔

زہراوی نے اندرون جسم آپریشن کرنے کے نہایت نازک طریقے دریافت کئے، حلق، دماغ، سر، گردے کا آپریشن، پیٹ کا آپریشن، آنتوں کا آپریشن، ان سب کے طریقے اور اصول اس نے بتائے

مرض کینسر (سرطان) پر بھی اس نے تحقیق کی، اس نے آگاہ کیا کہ مرضِ کینسر کے پھوڑے یا زخم کو ہرگز چھیڑنا نہیں چاہیئے، وہ خطرناک بن جاتا ہے۔

اس نے ہڈیوں کے کاٹنے کا طریقہ، آلات اور احتیاط کو بتلایا، اس نے یہ بھی بتایا کہ مریض کو بے ہوش کس طرح کرنا چاہیئے، کیا دوائیں اس کے لئے مناسب ہیں، اس نے اپنے تمام تجربات اور نظریات اپنی مشہور کتاب ''التصریف لمن عجز عن التالیف'' میں بیان کردیئے ہیں۔

پیٹ میں ہڈیاں

ابوالقاسم خلف بن عباس الزہراوی نے اپنی مشہورِ زمانہ کتاب میں واقعہ درج کیا ہے کہ اس نے ایک حاملہ عورت کو دیکھا جس کے پیٹ میں بچہ مرگیا تھا، اس کے بعد وہ دوسری مرتبہ حاملہ ہوئی، وہ بچہ بھی مرگیا جس کی وجہ سے کچھ زمانے کے بعد پیٹ میں ورم

ہوگیا اور پھول گیا پھر اس میں مواد بھی آ گیا، ابوالقاسم زہراوی کو علاج کے لئے بلایا گیا، اس نے کافی روز علاج کیا، جب کوئی فائدہ نہیں ہوا تو اس نے طاقتور مراہم استعمال کروائے، کچھ عرصہ کے بعد عورت کی شرمگاہ سے ایک ہڈی خارج ہوئی، کافی دن گذرنے کے بعد پھر دوسری ہڈی نکلی، اسے بہت تعجب ہوا کہ پیٹ ایسی جگہ ہے جہاں ہڈی نہیں ہوسکتی، اس نے اسی سے اندازہ لگایا کہ پیٹ میں مردہ بچہ کی ہڈیاں موجود ہیں، پھر زہراوی نے آپریشن کیا اور بقیہ ہڈیاں عورت کے پیٹ سے نکال لیں، اس کے بعد وہ عورت صحت مند ہوگئی اور کافی لمبے عرصہ تک زندہ رہی۔

(۱۳) علی بن عیسیٰ (۴۴۱ھ = ۱۰۳۱ء)

امراضِ چشم کا ماہرِ خصوصی (EYE SPECIALIST) تجربہ اور تحقیق کے بعد قوت بصارت کو قائم رکھنے، نیز آنکھوں کے مفید ترین دوائیں، مناسب غذائیں وپرہیز تجویز کر کے ان کی مکمل فہرست پیش کرنے والا، آنکھوں کے امراض، اسباب وعلامات پر بحث کرنے والا۔

وطن غالباً بغداد، یہ شخص خلیفہ عیسیٰ عباسی کے عہدِ حکومت میں گذرا ہے۔

علمی خدمات اور کارنامے

یہ ان قابل ترین وباصلاحیت اطباء میں سے ہے جنہوں نے خاموشی کے ساتھ علمی وفنی کام کیئے، اس نے شہرِ بغداد میں گوشۂ گمنامی میں زندگی گذاری۔

اس نے اجزائے جسم میں سے صرف آنکھ کا انتخاب کیا اور جسم کے اس اہم ترین اور نازک ترین حصہ پر تحقیقی کام کیا، اس نے آنکھ کے امراض پر زبردست تحقیقات اور پھر اپنے جملہ ذاتی تجربات، مشاہدات اور نظریات کو اپنی صحیح اور معیاری کتاب تذکرۃ الکحلین میں جمع کر دیں۔

تذکرة الكحلين

یہ کتاب نہایت مفصل اور ضخیم ہے، گویا یہ انسانی آنکھ کی انسائیکلو پیڈیا ہے، کتاب کا

بڑا حصہ امراضِ چشم کے اس ماہر ڈاکٹر (EYE SURGEON) کے ذاتی تجربات اور مشاہدات پر مبنی ہے، کتاب کی پہلی جلد میں اس نے آنکھ کے مفصل حصوں کی تشریح اور منافعِ اعضاء یعنی ہر ہر جزء اور حصہ کو بیان کیا ہے اور اس کے فوائد بتائے ہیں جس کو انگریزی میں ''ٹانومی اور فریالوجی'' (ANATOMY PHYIOLLAGY) کہتے ہیں۔

دوسری جلد میں آنکھ کی ان بیماریوں کا علاج ہے جو ظاہری طور پر نظر آتی ہیں، علی بن عیسیٰ نے آنکھ کے جملہ ظاہری بیماریوں کو بتایا اور اس کے اسباب وعلامات تفصیل سے لکھے اور مکمل بحث کی۔

تیسری جلد نہایت اہم ہے، اس میں آنکھ کے ان بیماریوں کا علاج تفصیل سے بیان کیا گیا ہے جو آنکھ کے اندرونی حصوں میں کہیں پیدا ہوتے ہیں جو آنکھوں کے لئے مفید ہیں، اور ان کو آنکھ کے امراض اور شکایتوں کے سلسلے میں استعمال کیا جاتا ہے۔

کتاب میں ایک سو تینتالیس ر۱۴۳ ایسی مفرد دواؤں اور جڑی بوٹیوں کے نام، ان کی پہچان ان کے خواص واثرات اور فوائد بیان کئے ہیں، جو آنکھوں کے لئے مفید ہیں اور ان کو آنکھ کے امراض اور شکایتوں کے سلسلے میں استعمال کیا جاتا ہے۔

کتاب کے ایک حصہ میں احتیاط اور پرہیزی غذاؤں کا بھی مفصل بیان ہے، آنکھ کے مریضوں کے لئے جو غذائیں مفید اور اچھی ہیں ان کو بتایا گیا ہے اور جن غذاؤں سے نقصان ہوتا ہے یا نقصان اور تکلیف کا اندیشہ ہے ان کو لکھ دیا گیا ہے۔

آنکھ کے سلسلے میں یہ کتاب مفصل، معیاری اور مستند تسلیم کی گئی ہے، اس فن میں یہ دوسری قابلِ ذکر کتاب ہے، ازمنۂ وسطیٰ میں اس کتاب کا ترجمہ لاطینی زبان میں ۱۴۹۹ء میں شائع ہوا اور یورپ کے ڈاکٹروں نے اس کی اہمیت کو سمجھا اور دورِ جدید کے دانشوروں نے اسے جب غور سے پڑھا تو اس کی افادیت کا احساس ہوا اور اسکا ترجمہ ۱۹۰۳ء میں فرانسیسی زبان میں شائع ہوا، پھر اس مفید کتاب کو ۱۹۰۴ء میں جرمن زبان کے قالب میں ڈھالا گیا۔

(۱۴) شیخ حسین عبداللہ بن علی سینا (EVICENNA)

دنیا کی باکمال اور جامع شخصیت، علم طبعیات (PHYSICS) اور حیاتیات کا ماہرِ خصوصی، علمِ تشریح الأعضاء (BIOLOGY) منافع الأعضاء (PGYSIOLOGY) نیز علم الاصلاح اور علم الامراض (METRAMEDICA) پر گہری نظر رکھنے والا ماہر، نئے نئے نکتے بیان کرنے والا عظیم محقق، علم الادویہ کا ماہر (PHARMADY)، دواؤں اور جڑی بوٹیوں پر نئے نئے تجربہ کرنے والا، مشاہدے اور تحقیق سے کام لینے والا طبیبِ حاذق۔

بخارا کے ایک شہر خرمتین کے قریب واقع مقام افشنہ میں ۳؍صفر ۳۷۵ھ مطابق ۹۸۰ء میں پیدا ہوا اور وفات ہمدان میں ۴۲۸ھ؍۱۰۳۸ء میں ہوئی۔

والد کا نام اسماعیل تھا، پانچ سال کی عمر میں شہر بخارا میں ابتدائی تعلیم حاصل کی، دس سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کرلیا، وقت کے مشہور فقیہ اسماعیل زاھد سے علم فقہ اور ایک نامور ہندسہ داں، سبزی فروش محمود مساح سے علم ہندسہ، اور مساحت وریاضت کا درس لیا، کمالِ ذہانت کی وجہ سے قلیل مدت میں ان پر مہارت حاصل کرلی، اسی طرح ایک نامور عالم اور فلسفی عبداللہ نائلی وارد بخارا ہوا، چنانچہ شیخ کے والد نے فرزند کی تعلیم کے لئے ان کو مہمان کیا، چنانچہ جوہرِ قابل کی ذہانت دیکھ کر ایک عظیم عالم ہونے کی پیشن گوئی کی اور علم منطق پڑھائی۔

شیخ کو علمِ نحو کا شوق ہوا تو امیر نوح بن منصور سلمان بخارا کے درباری طبیب حسن نوح القمری کے حلقۂ درس میں شریک ہوکر اس فن میں کمال حاصل کیا، سولہ سال کی عمر میں تمام مروجہ علوم سے فراغت حاصل کرلی، پھر مجلس درس کو رونق بخشی، ان کے اطراف شاگردوں کا ہجوم ہوتا تھا۔

علمی خدمات اور کارنامے:

انہیں دنوں حاکمِ وقت نوح بن منصور سخت بیمار ہوا، درباری اطباء کا علاج کارگر نہ

ہوا تو شیخ کو طلب کیا گیا، جن کے علاج سے صحت یاب ہو گیا، اس طرح شیخ کی دربار میں رسائی ہوئی، شوقِ مطالعہ، ذوقِ علم کو دیکھتے ہوئے شیخ کے لئے شاہی کتب خانے کے دروازے کھول دیئے گئے۔

بو علی سینا وہ پہلا طبیب ہے جس نے فن طب میں علم النفس (psychology) کو داخل کیا، اس نے بتایا کہ تمام نفسیاتی کیفیات، یعنی خوشی، غم، غصہ، فکر و تردد وغیرہ کا تعلق قلب سے ہوتا ہے۔

اس نے کم عمری ہی سے تصنیف و تالیف کو شغل بنایا، بے شمار تصانیف مختلف موضوعات پر یادگار چھوڑیں، شیخ کی یوں تو بے شمار تصنیفات ہیں، لیکن دو کتابیں خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں، جنہوں نے اسے سائنسدانوں کی صفِ اول میں لا کھڑا کیا، ''القانون'' اور ''کتاب الشفاء''

''کتاب الشفاء'' میں اس نے فلسفہ اور حکمت پر سیر حاصل بحث کی۔

شیخ فن طب اور علم تشریح الاعضاء اور منافع الاعضاء (PGYSIOLOGY) نیز علم العلاج (METRAMEDICA) میں اس کے انکشافات اور نظریات آج بھی مستند سمجھے جاتے ہیں۔

''شفاء'' کے بعد ''القانون'' شیخ کی یہ مشہور زمانہ تصنیف ہے، اس میں دس لاکھ الفاظ ہیں، اور پانچ جلدوں میں ہے، یہ عظیم ترین اور قابلِ فخر تصنیف صحیح معنوں میں علم تشریح الاعضاء، منافع الاعضاء اور علم العلاج کا ایک مکمل ترین انسائیکلو پیڈیا ہے۔

''القانون'' کی پہلی جلد میں شیخ نے انسانی جسم کے جملہ اعضاء اور نازک سے نازک حصوں کی مکمل تفصیل و تشریح بیان کی ہے، ان کے کام اور فوائد بیان کئے ہیں، اس لحاظ سے یہ جلد تشریح الاعضاء اور منافع الاعضاء پر مشتمل ہے۔

''القانون'' کی دوسری جلد میں تمام مفرد ادویہ اور جڑی بوٹیوں کو ترتیب سے لکھا ہے، ان کے خواص و اثرات بیان کئے ہیں، شیخ نے اپنے مشاہدات اور تجربات بتائے ہیں، گویا یہ جلد کتاب المفردات ہے۔

تیسری اور چوتھی جلدوں میں انسانی امراض پر بحث ہے،مختلف بیماریوں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے ، اسباب وعلامات بتائے گئے ہیں ، نظری اور عملی علم العلاج (theory and practice of medicin)کے سلسلے میں یہ جلد نہایت وسیع اور مستند معلومات پر مکمل حاوی ہے۔

القانون کی پانچویں جلد القرابادین ہے جو مختلف بیماریوں کے لئے مجرب دواؤں اور نسخوں کا مستند مجموعہ(prescription book) ہے

شیخ سینا کی مشہور کتاب ''القانون'' یورپ کے میڈیکل کالجوں میں داخلِ نصاب رہی ہے۔

اس کتاب کی اہمیت وافادیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ پندرھویں صدی میں کتاب سولہ مرتبہ اور سولہویں صدی میں بیس مرتبہ چھپی،اور لاطینی زبان میں اس کتاب کے کئی ترجمے شائع ہوئے۔

القانون کا وہ حصہ جو آنکھ کے امراض اور علاج میں ہے،اس کا ترجمہ ڈاکٹر نیپر نے جرمن زبان میں کر کے شائع کیا ہے۔

فرنچ زبان میں بھی اس کتاب کے ترجمے شائع ہوئے۔

بہر حال شیخ بوعلی سینا اپنے زمانے کا بہت بڑا محقق،مفکر اور مصنف گذرا ہے،اسکی زندگی ابتلاء وآزمائش کی زندگی تھی،کبھی تو وہ وزارتِ عظمیٰ کے بلند ترین عہدے پر متمکن نظر آتا ہے،اور کبھی غربت میں جان کے خوف سے بلاد وامصار اور جنگلوں کی خاک چھانتا پھرتا ہے۔

مذہبی رنگ اور دینی مزاج

بوعلی سینا نہایت بلند اخلاق وعادات کے مالک تھے ، طبیعت میں بے نفسی اور فقیری غالب تھی،حرص وہوس اور عیش وعشرت کے عادی نہ تھے۔

یہ ابتداء ہی سے راسخ العقیدہ مسلمان تھے،ان کے باپ اور بھائی دونوں اسماعیلی تھے اور شیخ کو بھی اس کی دعوت دیتے تھے،انہوں نے ان کی دعوت قبول نہ کی،تعلیم کے

ابتدائی زمانہ میں جب کوئی مشکل مسئلہ پیش آتا تو شیخ سیدھا جامع مسجد جاتے، نماز پڑھتے جس کے نتیجے میں وہ پیچیدہ مسئلہ حل ہو جاتا۔

ان کے یہ اقوال بھی ان کے دینی مزاج کے غماز ہیں۔

''اے میرے عزیز دوست! یہ میری وصیت ہے اسے یاد رکھو، تم کو اول وآخر اپنے ذہن وخیال میں اللہ جل شانہ کو رکھنا چاہیئے، اور اسکے دیدار کا سرمہ اپنی آنکھوں میں لگانا چاہئے، نماز میں اللہ تعالیٰ کے سامنے نہایت ادب سے کھڑا رہنا چاہئے۔

تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ سب سے بہتر کرامت ''نماز'' ہے اور سب سے زیادہ سکون اور اطمینان بخشنے والا عمل روزہ ہے، سب سے فائدہ بخش نیکی صدقہ اور سب سے زیادہ رائیگاں کوشش ''ریاکاری'' ہے۔

(۱۵) ہبۃ اللہ ابوالبرکات بغدادی

ہبۃ اللہ ابوالبرکات بغدادی محدم بن ملک شاہ کے دور میں بغداد میں ایک نامور طبیب گذرا ہے، ہبۃ اللہ بچپن میں بغداد آ گیا، اس نے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد علمِ طب کو پسند کیا اور علمِ طب کے حصول کی طرف توجہ کی، یہ عراق میں پیدا ہوا، اور بعمر ۹۰ سال میں انتقال کیا۔

ابوالبرکات نے ابوالحسن سعید بن ہبۃ اللہ ایک مشہور طبیب سے علم طب حاصل کیا۔

علمی خدمات اور کارنامے

ہبۃ اللہ ابوالبرکات بغدادی نامور طبیب، فلسفی، جغرافیہ کا ماہر (geologist) اور علمِ اخلاقیات (moral pgilosophy) اور روحانیت (spirtyal) میں کامل تھا۔

ابوالبرکات کا شمار بغداد کے نامور اساتذہ میں ہوتا ہے، خصوصاً علم طب میں باکمال شخصیت کا وہ مالک تھا، اور طبابت میں اس نے بڑا نام پیدا کیا، بڑے بڑے شاہانِ وقت اور امراء نے اس سے علاج کرایا اور شفایاب ہوئے، ہر جگہ خلعت وانعام واکرام

سے نوازا گیا۔

یہ شروع میں یہودی تھا اور ایک مشہور یہودی خاندان سے تعلق رکھتا تھا، مگر مسلمان ہو گیا۔

وہم کا علاج وہم سے

بغداد میں ایک شخص کو مالیخولیا ہو گیا، اسے وہم تھا کہ اس کے سر پر مٹی کا مٹکا رکھا ہے، اس خیال سے وہ کسی دروازے میں بغیر جھکے ہوئے داخل نہیں ہوتا تھا، راستہ میں مٹکے کے گرنے کے اندیشہ سے لوگوں سے ہٹ کر چلتا تھا، یہ مرض اس کے لئے بے حد تکلیف دہ تھا، اس کا علاج بھی ممکن نہ تھا، اوحد الزمان ابوالبرکات ھبۃ اللہ البغدادی کے پاس اسے لایا گیا، حکیم سمجھ گیا کہ وہم کا علاج وہم سے ممکن ہے، اس نے اپنے دو غلاموں کو سمجھا دیا کہ ان میں سے ایک مکان کی چھت پر مٹی کا مٹکا لے کر جا کر بیٹھے، اور دوسرا لکڑی لئے ہوئے تیار رہے، وہ مریض کو بلا کر صحن میں ایسی جگہ بٹھائے گا جو چھت سے قریب ہو، جب اشارہ کرے تو لٹھ بند غلام اس طرح لکڑی گھما کر مارے کہ مریض پر تو نہ لگے مگر کچھ فاصلہ سے ہو کر اس کے سر پر سے گذر جائے اور اس کی چھت پر جو غلام ہے وہ مٹی کے مٹکے کو یوں پھینکے کہ مریض کے پاس آ کر گرے اور ٹوٹ جائے۔

یہ انتظام کر کے حکیم اوحد الزماں ھبۃ اللہ نے مریض کو اپنے پاس بلایا، دیوان خانے کے باہر سائبان کے نیچے بٹھا دیا اور خود بھی وہیں بیٹھ کر باتیں کرنے لگا، جس وقت دیکھا کہ مریض محوِ گفتگو ہے، چپکے سے ہاتھ سے اشارہ کر دیا، ساتھ ہی نیچے کے غلام نے لکڑی گھمائی اور وہ مریض کے سر پر سے اس کی لاٹھی زناٹا بھرتے ہوئے نکل گئی، اور چھت پر جو غلام تھا اس نے مٹکا نیچے گرا دیا، یہ کام ایسی صفائی سے ہوا کہ مریض کو بالکل یقین ہو گیا کہ جو مٹکا ٹوٹا ہے وہی ہے جو اس کے سر پر رکھا ہوا تھا، اس طرح سے اس کو وہم سے گلوخلاصی ہوئی۔(۱)

مذہبی رنگ اور دینی مزاج

اس کے دینی مزاج کا اندازہ اس کے ان اقوال سے لگایا جا سکتا ہے ”اعمال کی

(۱) الحکیم لاھور، اکتوبر: ۱۹۵۹ء

بنیاد مکافاتِ عمل ہے، جیسی کرنی ویسی بھرنی، جو ذرہ برابر نیکی کرے گا اسے نیکی ملے گی، جو ذرہ برابر بدی کرے گا اس کا بدلہ پائے گا، خدا جو خالق اور مالک ہے وہ منصف ہے، انسان کی نیکیوں پر وہ خوش ہوتا ہے اور ثواب دیتا ہے، اور برائیوں پر ناراض ہو کر عذاب دیتا ہے۔

اور ایک جگہ کہتا ہے: ''روحانی معاملات اور ہیں اور ہماری آنکھوں سے بالاتر ہیں، مادیات میں غلطی کا امکان ہے، آنکھ غلط بھی دیکھ سکتی ہے، عقل غلط بھی سمجھ سکتی ہے، مگر روحانی امور ذوق ووجدان سے تعلق رکھتے ہیں، وہاں چشمۂ بصیرت چاہئے''۔

پیغمبر مخبر صادق ہے، حق ہے، سچا ہے، اسکا دل اور سینہ صحیفۂ کائنات ہے، وہ حق دیکھتا ہے، حق کہتا ہے اور حق باتوں کی خبر اس کے ذریعہ دی گئی ہے، وہ قطعی اور یقینی ہے۔

(۱۶) علاء الدین ابوالحسن ابن النفیس القرشی

علاء الدین ابوالحسن ابن النفیس القرشی دمشق میں پیدا ہوا، ابتدائی تعلیم کے بعد ابن الدخوار جو علم حدیث اور فن طب میں باکمال سمجھا جاتا تھا، اس کے حلقۂ درس میں شامل ہو کر تعلیم مکمل کی، یہ فن طب میں علم تشریح الاجسام کا ماہر، امراضِ چشم کا باکمال طبیب، جسم میں خون کے بارے میں تحقیق کرنے والا، دورانِ خون کو ثابت کرنے والا۔

علمی خدمات اور کارنامے

علم طب میں ابن النفیس کا نام دنیا کے ممتاز طبیبوں کی فہرست میں ذکر کیا جاتا ہے، تعلیم سے فراغت کے بعد ابن النفیس مصر پہنچا اور قاہرہ کے ایک بڑے شفاخانے میں افسر اعلی کی حیثیت سے بہت دنوں تک خدمات انجام دیتا رہا۔

امراضِ چشم پر اس نے بڑی تحقیق اور تجربے کئے، اور فن کے اس خاص شعبہ میں کمال پیدا کیا، ابن النفیس ایک محقق تھا، اس نے شیخ بوعلی سینا کی مشہور کتاب القانون پر اچھی بحث کی، وہ بعض مقامات پر شیخ سے اختلاف بھی کرتا ہے۔

دورانِ خون (circulation of blood) کی تحقیق کرنے والا پہلا شخص تھا۔

لیکن ابن النفیس کا سب سے بڑا کارنامہ جس نے اسے زندہ جاوید بنادیا، یہ ہے کہ وہ انسانی جسم کے نظام پر ایک نئے زاویہ سے غور کرتا ہے، وہ تجربے کے بعد ثابت کرتا ہے کہ انسان کے جسم میں خون رواں دواں رہتا ہے، وہ پورے اعتماد سے کہتا ہے کہ خون وردیدی شریان (veinousartery) سے ہوکر گذرتا ہےاور پھر پھیپڑوں میں پہنچ کر تازہ ہوا سے ملتا ہے، اور پھر صاف ہوکر پورے جسم میں دورہ کرتا ہے، اس طرح خون پورے جسم کے ہر حصہ میں پہنچتا رہتا ہے۔

آج عام طور پر دورانِ خون کا نظریہ سرفتیس (servetus) نامی ایک پرتگالی سائنسداں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، یہ غلط ہے، امریکی پروفیسر فلپ نے اس خیال کی سخت تردید کی ہے، پروفیسر فلپ کہتا ہے:

''سرفتیس سولھویں صدی کا سائنسداں ہے، اس سے کوئی تین سو برس پہلے دورانِ خون کے اس نظریئے کو ایک مسلم طبیب اور سائنسداں نے دریافت کیا تھا، وہ ابن القرشی ہے، اس مسلم سائنسداں نے دورانِ خون کے نظرئے کو واضح طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا'' ولیم ہاروے (wiliem harvey) کو بھی دورانِ خون کا محقق کہا جاتا ہے، لیکن ولیم ہاروے ۱۶۸۷ء کا دانشور ہے، ابن النفیس اس سے کئی برس پہلے (کوئی تین سو برس سے اوپر) دورانِ خون کے بارے میں اپنا نظریہ پیش کرچکا تھااور اپنی کتاب میں تفصیل سے بحث کرچکا تھا''۔

یورپ کے دانشور دورانِ خون کی دریافت کا سہرا ولیم ہاروے (۱۶۸۷ء) کے سر باندھنا چاہتے تھے، اس کے لئے طبی کانگریس کے اجلاس کے جلسے میں اعلان ہونے والا تھا، لیکن دس جون ۱۹۵۷ء کو دنیا کی مشہور خبر رساں ایجنسی (rellterlondon) کے ذریعہ یہ تحقیقی خبر ساری دنیا میں پہنچ گئی کہ دورانِ خون کے نظریہ کو دریافت کرنے والا ایک مسلم سائنسداں ابن النفیس القرشی تھا جو قاھرہ (مصر) کا ماہر طبیب تھا۔

اس کی ولادت ۱۲۰۱ء میں ہوئی اور وفات ۱۲۸۹ء بعمر ۸۸ سال۔

(۱۷)لسان الدین ابن الخطیب

لسان الدین ابن الخطیب اندلس کا مایہ ناز طبیب اور محقق گذرا ہے، پورا نام ابوعبد اللہ محمد بن عبداللہ ہے، لسان الدین لقب تھا، ابی الخطیب یا ابن الخطیب سلمانی کے نام سے شہرت حاصل کی، ۲۵/رجب المرجب ۷۱۳ھ مطابق /نومبر ۱۳۱۳ء غرناطہ کے پاس المرج کے مغربی سرے پر دریائے شبیل کے قریب واقع مقام لوشنہ میں ولادت ہوئی۔

بڑے اہم خانوادے کا فرزند تھا، اس کا خاندان بنوزیر کے نام سے بڑی شہرت کا مالک تھا، پہلے شام سے ہجرت کر کے قرطبہ آیا، پھر طلیلہ سے غرناطہ میں مقیم رہا۔

اس کے ابتدائی عہد کے حالات نہیں ملتے، اتنا ملتا ہے کہ جوانی کے دن اپنے والد کے ساتھ غرناطہ میں گذارے، یہاں اس کا باپ بنونضر کے دربار میں نہایت جلیل القدر عہدہ پر فائز تھا، یہیں سے ابن الخطیب کو بڑے بڑے علماء اور فضلاء سے علم حاصل کرنے کا شرف حاصل ہوا

۱۳۴۰ء میں اپنے والد کے انتقال کے بعد وزیر علی بن حباب کے یہاں ملازمت کر لی، لیکن قسمت نے زیادہ دنوں تک ساتھ نہیں دیا، اور ۱۳۴۹ء میں علی بن حباب بھی دنیا سے چل بسے، اس کے بعد سلطان ابوالحجاج یوسف بن خطیب پر توجہ کی، یہ توجہ کچھ گراں ہوئی، چنانچہ یوسف کے قتل کے بعد اس پر عتاب کا دور شروع ہوا اور اسے مراکش جانا پڑا جہاں اس نے ۱۳۶۲ء تک گوشہ نشینی کی زندگی گذاری، اسی سال جب محمد خمیس دوبارہ تخت نشیں ہوا ۱۳۷۱ء میں اس کے دشمنوں نے سازش کر کے اس کو قتل کر دیا۔(۱)

علمی خدمات اور کارنامے

لسان الدین ابن الخطیب ایک جامع شخصیت کا مالک تھا، یہ ایک اچھا شاعر، مؤرخ، جغرافیہ داں، اور فلسفی تھا، لیکن وہ ایک طبیب اور محقق کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہوا، اس نے مختلف عنوانات کے تحت بہت سی کتابیں لکھی ہیں، مؤرخین اس کی کتابوں کی کل تعداد ساٹھ بتاتے ہیں، ان میں سے صرف ایک تہائی کتابیں محفوظ رہ گئی ہیں۔

---

(۱) تاریخ الخلفاء: حکیم غلام جیلانی

عالی دماغ ابن الخطیب کا سب سے بڑا کارنامہ جس نے اس کو زندہ جاوید کردیا ،اس کا یہ پتہ لگانا ہے کہ بعض امراض پھیل جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو لگ جاتے ہیں اور بعض امراض نہیں پھیلتے ، پھیلنے والے امراض وبائی صورت اختیار کر لیتے ہیں ،اور گھر کے گھر صاف کر دیتے ہیں ،ان امراض کو متعدی امراض کہتے ہیں۔

امراض متعدی کی دریافت کے بعد ابن الخطیب نے یہ پتہ چلایا کہ متعدی امراض پھیلتے کیوں ہیں ،اس نے بڑے جدوجہد اور کاوش کے بعد یہ پتہ چلایا کہ یہ امراض باہر سے آکر لگ جاتے اور اس کے پھیلنے کے اسباب وہ نہایت باریک کیڑے ہوتے ہیں جو نظر نہیں آتے ،مگر وہ مرض کے کیڑے ہیں ،ان لگنے والے کیڑوں کا نام اس ہوش مند محقق نے جراثیم (germs) رکھا۔

جراثیم کی دریافت اس طبیب کا عظیم کارنامہ ہے ،جس نے آئندہ چل کر طبی دنیا میں زبردست انقلاب پیدا کردیا ،ابن الخطیب کی اس دریافت کو یورپ کے دانشوروں نے تسلیم کیا۔

(۱۸) اسحاق بن عمران بغدادی

اسحاق بن عمران بغداد کا رہنے والا تھا ،خلیفہ معتمد (۸۷۰۔۸۹۲) کے عہد میں موجود تھا ،ابن جلجل کا کہنا ہے کہ یہ شخص مسلمان تھا ،یہ پہلا طبیب تھا جس نے سب سے پہلے یوروپ میں جاکر طب کی اشاعت کے فرائض انجام دیئے ،ابتدائی حالات کتابوں میں نہیں ملتے ، زیادہ بن اغلب التمیمی نے اسے قیروان بلایا تھا ،اس نے تین شرطوں پر رضامندی کا اظہار کیا تھا کہ اول ایک ہزار دینار ،دوم اس کی ذاتی سواری ،سوم یہ کہ جب بغداد جانا چاہے تو وہ واپس چلا جائے۔

چنانچہ وہ یہاں لوگوں کو اپنی صلاحیتوں سے مستفید کرتا رہا ،اسی دوران اس نے رقادہ میں قائم شدہ بیت الحکمت میں بھی خدمات انجام دیں ،اس کے بعد وہ ابراہیم ثانی کے بیٹے عبداللہ ثانی کے دربار سے وابستہ ہوگیا ،آخر میں زیاداللہ ثالث (۹۰۳۔۹۰۹ء)

کے دربار میں بھی رہا، اس دربار میں اس کے اچھے دن نہیں تھے، ابن ابی صبیعہ نے لکھا ہے کہ: چونکہ زیادۃ اللہ نے اسحاق کی جملہ شرائط پوری نہیں کی تھیں، اس لئے وہ اس سے بدظن تھا، دوسری وجہ یہ لکھی ہے کہ اسحاق اسے بہت سی چیزیں کھانے سے منع کرتا تھا، اس طرح کی باتوں سے غلط فہمی اتنی بڑھی کہ زیادۃ اللہ نے ۲۹۴ھ=۹۰۷ء میں نہایت تکلیف دے کر اسے قتل کردیا، اوراس کی نعش پھانسی کے پھندے پر لٹکا دی، اور خشک ہونے کے بعداس میں شکرے نے گھونسلہ بنایا۔ جس روز اس کو قتل کیا گیا، اس دن اس نے زیادۃ اللہ سے کہا کہ: تم اپنے آپ کو عرب کا سردار کہتے ہو، مگر تم میں ایسی کوئی خوبی نہیں ہے، میں نے بہت دن پہلے تم کو ایک زہر دیا ہے جو تمہیں جلد ہی بری موت مار ڈالے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا، جو وقت اسحاق نے بتایا تھا، اسی وقت زیادۃ اللہ نہایت بری موت سے مرا یعنی پہلے وہ پاگل ہوا، اور پھر کچھ دنوں کے بعد اسی عالم میں دنیا سے رخصت ہوگیا۔(۱)

علمی خدمات اور کارنامے

قیروان کے دوران قیام ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ دربار سے علاحدگی کے بعد کامیاب مطب کرتا رہا، علاج کے سلسلے میں متقدمین کے طرز پر اخلاط کو بڑی اہمیت دیتا تھا، تشخیص کے لئے نبض وبول وبراز کا معائنہ اسکے مطب کی خاص شناخت تھی، وہ اپنے مطب میں طب کی تعلیم کا درس بھی دیتا تھا، چنانچہ علی بن اسحاق، زیاد بن خلفوان، اسحاق بن سلیمان اسرائیلی اور ابوبکر محمد بن جراح کے نام اس کے شاگرد کی حیثیت سے لئے جاتے ہیں۔

اس کی اہم طبی تصنیفات میں ''کتاب الأدویۃ المفردۃ''، ''کتاب العنصر والتمام فی الطب'' شامل ہیں۔

طبی مہارت وحذاقت کے واقعات

آفریقہ کا حاکم زیادۃ اللہ اغلبی (۹۰۳-۹۰۷ء) دمہ کا پرانا مریض تھا، ایک دن اس نے خالص دہی پی لیا، اس کے پینے کے تھوڑی دیر بعد ہی زیادۃ اللہ کو سانس کی تنگی کا

(۱) طبی ڈائجسٹ، حیدرآباد، مئی ۱۹۶۱ء

دورہ پڑااور یہاں تک نوبت پہنچی کہ سانس اکھڑنے لگی، زیادۃ اللہ نے اپنے طبیب اسحاق بن عمران کے منع کرنے کے باوجود دہی پیا تھا، اور دربار میں ایک دوسرے طبیب نے جو جو یہودی تھا، دہی پینے کے لئے ترغیب دی تھی، دراصل یہ یہودی طبیب اسحاق بن عمران سے پیشہ وارانہ بغض رکھتا تھا۔

اس لئے اس نے اسحاق کو نیچا دکھانے کے لئے اوراس کی عداوت میں زیادۃ اللہ کو دہی استعمال کرنے کی ہدایت دی تھی، لیکن جب حاکم کی یہ حالت دیکھی تو یہودی طبیب بھی گھبرا گیا۔

سب لوگ اسحاق بن عمران کی طرف رجوع ہوئے، اسحاق نے علاج کرنے سے انکارکردیا، اور کہا کہ: اب تم اس یہودی طبیب سے ہی علاج کرواؤ جس نے دہی استعمال کرنے کی اجازت دی ہے، لیکن خوشامد کرکے اس کو کسی نہ کسی طرح راضی کرلیا گیا، اسحاق نے علاج شروع کیا اور بہت سی برف منگوا کر زیادۃ اللہ کو کھلائی اور پھر قئی کرائی، اس ترکیب سے تمام دہی جو برف کی ٹھنڈک پا کر بستہ ہوگیا تھا قئی کے ذریعہ باہر نکل آیا۔

(۱۹) ابن وافد

ابوالمطرف عبدالرحمٰن بن محمد بن عبدالکبیر یحیی بن وافد بن ہند اللخمی اندلس کا نہایت مشہور طبیب تھا، شہرِ طلیلہ میں ۳۸۷ھ=۹۹۷ء میں پیدا ہوا، وہ بڑے علمی اور باعزت خانوادے سے تعلق رکھتا تھا، اس سے زیادہ اس کے حالاتِ زندگی نہیں ملتے، تعلیم کے سلسلے میں کتابوں میں مذکور ہے کہ اس نے ارسطو اور دیگر فلاسفر کی کتابوں سے پڑھنا شروع کیا، اس کے بعد اس نے جالینوس اور دیسقوردیس کی طبی کتابوں کا مطالعہ کیا، مفرد ادویہ اس کا خاص موضوع تھا، تمام مفردات کی کتابوں کا اس نے بالاستیعاب مطالعہ کرکے اس میں منفرد حیثیت حاصل کرلی۔

خاص طور سے دیسقوریدس کی ''کتاب الحشائش'' اور جالینوس کی ''الادویۃ المفردۃ'' کا عربی متن اسے زبانی یاد ہوگیا۔

علمی خدمات اور کارنامے

عمر بھر مفردات کی تحقیق میں لگا رہا، ۲/سال لگاتار محنت کے بعد علم الأدویۃ پر نہایت شاندار کتاب تصنیف کی۔

ابن ابی صبیعہ اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: اس کتاب کی ترتیب نہایت عمدہ تھی، اس میں ابن وفد نے ادویہ مفردہ کی تمام خاصیتوں اوران کے درجات کو بہت خوبصورتی سے جمع کرلیا تھا، ۲۰/سال کی محنت کے بعد یہ کتاب اس قدر جامع ہوئی تھی کہ کوئی بات ایسی نہیں تھی جواس میں درج نہ ہو۔

علاج کے سلسلے میں اس کا اپنا منفرد انداز تھا، وہ ممکن حد تک مرض کا علاج غذا سے کرتا تھا، اگر وہ دوا کا استعمال ضروری ہوتو پہلے مفردات سے علاج کیا جائے اس کے بعد مرکب دواؤں کا استعمال کیا جائے

اس نے درج ذیل کتابیں یادگار چھوڑیں۔

۱- کتاب الادویۃ المفردۃ: یہ کتاب اپنے موضوع پر جامع کتاب ہے، ابن بیطار نے اپنی کتاب ''الجامع المفردات الادویة والأغذیة ''میں اس کے حوالے بکثرت لکھے ہیں، ادویہ کی ماہیت کے تضاد کے سلسلے میں اس کی رائے اکثر فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔

۲- كتاب الوساد في الطب ۔

۳- مجربات في الطب ۔

۴- كتاب تدقيق النظر في علل حاسّة البصر ۔

(۲۰) ابن زہر

پورا نام ابو مروان عبد الملک بن أبی العلاء زہر بن ابی العلاء زہر بن ابی مروان عبد الملک بن محمد بن مروان بن زہر ہے، یورپ میں avenzor کے نام سے مشہور ہے، اشبیلہ میں پیدا ہوا، اس کی تاریخ پیدائش مختلف فیہ ہے، زیادہ قرینِ قیاس یہی ہے کہ وہ

۱۹۰۱ء میں پیدا ہوا۔

ابن زہر کے نام سے تاریخ کی کتابوں میں کئی ایک نام ملتے ہیں، یہ طبیب کتاب التیسیر کا مصنف تھا، یہ نہایت ذی علم خاندان کا شخص تھا، ابن زہر شروع عمر جوانی میں مغرب کے فرماں بردار خاندان رابطین کا شاہی طبیب اور ابراہیم بن یوسف بن تاشفین اس خاندان کے آخری بادشاہ کا طبیب خاص رہا، خلیفہ عبد المومن کے دربار میں بھی ابومروان ابن زہر کو شاہی طبیب کی خدمات حاصل رہیں، بعد میں وزارتِ عظمی کا قلم دان بھی اس کے سپرد کیا گیا

علمی خدمات اور کارنامے:

ابن ابی صبیعہ نے لکھا ہے کہ: عبد المومن اس پر بے حد اعتماد کرتا تھا، ابن زہر نے اس کے لئے تریاق سبعی کا مرکب تیار کیا تھا جو بعد میں سات دواؤں کے مرکب کی شکل میں تریاقِ انثلہ کے نام سے مشہور ہوا۔

ابن زہر کا مرتبہ بحیثیتِ معالج بہت بلند تھا، اپنی حذاقت اور طبابت کی بدولت تمام عمر خلفاء کے دربار میں نہایت عزت و اکرام کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا۔

منور جہاں رشید نہ ول ڈیوراں کے حوالہ سے لکھا ہے کہ: ابن زہر جالینوس کے بعد سب سے بڑا طبیب تھا، طب کے علاوہ علم الجراحت میں دسترس رکھتا تھا، گردے کی پتھری، قصبۃ الریہ کی جراحت اور نزول الماء کے علاوہ اور بہت سی حالتوں کی حاجت میں وہ زبردست مہارت رکھتا تھا۔

اس کی معالجانہ مہارت اور تشخیصی مہارت کے سلسلہ میں درج ذیل واقعات دلچسپ معلومات فراہم کرتے ہیں۔

مشہور ہے کہ خلیفہ عبدالمؤمن مسہل دواؤں سے بہت گھبراتا تھا، چنانچہ ابن زاہر نے یہ تدابیر اختیار کی کہ شاہی باغ میں انگور کی بیل کو مسہل ادویہ کے خیساندہ سے سیراب کرنا شروع کیا، یہ سلسلہ چلتا رہا، جب پھل آئے تو عبد المومن کو وہی انگور کھلائے، اس طرح اسے دوسرے مسہلات کے استعمال سے نجات مل گئی۔

دوسرا واقعہ یوں ہے کہ خلیفہ کے جانے کے راستہ میں ابن زہر کو ایک مریض دکھائی دیتا تھا، اس کا پیٹ پھول گیا تھا، اور اس کا بدن زرد پڑ گیا تھا، اس مریض نے جب ابن زہر سے علاج کرانا چاہا تو ابن زہر نے مریض سے اس کے سرہانے رکھے ہوئے گھڑے کو توڑنے کی ہدایت دی، چنانچہ جب گھڑا توڑا گیا تو اس سے ایک مینڈک نکلا، ابن زہر نے کہا: تیری بیماری کا یہی سبب تھا، بعد میں مریض تندرست ہو گیا

ابنِ زہر نے اپنی ''کتاب التیسیر'' میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ اشبیلہ کے حاکم کے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہوا کہ اسے موت آ گئی ہے اور اس کے اندر قوتِ گویائی وقوتِ حرکت ختم ہو گئی ہے، میں نے اسکی نبض دیکھی، لیکن اس میں ان سب چیزوں کی علامت نہیں تھی، البتہ نبض سے مزاج کی گرمی یا معدہ میں کسی گرم خلط کی موجودگی کا پتہ چلتا تھا، میں نے بہت سی دوائیں دیں، مگر کسی سے بھی فائدہ نہیں ہوا، دوسرے اطباء نے بھی اس کا علاج کیا ،مگر ان کی دوا نے بھی کوئی کام نہیں کیا، میں اسبابِ مرض پر برابر غور کرتا رہا، اور آخر اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس کا سبب کوئی اندرونی شئی ہے جو باہر سے جسم میں داخل ہوئی ہے، میں نے مریض کے تیمارداروں سے اس کے پینے کے پانی کو منگوایا، جیسے ہی میں نے اس پانی کو منہ سے لگایا تو مجھ کو ایک ناگوار بو محسوس ہوئی، بعد میں میں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ پانی کے برتن میں غلیظ اور سڑا ہوا گوشت پڑا ہوا ہے، اور اس میں کیڑے پیدا ہو گئے ہیں، اس متعفن گوشت سے بخارات پیدا ہو کر دماغ کی طرف چڑھ رہے تھے، جس سے وسوسہ کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی، میں نے مریض کے تیمارداروں سے بتایا کہ مریض جو پانی استعمال کر رہا ہے، یہی اس کے مرض کا سبب ہے جس کے دور کرنے پر مرض بھی ختم ہو گیا۔

بحیثیتِ مصنف ابن زہر نے مشرق ومغرب میں کافی شہرت حاصل کی ہے، خاص طور سے اس کی تصنیف ''کتاب التیسیر'' نمایاں اہمیت کی حامل ہے۔

مذہبی رنگ اور دینی مزاج

ابن زہر امورِ شرعیہ کا سخت پابند اور دینی مزاج کا مکمل پرتو اور خیر وبھلائی کو پسند کرنے والا واقع ہوا تھا۔

(۲۱) صالح بن بہلہ

سرزمین عرب پر پہلا کامیاب ترین ہندوستانی طبیب صالح بن بہلہ کے نام کے سلسلے میں مورخین میں اختلاف پایا جاتا ہے، کچھ نے صالح بن بہلہ اور کچھ نے ابن سہل لکھا ہے، ڈاکٹر زبیر صدیقی کا خیال ہے کہ یہ لفظ صالے تھا، جو عربی زبان میں کثیر الاستعمال ہوکر صالح ہوگیا، موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ ممکن ہے کہ وہ مسلمان ہوگیا ہو، اوراس کے بعد اس کا نام صالح رکھا گیا ہو، یہ بات زیادہ درست معلوم ہوتی ہے؛ کیونکہ قاضی اطہر مبارک پوری نے ہندوستانی اطباء کی فہرست میں ایک طبیب کا نام حسن بن صالح بن بہلہ لکھا ہے، قرینِ قیاس یہ ہے کہ اسلام لانے کے بعد اس کے لڑکے کا مسلمان نام رکھا گیا ہو۔(۱)

علمی خدمات اور کارنامے

یہ شخص ویدک علاج کا بڑا ماہر تھا صحت اور ہلاکت کے متعلق پیشن گوئی میں مہارت رکھتا تھا، اس کی تصنیفی حیثیت مؤرخین تسلیم نہیں کرتے، البتہ ایک کامیاب معالج کی حیثیت سے ابن ابی صبیعہ کے حوالے سے درج ذیل واقعہ تقریباً تمام مصنفین نے لکھا ہے۔

ایک مرتبہ ہارون رشید کا چچا زاد بھائی بہت زیادہ بیمار ہوگیا، درباری اطباء کے علاج سے کوئی فائدہ نہ ہوا، معاملہ جندی نیشاپوری طبیب جبریل بن بختیشوع کے بھی بس کا نہ رہا، مسئلہ خلیفۂ وقت ہارون رشید کے پاس پہنچا، اس نے اپنے مشیر کاروں سے مشورہ طلب کیا تو جعفر بن یحی برمکی جو ہندوستانی اطباء کو بہت پسند کرتا تھا، اس نے کہا: جبریل رومی طب کا ماہر ہے، اس کی ناکامی کے بعد طبیب صالح بن بہلہ سے علاج کرایا جائے، ہارون رشید کے حکم سے صالح بن بہلہ نے علاج کیا، لیکن علاج کے کچھ دنوں کے بعد اس کی اطلاع ہارون رشید کو پہنچی تو اس صالح بن بہلہ کو سخت لعنت ملامت کی اس پر صالح بن

(۱) خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان:۳۸۴

بہلہ اپنی بات پر اٹل رہا اور اس نے دوسری دوائیں استعمال کرائیں بالآخر وہ اس مرض سے شفایاب ہوا اور کافی دنوں زندہ رہا۔(۱)

(۲۲) ابن بیطار

اس کا پورا نام ابو محمد عبد اللہ بن احمد المالقی النباتی تھا، اسی نسبت سے اسے مالقی اور اندلسی بھی کہتے ہیں، لیکن ابن بیطار کے نام سے مشہور ہوا، ۱۱۹۷ء میں بمقام ملاگا پیدا ہوا، یہ اپنے زمانے کا سب سے بڑا نباتاتی طبیب تھا، اور ملک الکامل کا درباری طبیب تھا، اس نے ادویہ کی شکل وصورت، جائے پیدائش، افعال وخواص کا پتہ لگایا، ابن بیطار میں بچپن ہی سے نباتی پودوں سے دلچسپی تھی۔

علمی خدمات اور کارنامے: علمِ نباتات کے سلسلے میں ابن بیطار عمر بھر سفر کرتا رہا، چنانچہ تاریخی حوالوں میں مذکور ہے کہ ۲۰ر سال کی عمر میں وہ مراکش، الجزائر کا سفر کرتے ہوئے ۱۲۲۴ء میں تونس وارد ہوا، اس سلسلہ میں مصر پہنچا، یہاں اس کی ملاقات ایوبی خاندان کے مشہور بادشاہ الملک الکامل سے ہوئی، ملک الکامل ابن بیطار کے نباتی ذوق وتجسس کو دیکھ کر بہت متأثر ہوا اور اس کے کام دیکھ کر اپنے یہاں ''رئیس العشاب'' نباتات کا افسرِ اعلیٰ مقرر کیا، اس کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے ملک صالح نجم الدین کے دور میں بھی ابن بیطار کو عزت واکرام سے نوازا جاتا رہا۔

ابن بیطار ساری عمر نباتات کی تحقیق کے لئے مشرق ومغرب کے ممالک کا سفر کرتا رہا، بالآخر ۱۲۴۸ء میں بہ مقام دمشق وفات پائی۔

ابن البیطار کی درج ذیل کتابوں کا تذکرہ حوالوں میں ملتا ہے (۱) کتاب الجامع لادویۃ المفردۃ والأغذیۃ'' (۲) الابانۃ والاعلام (۳) کتاب المعنی فی العلاج بالادویۃ المفردۃ

ابن بیطار کی طبی حذاقت ومہارت

ایک مرتبہ ایک شخص نے ایک بوٹی بادشاہ کو دی اور کہا کہ: ابن بیطار نے اپنے

---

(۱) عیون الانباء فی طبقات الاطباء : ۳۳/۲

آپ کو بہت قابل سمجھتا ہے، اس کو یہ بوٹی سونگھنے کے لئے دیں تا کہ اندازہ ہوسکے کہ اس کے اندر کتنی قابلیت ہے، چنانچہ بادشاہ کے حکم سے ابن بیطار نے بوٹی کو ایک طرف سے سونگھا، سونگھتے ہی ناک سے خون جاری ہوگیا، یہ دیکھ کر سبھی لوگ حیرت زدہ ہوگئے، مگر فوراً ہی اس نے بوٹی کو دوسری طرف سے سونگھا تو ایکدم خون کا بہنا بند ہوگیا، ابن بیطار نے کہا کہ: اب یہ بوٹی کو خود وہ شخص بھی سونگھے جو اس کو لایا ہے، تا کہ اس کی قابلیت کا بھی اندازہ ہوسکے، ورنہ اس کو جاہل سمجھا جائے گا، بادشاہ کے حکم سے اس شخص نے بھی بوٹی کو ایک طرف سے سونگھا، سونگھتے ہی اس کی ناک سے بھی خون جاری ہوگیا، لیکن اس کو یہ نہیں معلوم تھا کہ بوٹی کو دوسری طرف سونگھنے سے خون بند ہوتا ہے، چنانچہ وہ شخص خون بند کرنے میں ناکام رہا، اور اس کی ناک سے کافی خون بہہ گیا جس سے اس کی حالت خراب ہوگئی، اور خون زیادہ نکل جانے کی وجہ سے وہ قریب المرگ ہوگیا، بادشاہ کو تشویش ہوئی اس نے بوٹی کو دوسرے رخ سے سونگھنے کو کہا، جیسے ہی اس شخص نے سونگھا نکسیر فوراً بند ہوگئی۔

(۲۳) حکیم علی گیلانی

حکیم علی گیلانی عہدِ اکبری کا نہایت نامور طبیب تھا، مشہور زمانہ علمی مرکز گیلان کا باشندہ تھا، ۹۶۲ھ/۱۵۵۴ء میں پیدا ہوا، اس کے اہم متعلقین میں اس کے ماموں حکیم الملک شمس الدین گیلانی اور حکیم فتح اللہ شیرازی کے نام خاص طور قابلِ ذکر ہیں۔

علومِ عقلیہ کی تعلیم شیخ عبدالنبی بن شیخ احمد گنگوہی سے حاصل کی، طب حکیم فتح اللہ شیرازی سے سیکھا، بے حد پریشان حال اور مفلسی کے حالات میں ہندوستان آیا، کچھ دن دکن میں قیام کر کے دہلی آنا ہوا جہاں خوش قسمتی سے شاہی ملازمت ملنے سے حالات بہتر ہوئے، مذہب کے لحاظ سے شیعہ تھا، بے حد خلیق اور شریف انسان تھا، حالات سنبھلتے ہی اس نے اپنی جیب سے ۶/ہزار روپے سالانہ غریبوں کے لئے وقف کردیا۔

طبیب اور مصنف ہونے کے علاوہ اسے تعمیرات سے بھی گہری دلچسپی تھی، لاہور کا عجیب وغریب حوض بھی اس کی فن تعمیر کا شاہکار ہے۔

حذاقت اور طبی مہارت

حکیم علی گیلانی نے ایک مرتبہ رمضان المبارک میں عین افطار کے وقت مچھلی کھالی، جس سے شدید پیاس لگی، اور اس کے ازالہ کے لئے انہوں نے بہت زیادہ پانی پی لیا، اور کئی کٹورے خالی کر دئے، اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ پیٹ پھول گیا اور سانس لینے میں تنگی ہونے لگی، پیٹ کا تناؤ اتنا بڑھ گیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ پیٹ پھٹ جائے گا، حکیم نے اپنے مرض پر غور کیا، اور نتیجہ یہ نکالا کہ یہ سب مچھلی کا فساد ہے، جس سے غلیظ رطوبت پیدا ہوگئی ہے، جب تک یہ جسم سے باہر نہیں نکلے گی تکلیف دور نہ ہوگی، چنانچہ انہوں نے دارچینی کو پانی میں جوش دے کر پی لیا جس سے فوراً قئی شروع ہوگئی اور مادۂ غلیظہ قئے کے ذریعہ خارج ہوگیا، اور تمام شکایات رفع ہوگئیں۔(۱)

مشہور ہے کہ ان کی حذاقت کے امتحان کے لئے شہنشاہِ اکبر نے حکیم علی کے سامنے مریض، صحت مند گائے اور گدھے کے قارورے پیش کئے، حکیم علی نے تجربہ اور قیاس کی بناء پر فوراً تینوں کی علاحدہ شناخت کرادی، ان کی اس حذاقت سے اکبر بادشاہ (۱۶۹۶ء) میں بہت خوش ہوئے اور ان کو اپنے دربار میں نہایت اہم مقام عطا فرمایا۔(۲)

(۲۴) حکیم محمد ہاشم علوی خاں

ان کا اصلی نام سید محمد ہاشم بن حکیم محمد ہادی بن مظفر الدین علوی تھا، رمضان ۱۰۸۰ھ = ۱۶۷۰ھ میں دار العلم شیراز میں پیدا ہوئے، ۱۶۹۹ء میں ہندوپاکستان آئے اور عالمگیر بادشاہ کی خدمت میں خلعت و منصب سے سرفراز ہوئے، محمد اعظم شاہ کی خدمت پر بھی متعین ہوئے، شاہ عالم بہادر شاہ کے عہد میں علوی خطاب ملا، اس کے علاوہ منصب میں بھی اضافہ ہوا اور جاگیر ملی، محمد شاہ بادشاہ کا بہت کامیاب علاج کیا، بادشاہِ موصوف نے چاندی میں تلوایا، شش ہزار منصب، تین ہزار روپیہ ماہوار ملا، اور معتمد الملک کے خطاب سے نوازا گیا، نادرشاہ بہت اعزاز کے ساتھ اپنے ہمراہ لے گیا، وہاں سے حج

(۱) حکایات الاولیاء:۴۹

(۲) اخبارِ کراچی: اپریل:۱۹۹۵ء

بیت اللہ کو گئے، ۱۷۴۳ء میں دہلی واپس ہوئے، ان کی تصانیف میں ''جامع الجوامع'' قبادین، مطب حکیم علوی خاں، حاشیہ شرح اسباب وعلامات، شرح موجز القانون، احوال اعضاء النفس اور خلاصہ اور قوانین علاج وغیرہ ہیں، ان میں سے سب سے مشہور ''جامع الجوامع'' ہے جو اسم با مسمی ہے، ۱۵/رجب ۱۱۱۶ھ/۱۷۷۹ء میں مرضِ استسقاء میں وفات ہوئی اور وصیت کے مطابق حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مزار کے قریب میں دفن کیا گیا۔(۱)

(۲۵) حکیم محمد شریف خاں

حکیم محمد شریف خاں ۱۷۱۴ء میں بعہدِ محمد شاہ (م ۱۷۴۸ء) پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم دہلی کے مشہور محدث اور عالم حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے مدرسہ میں ہوئی، حکیم عابد سرہندی اور حکیم اچھے صاحب سے طب کی تعلیم حاصل کی، اپنے والد حکیم اجمل خان سے مطب سیکھا، بہت کامیاب مطب رہا، مغل بادشاہ کے درباری طبیب بھی رہے ہیں، آپ کو اشرف الحکماء کا لقب دیا گیا تھا۔

علمی اور طبی خدمات

زبردست حذاقت کی بناء پر حکیم شریف خاں نے بہت جلد شہرت حاصل کر لی، آپ کا مطب دہلی میں مرجع الخلائق تھا، صبح ہی سے بھیڑ لگ جاتی تھی، مطب کے بعد آپ کے اہم شاگردوں میں موری گیٹ کے مرزا محمد کامل عرف پنجہ نے بہت دنوں تک نمایاں خدمات انجام دیں، اسکے علاوہ بہت سے شاگرد ہند و پاک میں طبی خدمات انجام دیتے رہے ہیں، طبی مہارت کی وجہ سے حکیم صاحب کو شاہی طبیب مقرر کیا گیا تھا اور ضلع پانی پت میں ۲۵ ہزار کی جاگیر عطا کی گئی تھی، دربار سے آپ کو اشرف الحکماء کا لقب بھی دیا گیا تھا۔

سرسید احمد خاں اپنی مشہور کتاب آثار الصنادید میں حکیم شریف خاں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ اپنے عصر میں سرآمد حکماء اور سرحلقۂ اطباء تھے، آج تک ان کے کمالات کا شہرہ از بس بلند ہے، جالینوس اور ارسطو کا فلسفہ ان کے سامنے ایسا ہی ہے جیسے

(۱) طبی مقالات: ۳۸۶

طوطی کی آواز نقار خانے میں۔

ان کے تصانیف میں ''علاج الامراض''،''عجالۂ نافعہ''،''میزان الطب''،''حدود الأمراض''،''قواعدِ شریفیہ''،''حاشیہ کلیاتِ نفیسی''،''حاشیہ شرح اسباب''،''تحفۂ عالم شاہی''، ''شرح حمیات قانون''،''دستور الفصد''،''تالیفِ شریفی''،''رسالہ خواص الجواھر''،''رسالۂ چوبِ چینی'' یہ سب شامل ہیں ۱۸۹۷ء میں دہلی میں وفات پائی تھی اور درگاہ قطب صاحب مہرولی میں دفن ہوئے۔

آپ نے مشکوۃ شریف کا فارسی ترجمہ ''کاشف المشکوۃ'' کے نام سے کیا ہے، اس کے علاوہ شاہ عالم ثانی کے حکم سے قرآن شریف کا اردو ترجمہ بھی کیا تھا۔

(۲۶) حکیم مومن خان

حکیم مومن خان مومن بن حکیم غلام نبی خاں (۱۲۴۱ھ) بن حکیم نامدار خان کوچۂ جیلان دہلی میں پیدا ہوئے، تعلیم کا آغاز گھر سے ہوا، پھر ابتدائی تعلیم شاہ عبد العزیز صاحبؒ کے مدرسہ میں شروع ہوئی، اس کے بعد شاہ عبد القادرؒ سے شرفِ تلمذ حاصل کیا اور انہیں سے عربی، فارسی، حدیث، فقہ اور منطق وغیرہ کی تعلیم حاصل کی، طب کی تعلیم اپنے چچا حکیم غلام حیدر خان اور والد حکیم نبی خان سے حاصل کی، آپ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے، اس کے علاوہ علم نجوم اور فن موسیقی میں بھی دسترس رکھتے تھے، آپ ایک اچھے عامل بھی تھے، ۱۸۵۱ء میں دہلی میں وفات پائی۔

طبی حذاقت اور کارنامے

ایک مرتبہ حکیم مومن خان مطب میں مریضوں کا معائنہ کرر ہے تھے، ایک شخص آیا اور اس نے اپنی نبض حکیم صاحب کی طرف بڑھائی، حکیم صاحب نے نبض دیکھ کر نسخہ لکھ دیا اور کہا کہ: ان دواؤں کو عطار سے خرید لیں، کچھ روز بعد وہ شخص حکیم صاحب کے پاس آیا، حکیم صاحب نے نبض دیکھ کر اس سے نسخہ مانگا، اس پر مریض تعجب کے انداز میں کہنے لگا کہ: اس نسخہ کو تو میں برابر دو دن سے ابال کر پی رہا ہوں اور مجھے کافی فائدہ ہے اور میرا

مرض اب تقریباً ختم ہوگیا ہے، آپ وہی نسخہ پھر مجھے لکھ کر دیں، تاکہ رہا سہا مرض بھی ختم ہوجائے، حکیم صاحب نے بجائے ناراض ہونے یا تعجب کرنے کے مریض کی فرمائش پر وہی نسخہ پھر لکھ دیا اور شاگردوں سے کہا کہ: مریض کو اس نسخہ پر اعتماد ہوگیا ہے، اسلئے اگر میں ٹوکتا اور اس کی غلطی بتاتا تو پھر اس کو مزید فائدہ نہیں ہوسکتا تھا، اسلئے میں نے مریض کے اعتقاد کو مجروح نہیں کیا۔(۱)

(۲۷) حکیم شیر علی بن حکیم محی الدین

حکیم شیر علی بن حکیم محی الدین صدیقی نے علم طب کی درسی کتابیں اپنے والد ماجد سے پڑھیں، اس کے بعد لکھنو میں حکیم امام بخش کی سرپرستی میں مطب شروع کیا اور پھر طبیب حاذق ہوکر نواب آصف الدولۃ بہادر کے دورِ حکومت میں تحصیل داری اور فوجداری کی؛ لیکن بڑھاپے میں گوشہ نشیں ہوگئے، نہایت متقی وصوم وصلوۃ کے پابند تھے، ہر وقت ذکر واذکار میں مشغول رہتے تھے، آپ کے نسخے میں دوا کے اجزاء بہت کم ہوتے تھے، مریض کو دیکھنے گھر نہیں جاتے تھے، مطب سے جو آمدنی ہوتی اسے غرباء میں تقسیم کردیتے تھے۔

۱۸۴۰ء میں بخار واسہال کے عارضے میں چند روز مبتلا رہ کر ۷۵/سال کی عمر میں وفات پائی، سات بیٹے اور پانچ بیٹیاں یادگار چھوڑیں، بیٹوں میں ہر ایک طبیب حاذق تھا۔

طبی خدمات اور حذاقت

ایک مرتبہ لوگ ایک بچے کو حکیم شیر علی احمد آبادی کے پاس لائے، یہ بچہ کان کے درد کی وجہ سے بے ہوش تھا اور جب ہوش آیا تو کہتا تھا کہ کوئی چیز میرے کان میں کاٹ رہی ہے، حکیم صاحب نے فرمایا کہ: حقہ کی نلکی لائی جائے تو اس کو انہوں نے اس کو قلم کی طرح چھری سے تراشا جوان کے قلم دان میں تھی، اور اس بیمار بچہ میں لگادی، اور دوسری طرف جلتا ہوا ایک فتیلہ رکھ دیا، ذرا دیر نہ ہوئی تھی کہ بچہ کا درد رفع ہوگیا، جب نلکی کو زمین پر مارا تو اس میں ایک ہزار پایہ جسے کھنکھجورہ کہتے ہیں باہر نکلا جسے دیکھ کر لوگ حیران رہ گئے۔

---

(۱) ہندوستان کے مشہور اطباء: ۴۷

(۲۸) حکیم کفایت اللہ (ولادت ۱۸۰۰ء)

حکیم کفایت اللہ ولد حکیم علیم اللہ امروہہ ضلع مرادآباد کے محلّہ کوٹ میں ۱۸۰۰ء میں پیدا ہوئے، عربی علوم وفنون مفتی شرف الدین رامپوری سے اور طب اپنے والد سے پڑھی، تشخیص میں گویا الہام ہوتا تھا، معالجہ میں یکتائے زمانہ تھے، نسخہ اکثر قلیل الاجزاء لکھتے اور غرباء کے لئے دوائیں مفت دیتے تھے، بعض کتبِ درسیہ پر حواشی بھی لکھے، مگر کوئی تصنیف طبع نہیں ہوئی، جملہ والیان ملک ان کی صحبت چاہتے تھے، اور رؤساء ضلع باادب گفتگو کرتے تھے، زیرِ علاج مریضوں کے قیام وطعام کا انتظام بھی کرتے تھے، ان کے والد حکیم علیم اللہ بھی طب میں امامِ وقت تھے اور انہوں نے حکیم جلال الدین امروہوی سے طب کی تعلیم حاصل کی اور حکیم جلال الدین، حکیم علوی خان دہلوی کے ارشد تلامذۃ میں سے تھے، حکیم علیم اللہ نوابین رامپور سے متعلق رہ کر زیادہ تر رامپور میں ہی رہے، اور بہت نیک نامی وشہرت پائی، حکیم اعظم خان ان کی علمی وعملی شخصیت سے بہت متاثر رہے، ''قرابادین اعظم'' میں گیارہ مقامات پر ان کے معمولات کا بطورِ خاص ذکر کیا ہے، حکیم کفایت اللہ مرحوم نے دو فرزند حکیم حکمت اللہ اور حکیم رفعت اللہ یادگار کے طور پر چھوڑے۔(۱)

طبی حذاقت ومہارت کے واقعات

رامپور میں عبدالنبی ولد جنگی خان دق میں مبتلا ہوکر حکیم محمد کفایت اللہ خان (۱۸۰۰-۱۸۵۴ء) کے علاج میں آیا اور آپ کے علاج سے مکمل طور پر صحت یاب ہوا مگر حکیم صاحب نے ہدایت فرمائی کہ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو جماع سے پرہیز ضروری ہے، ایک شب پیمانۂ صبر لبریز ہوا اور ہدایت پر عمل جاری نہ رہ سکا، رات ہی میں سخت طبیعت خراب ہوئی، صبح قارورہ لے کر حکیم صاحب کے پاس بھیجا گیا، آپ نے قارورہ دیکھا اور نسخہ لکھ دیا، نسخہ عطار کے پاس پہنچا، عطار حیران تھا کہ دوا کیا دے، اس میں تو کفن ودفن کا سامان

(۱) تذکرۃ کاملان رامپور:۳۳۶

لکھا ہے، اعزہ گھر آئے تو مریض سفرِ آخرت پر روانہ ہو چکا تھا۔(۱)

(۲۹) حکیم محمود خان دہلوی

حکیم محمود خان بن حکیم صادق علی خان بن حکیم شریف خان ۱۸۱۶ء میں اکبر شاہِ ثانی (۱۸۰۶ء-۱۸۳۷ء) کے عہد میں دہلی میں پیدا ہوئے، طب کی ابتدائی تعلیم اپنے بڑے بھائی حکیم غلام محمد اور اپنے والد حکیم صادق علی خان سے حاصل کی، آپ نہایت حاذق طبیب اور ماہر جنسیات تھے، آپ کا مطب مرجعِ خلائق تھا، دن رات مریضوں کا ہجوم رہتا ہے، باوضع بزرگ، اور غرباء پرور تھے، مطب میں امیر وغریب کی کوئی تفریق نہیں تھی، آپ کے مزاج میں کافی غصہ تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ نہایت عابد وزاہد متقی وتہجد گذار بھی تھے، جنسی مسائل پر آپ نے بہت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، اس سلسلے میں آپ کی دو مشہور تصنیفات بھی ہیں، ''ضیاء الأبصار فی حدة الباة ''اور کارنامۂ عشرت''، حکیم محمود خان نے ۱۸۵۷ء کا پرآشوب زمانہ بھی دیکھا تھا، اور قید وبند کی صعوبتیں بھی برداشت کی تھیں، آپ نے ۱۳۰۹/۱۸۹۱ اور بقولِ بعض ۱۹۰۰ء میں دہلی میں وفات پائی، ان کی ایک کتاب ''مطب محمود خان'' کے نام سے بھی ہے۔

طبی حذاقت ومہارت کے واقعات

حکیم محمود خان صاحب کے پاس ایک مریض آیا، اس کے سر میں شدید درد تھا، اور وہ کافی پرانا ہو چکا تھا، کسی بھی علاج سے دور نہیں ہوتا تھا، حکیم صاحب نے تشخیصِ مرض کے لئے مریض سے مختلف سوالات کئے، مریض نے بتایا کہ درس سے پہلے ناک سے خون آیا تھا، حکیم صاحب سمجھ گئے کہ سر کی رگوں میں خون منجمد ہو گیا ہے، اور اسی وجہ سے یہ شکایت ہے، آپ نے بہدانہ بھگو کر اور اس میں مصری ڈال کر بوقتِ صبح استعمال کرنے کو کہا، دو تین روز تک استعمال کرنے کے بعد مریض کی ناک سے خون کے جمے ہوئے لوتھڑے خارج ہوئے، جب تمام خون خارج ہو گیا تو مریض کو کافی سکون محسوس ہوا اور اس کا برسوں کا دردِ سر دور ہوا۔

(۱) آئینۂ عباسی امروہہ: ۲۹-۳۰

(۳۰) حکیم عبدالولی بن حکیم عبدالعلی لکھنوی

یہ ۱۸۷۱ء میں بمقام لکھنو پیدا ہوئے، حفظِ قران کے بعد مولوی سید مقیم رائے بریلوی سے ابتدائی تعلیم حاصل کی، اعلیٰ تعلیم مولوی افہام اللہ فرنگی محلی سے حاصل کی، اورطب کی تعلیم اپنے والد حکیم عبدالعلیؒ اور چچا عبدالعزیزؒ سے حاصل کی،اس کے بعد درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا، عام روش سے ہٹ کر حکیم صاحب نے اپنے درس میں عبارت کے بجائے مسائل طبیہ پر روشنی ڈالنے اوران پر بحث وگفتگو کرنے کو اپنا شعار بنایا تھا،آپ کے شاگردوں میں بہت مشہور علماء بھی شامل تھے مثلاً: امام اہل سنت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ، حکیم عبدالحی حسنی، مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی، اور حکیم عبدالحسیب دریابادی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں،حکیم صاحب کے ساتھ بہت تعاون کیا، آپ انتہائی خلیق، ملنساراور مہمان نواز تھے،کل ۴۱/سال عمر پائی اور ۱۹۱۴ء میں استسقاء میں مبتلا ہوکر وفات پائی اور لکھنو میں دفن ہوئے۔(۱)

طبی حذاقت ومہارت

حکیم عبدالولی صاحب کی طبی حذاقت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ حکیم عبدالولی کے مطب کے سامنے روزانہ ایک غیر مسلم بزرگ گذرتے، اسی راستہ سے گومتی ندی میں اشنان کے لئے جاتے تھے،اور واپسی میں حکیم صاحب کوتعظیماً سلام ضرور کرتے تھے، ایک دن وہ اپنے بھائی کے ساتھ اسی طرح سلام کرتے ہوئے گذرے تو حکیم صاحب انہیں دیکھ کر چونک پڑے اور ارے........... کہہ کر ایک دم خاموش ہوگئے، گھر پہنچنے کے بعد ان صاحب کا انتقال ہوگیا، انکے بعد ان صاحب کے بھائی حکیم صاحب کے پاس آئے اور کہا کہ: جب اس دن ہم آپ کے سامنے گذرے تھے آپ چونک کیوں گئے، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ کہنا چاہتے ہیں، اس کی کیا وجہ تھی؟ اور میرا بھائی کا اس وقت گھر جاکر انتقال بھی ہوگیا، حکیم صاحب نے فرمایا کہ: آپ کے بھائی کے ماتھے پر

---

(۱) تذکرہ خاندانِ عزیزی

چندن کا ٹیکہ لگا تھا اور وہ بالکل گیلا تھا، حالانکہ ندی سے آنے میں اسے خشک ہونا چاہئے تھا ، میرے دماغ میں فوراً یہ بات آئی کہ ان صاحب کی حرارت غزیریہ بالکل فنا ہوچکی ہے اوراس کے باوجود وہ زندہ ہیں، لیکن یہ بات ظاہر کرنا مناسب نہیں تھا اور حرارتِ غزیریہ کے اس قدر گر جانے کے بعد اس کا علاج بھی ممکن نہیں، اسلئے میں خاموش رہا۔(۱)

(۳۱) شفاء الملک حکیم حبیب الرحمٰن خان آخوندزادہ

شفاء الملک حکیم حبیب الرحمٰن خان آخوندزادہ ۲۳/ مارچ ۱۸۸۱ء کو ڈھاکہ میں پیدا ہوئے ، ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی ،صرف ونحو کی تعلیم حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے پڑھی ، زیادہ تر درسیات وتعلیم مولانا محمد اسحاق بردوانیؒ ،مولانا احمد حسن کانپوری ،اور مولانا عبدالوہاب بہاری سے پڑھیں ،حدیث مولانا مفتی لطف اللہ علی گڑھی سے اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے ایک شاگرد سے پڑھی ، طب کی تعلیم مدرسہ طبیّہ دہلی میں حکیم عبدالمجید خان دہلوی (م ۱۹۰۱ء) سے حاصل کی ، آپ ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے جوائنٹ سکریٹری بنائے گئے ،۱۹۳۰ء میں حبیبہ طبی کالج کے نام سے ایک کالج کرایہ کی عمارت میں قائم کیا ،حکومتِ ہند نے آپ کو اپنی خدمات کی بناء پر ۱۹۳۹ء میں شفاء الملک کا خطاب دیا ۱۹۴۷ء میں آپ کا وصال ہوا۔

طبی خدمات ومہارت

ایک مرتبہ ایک شخص نے شفاء الملک حکیم حبیب الرحمٰن خان آخوندزادہ کو دکھایا پھر وہ مریض دہلی گیا اور وہاں جاکر اپنے مرض کے سلسلے میں مسیح الملک حکیم اجمل خان صاحب سے رجوع کیا ،حکیم صاحب نے اس مریض سے پوچھا کہ: آپ کہاں سے آئے ہیں ،اس نے کہا کہ: ڈھاکہ سے ،اس پر حکیم اجمل خان نے فرمایا کہ: کیا وہاں حکیم حبیب الرحمٰن خان نہیں ہیں ، پھر آپ نے نسخہ لکھ دیا اس نسخہ اور حکیم صاحب حبیب الرحمٰن خان کے نسخہ میں ذرہ برابر فرق نہیں تھا۔(۲)

---

(۱) تذکرہ خاندانِ عزیزی: ۲۱۸ (۲) ہندوستان کے مشہور اطباء: ۱۸۱-۱۸۲

اسی طرح ۱۹۴۴ء میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ؒ علیل ہوئے، اور ان کی کیفیت مولانا ظفر احمد عثانی کے ذریعہ حکیم حبیب الرحمٰن خان کو بتائی گئی، حکیم صاحب نے نسخہ لکھ دیا، لیکن کچھ دنوں کے بعد اطلاع آئی کہ حضرت حکیم الامت کا مرض بہت بڑھ گیا ہے، حکیم صاحب نے سنکر فرمایا کہ: اب دوا بیکار ہے؛ کیونکہ وقت آخر آ پہنچا، چنانچہ حکیم صاحب کے کہنے کے مطابق کچھ دنوں کے بعد مولانا کا انتقال ہوگیا۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ (۱۸۸۴-۱۹۵۳ء) مصنف سیرۃ النبی نے ایک مرتبہ ریڈیو پر تقریر کی، حکیم حبیب الرحمٰن خان نے ڈھاکہ میں وہ تقریر سنی اور سید صاحب کے پاس خط لکھ کر بھیجا کہ میں نے آپ کی آواز سنی جس سے ضعفِ قلب کا اظہار ہورہا تھا، آپ جلد ہی اس کی طرف توجہ کریں، چنانچہ چند روز کے بعد علامہ ندوی کو ضعفِ قلب کا عارضہ ہوا؛ لیکن اللہ عزوجل نے شفاء عطا فرمائی۔(۱)

(۳۲) حکیم عبدالمجید خاں

آپ حکیم محمود خان کے صاحبزادے اور حکیم اجمل خان کے بڑے بھائی تھے، اور دہلی کے مدرسہ طبیبہ کے بانی تھے، آپ کا انتقال ۱۹۰۱ء میں ہوا اور درگاہ حضرت سید حسن رسول نما کے احاطے میں دفن ہوئے، آپ اپنے وقت کے بڑے عالم وفاضل ہوئے ہیں، والد بزرگوار سے فن طب کی تعلیم حاصل کی، اور انہیں کے زیر نگرانی مطب بھی کیا، آپ ہر معاملہ میں اپنے والد محترم کے نقشِ قدم پر چلے، مطب میں کافی مریض جمع رہتے تھے، آپ دہلی والوں کا بہت خیال رکھتے تھے، آپ کی طبی خدمات کے صلہ میں حکومتِ برطانیہ نے حاذق الملک کے خطاب سے نوازا تھا، آپ نے ۱۸۸۲ء میں مدرسہ طبیبہ کی بنیاد ڈالی جو آج یونانی اینڈ آیورویدک کالج کے نام سے مشہور ہے، آپ اس مدرسہ طبیہ میں قانون کا درس دیا کرتے تھے۔

طبی حذاقت ومہارت

حکیم عبدالمجید خان کے پاس ان کے امتحان کے لئے ایک بار بھینس کا پیشاب لایا

(۱) ہندوستان کے مشہور اطباء: ۱۸۲

گیا اور ان سے کہا گیا کہ: یہ ایک عورت کا قارورہ ہے جو دہلی سے باہر رہتی ہے، اور علاج کے لئے آپ کے پاس نہیں آسکتی، آپ براہِ کرم قارورہ دیکھ کر کوئی مناسب نسخہ تجویز فرمادیں۔

''کھلی دوسیر، بنولہ ایک سیر، بھوسا بقدرِ ضرورت ہمہ در آب آمیختہ حل کردہ بخورانندہ، اس نسخہ کو دیکھ کر وہ شخص جو قارورہ لایا تھا، چونکا کہ یہ کیا نسخہ ہے، حکیم صاحب نے بغیر کسی ناگواری کے فرمایا کہ: آپ نے مجھے قارورہ دکھایا ہے، اس کے مزاج کے مطابق یہی نسخہ مناسب ہے، یہ سن کر وہ شخص شرمندہ ہوا، اور واپس چلا گیا۔(۱)

(۳۳) مسیح الملک حکیم محمد اجمل خان

خاندان شریفی کے چشم و چراغ ۱۷/شوال ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۴ء میں بمقام شریف منزل دہلی ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوئے، پہلے قرآن مجید حفظ کیا، پھر فارسی اور عربی کی طرف مائل ہوئے، آپ کے اساتذہ میں صدیق احمد دہلویؒ، مولوی عبدالحق صاحب تفسیر حقانیؒ، مولوی عبدالرشیدؒ، اور مرزا عبداللہ بیگ کے نام کتابوں میں ملتے ہیں، طب کی ابتدائی کتابیں اپنے والد حکیم محمود خان سے اور برادر معظم سے اونچی کتابیں پڑھیں، اور دونوں ہی سے مطب سیکھا، اپنے اخلاق، جذبۂ خدمت خلق، وضع داری اور متحمل مزاجی کی وجہ سے مرجعِ خلائق تھے، پنڈت نہرو انہیں دلی کا بے تاج بادشاہ کہا کرتے تھے، اور لارڈ میگنٹ آف انڈیا کا خطاب دیا گیا تھا، انگریزوں کی طرف سے حاذق الملک اور قوم کی طرف مسیح الملک کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔

حکیم شریف دہلوی (۱۱۳۹ھ-۱۲۲۲ء) سے لے کر مسیح الملک حکیم اجمل خان تک اطباء کاملین کا بے حد خوب صورت سلسلہ بن گیا ہے، یوں تو اس خاندان کے ہر فرد نے طبابت اور تصنیفی و تالیفی کام کے ذریعہ نمایاں خدمات پیش کی ہیں، لیکن محمد شریف خان کے بعد مدرسہ طبیہ دہلی کے بانی حکیم عبدالمجید دہلوی اور ان کے برادرِ معظم حاذق الملک کی

(۱) ہمدرد طبی کالج میگزین: ۱۹۸۳ء

طبی خدمات زیادہ اہم ہیں، ان کے بعد حکیم محمود خان اور حکیم واصل خان نے اپنے آباء کے ذریعہ ڈالی گئی طبی ارتقاء کی بنیاد کو عمارت کی شکل دینے میں بے نظیر کارنامے انجام دئے خاص طور سے حکیم محمود خان کا تعاون قابل ذکر ہے، مسیح الملک حکیم اجمل خان انہیں محمود خان کے ہونہار فرزند تھے۔

مطب

حکیم اجمل خان کا مطب اپنے دور کا بہت مشہور مطب تھا، سستی اور مفید دوائیں آپ کے نسخہ کا جزو ہوتی تھیں، اپنی مقبولیت کی وجہ سے حکیم صاحب کا مطب ہمیشہ مریضوں سے بھرا رہتا تھا، نبض اور قارورہ سے تمام امراض نہایت کامیابی سے تشخیص کرتے تھے۔(۱)

طبی حذاقت کے واقعات

ایک مریضہ بلگرام سے دہلی آئیں، ان کے پتہ میں پتھری ہوگئی تھی، حالت یہ تھی کہ تمام بدن پر پھوڑے نکل آئے تھے، بدن کا رنگ سیاہی مائل ہوگیا تھا، آنکھوں میں تیرگی تھی اور پیشاب بھی سیاہ ہوتا تھا، لکھنو میڈیکل کالج میں اور دوسرے ڈاکٹروں اور طبیبوں کا مدت تک علاج کرایا گیا، لیکن ذرا بھی فائدہ نہیں ہوا، ڈاکٹروں نے بالاتفاق آپریشن کی رائے دی اور کہا کہ: اس کے علاوہ علاج کی کوئی صورت نہیں ہے، لیکن مریضہ کمزور ہے اس کے لئے آپریشن خطرناک ہوگا، کوئی ذمہ داری نہیں لی جاسکتی، مریضۃ سب طرف سے مایوس ہوکر دہلی چلی گئیں، اور ۲/ ماہ تک مسیح الملک حکیم اجمل خان مرحوم کے زیر علاج رہیں اور کامل تندرست ہوکر واپس گئیں، واپسی پر لکھنو میں سول سرجن کو دکھایا گیا تو ان کو کسی طرح یقین نہیں آتا تھا کہ ایسا مرض بغیر آپریشن کے کیسے دور ہوگیا؟ (۲)

۱۹۲۴ء میں ایبٹ آباد کے قیام کے دوران وہاں کے فوجی اسپتال کے سرجن حکیم اجمل خان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی، اور نہایت تزک واحتشام کے ساتھ استقبال کیا، حکیم صاحب کو ہسپتال کے تمام شعبوں کا معائنہ کروایا، سرجن صاحب نے تین مریضوں کو حکیم

(۱) تذکرۃ الاطباء: ۲/ ۱۱۷، حکیم سید سرفراز حسین (۲) طبی ڈائجسٹ، اجمل نمبر، حیدرآباد

صاحب کے سامنے بغرضِ تشخیص پیش کیا، حکیم صاحب نے نبض دیکھی اور بغیر حال سنے یکے بعد دیگرے ہر مریض کے متعلق اپنی رائے ظاہر کردی، ان میں ایک سلی کا مریض تھا ، دوسرا کینسر کا اور تیسرا ٹائیفڈ کا، پہلے دو مریضوں کے سلسلے میں کہا کہ: یہ لاعلاج ہیں اور تیسرے کے بابت صحت یابی کی امید ظاہر کی، سرجن نے حیرت واستعجاب سے حکیم صاحب کی آراء کو سنا، اور معلوم کیا کہ آپ نے یہ حالات کیسے دریافت کئے، چنانچہ حکیم صاحب دو گھنٹے تک نبض کے تمام اصول اور اپنے تجربات بیان کئے، جس پر سرجن مسرت اور تعجب کے ملے جلے جذبات کے ساتھ فرمانے لگے کہ طب یونانی کا یہ حصہ واقعی نہایت دلچسپ اور مفید ہے، ہم ڈاکٹروں کو بھی چاہئے کہ اس فن میں دسترس حاصل کریں۔(۱)

آپ کی تشخیص میں مہارت کا اندازہ اس واقعہ سے بھی لگایا جاسکتا ہے جسے ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے تاریخ کی کتب میں لکھا ہے، یہ جیرنگ اسپتال لندن میں ہاؤس سرجن تھے تو حکیم صاحب نے اسپتال کا معائنہ کیا اور آپ کی ملاقات سینئر سرجن ڈاکٹر اسلیلے سے ہوئی، انھوں نے حکیم صاحب کو دوسرے دن اسپتال آنے کی دعوت دی، حکیم صاحب جب پہنچے تو ڈاکٹر صاحب طالب علموں کے سامنے ایک مریض کو لٹا کر اسے مرارہ کے ورم کا مریض بنا کر درس دے رہے تھے، حکیم صاحب نے مریض کو دیکھ کر یہ تشخیص کی کہ اس کے آنتوں کے ابتدائی حصہ میں زخم ہیں۔

ڈاکٹر نے ہنس کر کہا: کل آپریشن کے وقت آپ بھی آئیں گے، اسی وقت یونانی اور ایلوپھیتک کا مقابلہ ہوجائے گا، آپریشن کے بعد حکیم صاحب کی تشخیص درست نکلی، ڈاکٹر نے حکیم صاحب کو اس کامیابی پر بہت مبارک باد دی۔(۲)

طبی وسیاسی خدمات

آپ نے طب کی فلاح وارتقاء کے لئے بے حد کوششیں کیں، اور اسی مقصد سے یورپ کا سفر بھی کیا، حکیم صاحب نے مدرسہ طبیہ دہلی کو جس کو ان کے بڑے بھائی نے قائم

---

(۱) طبی ڈائجسٹ اجمل نمبر، حیدرآباد

(۲) حکیم اجمل خاں دری ورسٹائل جنسی: ۱۴۰، از حکیم عبدالرزاق

کیا تھا، مزید ترقی عطا کی، نصابِ تعلیم میں تجدید کی اور اس میں آیورویدک تعلیم بھی شروع کی، سیاسی رہنماؤں اور حکومتِ وقت کے تعاون سے قرولباغ دہلی میں کالج کے لئے وسیع وعریض عمارت تعمیر کی، حکیم صاحب ویدوں اور حکیموں کے اتحاد کے لئے ایک مشترکہ پلیٹ فارم قائم کرنا چاہتے تھے، یونانی ادویہ کی تیاری کے لئے آپ نے ایک یونانی دواخانہ قائم کیا تھا، حکیم صاحب نے ہندوستان کی جنگِ آزادی میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اسی سلسلہ میں گاندھی جی، راج گوپال، آچاریہ، بی آر آنند، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور دوسری اہم شخصیتوں سے بھی تعلقات تھے۔

حکیم صاحب کو شعر وشاعری سے بھی کافی دلچسپی تھی، اور رشید تخلص تھا، آپ کا کلام بڑا جاندار اور ادبی معلومات سے بہت بلند ہوتا تھا، آپ کی تصانیف اردو، عربی اور فارسی میں متعدد تھیں اور ملک میں معیاری رسائل میں آپ کے مضامین شائع ہوتے تھے، ''دکن ہوہو'' میں بوعلی سینا پر آپ کے مقالات شائع ہو چکے ہیں، آپ کے معالجانہ نسخوں پر مشتمل کئے مجموعے شائع ہو چکے ہیں، جن میں ''افاداتِ مسیح الملک'' اور ''حاذق'' کے نام سے کتاب کافی مقبول ہو چکی تھی۔ ۶۴ رسال کی عمر میں دسمبر ۱۹۲۷ء میں آپ کی وفات ہوئی اور درگاہ حضرت رسول نما دہلی میں دفن ہوئے۔

(۳۴) حکیم عبد الوہاب انصاری عرف نابینا

حکیم نابینا مرحوم مشرقی یوپی کے ضلع غازی پور قصبہ یوسف پور میں ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے، آپ کا سلسلۂ نسب حضرت ابوایوب انصاری سے ملتا ہے، آپ کے والد حکیم عبد الرحمٰن انصاری بھی بہت مشہور اور صاحبِ کمال عالم تھے، حکیم نابینا بچپن سے ہی چیچک نکل آنے کی وجہ سے بینائی سے محروم ہو گئے تھے، دس سال کی عمر میں قرآن شریف حفظ کیا، ابتدائی صرف ونحو کی تعلیم اپنے وطن میں پائی ۱۸۸۲ء میں دار العلوم دیوبند سے فراغت پائی، عربی ادب مولانا فیض الحسن سہارنپوریؒ اور مولانا ذوالفقار علی دیوبندیؒ سے پڑھا اور طب کی تعلیم حکیم عبد المجید خان دہلوی (م ۱۹۰۱) سے حاصل کی، حکیم عبد الرزاق

اور ہندوستان کے مشہور سیاسی رہنما ڈاکٹر مختار احمد انصاری بھی آپ کے بھائی تھے، تعلیم سے فراغت پا کر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (۱۸۲۸ء-۱۹۰۵ء) کی خدمت میں حاضر ہوکر بیعت کی، آپ تینوں بھائیوں کو شیخ الہند مولانا محمود الحسن (م۱۹۲۰ء) سے بھی بہت تعلق تھا، آپ سابق نظام حیدر آباد کے معالجِ خصوصی رہے، حیدر آباد اور دہلی کے امراء ورؤساء کے آپ خاص معالج تھے، خواجہ حسن نظامی نے لقمان الملک کا خطاب دیا، ربیع الثانی ۱۳۶۰ھ بمطابق ۱۹۱۴: میں دہلی میں وفات پائی وصیت کے مطابق جنازہ دہلی سے گنگوہ لے جایا گیا اور حضرت گنگوہی کے مزار کے قریب دفن کیا گیا۔

حکیم نابینا صاحب کی نباضی میں مہارت

حکیم عبدالوہاب انصاری عرف حکیم نابینا باوجود نابینا ہونے کے نباضی میں بہت ماہر تھے، ایک صاحب کے چچا مرضِ استسقاء میں مبتلا تھے، اور مراد آباد میں رہتے تھے، حکیم صاحب نے بذریعہ خط مریض کی حالت اور وہاں کے اطباء کی تشخیص معلوم کی، اوران کے بھتیجے جو دہلی میں رہتے تھے کی نبض دیکھ کران کے چچا کی مزاجی کیفیت معلوم کر لی اوراسی کے مطابق نسخہ بھی تجویز کر دیا، کچھ دنوں کے بعد یہ دوائیں استعمال کر کے ان کے چچا اس مرض سے چھٹکارا پا گئے۔(۱)

علامہ اقبال حکیم نابینا کی معالجانہ سوجھ بوجھ کے بہت معتقد تھے، ایک مرتبہ ان کے گردے میں پتھری ہوگئی، ڈاکٹر نے آپریشن کی رائے دی اور کہا کہ: یہ آپریشن اگر ویانا میں ہوتو زیادہ بہتر ہے، دوستوں کے مشورے سے حکیم نابینا صاحب کا علاج شروع کیا، حکیم صاحب نے پتھری کی مخصوص یونانی دوائیں علامہ اقبال کو استعمال کروائیں اوراپنے مخصوص دواؤں کے صندوقچہ سے کشتہ حجر الیہود نکال کر دیا اوراسے استعمال کرایا، ان دواؤں کے استعمال سے علامہ کی تکلیف دور ہوگئی، اور دوبارہ اکسیرے کرانے پر پتھری کا نام ونشان بھی نہیں دکھائی دیا۔(۲)

---

(۱) ہمدرد طبی کالج میگزین: ۸۴، ۱۹۸۳ء

(۲) اطباء اوران کی مسیحائی: ۱۸۸-۱۸۹

دینی رنگ اور مذھبی مزاج

حکیم نابینا مرحوم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بیعت تھے، اور انہوں نے مرشد کی صحبت میں رہ کر باطنی کمال بھی حاصل کیا ہوا تھا، ان کا بیان ہے:

''ایک مرتبہ میں حضرت گنگوہی سے عرض کیا کہ: اگر چہ میں نے ذریعۂ معاش کے لئے طب پڑھ لی ہے، لیکن اطباء نبض کے علاوہ مریض کا چہرہ، قارورہ اور دوسرے مشاہدات کی مدد سے مرض کی تشخیص کرتے ہیں اور میں بوجۂ عدمِ بصارت اس سے محروم ہوں، میرے لئے دعاء فرمادیجئے کہ اللہ تعالیٰ میری اس مشکل کو آسان فرمادے''

اس پر حضرت گنگوہی نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ تمہیں نباضی کی مہارت عطا فرمائے گا جس سے تم مریض کے امراض پر مطلع ہوجاؤ گے جن کو دوسرے اطباء مشاہدات سے معلوم کرتے ہیں''۔

حکیم صاحب کا بیان ہے کہ:

میں شیخ کی اس کرامت کا روزانہ مشاہدہ کرتا ہوں، نبض پر ہاتھ رکھتے ہی مجھ کو مریض اور مرض کی تمام کیفیتیں منکشف ہوجاتی ہیں''(۱)

حکیم نابینا صاحب کو اپنے پیر حضرت گنگوہیؒ سے اتنا تعلق تھا کہ وہ دیوبند، گنگوہ، اور یوسف پور کے کسی بھی مریض سے چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان، کبھی بھی قیمتی دواؤں کی قیمت نہیں لیتے تھے، اس طرح علماء وصوفیاء سے بھی آپ نے کبھی قیمت نہیں لی، مطب میں ہر وقت مریض ذکر اللہ میں مشغول رہتے تھے،(۲) دینداری اور عبادت گذاری کا یہ عالم تھا کہ اکثر چلہ میں بیٹھ جاتے اور تین تین دن یا سات دن مطب سے کنارہ کش ہوکر اللہ کی عبادت میں مشغول ہوجاتے، ان کی غیر موجودگی میں آپ کے صاحبزادگان مریضوں کو دیکھتے، جب حکیم صاحب عبادت سے فارغ ہوجاتے اور صاحبزادوں سے

(۱) تاریخِ دارالعلوم: ۶۲ (۲) تاریخِ دارالعلوم: ۶۲

مریضوں کا حال پوچھتے اور جب معلوم ہوتا کہ کسی کو فائدہ نہیں ہوا ہے تو نسخہ اپنے ہاتھ میں لے کر فرماتے کہ: یہی نسخہ دوبارہ استعمال کرو اس سے فائدہ ہوگا، چنانچہ اسی نسخہ سے مریضوں کو فائدہ ہوتا۔(۱)

سچ تو یہ ہے کہ جو زبان ہر وقت لا الہ الاّ اللہ کہتے کہتے سوکھتی نہ ہو اس سے نکلا ہوا کوئی جملہ یا جن ہاتھوں سے روزانہ تسبیح پر درود شریف اور اللہ کا ذکر ہزاروں مرتبہ کیا جاتا ہو اس ہاتھ سے لکھا ہوا کوئی نسخہ اپنے اندر کیوں نہ اثر رکھے۔

(۳۵) حکیم عبدالعزیز

آپ لکھنو کے نامور اطباء میں سے تھے، ان کو شیخ الرئیس ہند بھی کہا جاتا ہے، یہ حکیم محمد اسماعیل کے بڑے صاحبزادے تھے، علمِ طب اپنے دادا حکیم محمد یعقوب اور چچا حکیم محمد ابراہیم سے پڑھا، ۱۹۰۲ء میں آپ نے مدرسۂ تکمیل الطب کی بنیاد ڈالی جو آج تکمیل الطب کالج میں تبدیل ہو چکا ہے، زمانہ کے بدلتے تیور دیکھ کر حکیم عبدالعزیز نے طب یونانی کو دورِ حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے اس مدرسہ کا قیام عمل میں لایا، حکیم صاحب اپنے دورِ طالبِ علمی ہی سے علمِ تشریح کے ساتھ سرجری کی ضرورت کو شدت سے محسوس کر رہے تھے، اسی ضرورت کے پیشِ نظر آپ نے اپنے دونوں لڑکوں حکیم عبدالرشید اور حکیم عبدالمعید کو سرجری میں کمال حاصل کرایا، ظاہر ہے کہ دو چار اطباء سے اتنے بڑے ملک کی ضرورت پوری نہیں ہو سکتی تھی، اسی خیال سے حکیم صاحب نے جولائی ۱۹۰۲ء میں جھوائی ٹولہ لکھنو کے اپنے آبائی مقام میں تکمیل الطب کے نام سے ایک طبی درسگاہ قائم کی، شروع میں صرف خاندان کے اطباء ہی اس کا نظم ونسق وتدریسی کام انجام دیتے رہے، بعد میں یہ سلسلہ وسیع ہو گیا، اور باہر کے اساتذہ کی خدمات حاصل کی گئیں، آج کل یہ کالج حکومت اتر پردیش کی تحویل میں سرگرمِ عمل ہے۔

حکیم صاحب کا طبی درس بھی کافی مقبول تھا، ہندوستان کے علاوہ بیرونِ ملک

---

(۱) محدث گنگوہی: ۳۴-۳۵

افغانستان، بخارا، اور حجاز کے اطباء بھی شریک ہوتے تھے، آپ کے درس کی مقبولیت اورافادیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ علامہ شبلی نعمانی، مولانا محمد فاروق چریا کوٹی، مولانا لطف اللہ علی گڑھی، مولانا عبدالحق خیرآباد جیسی بڑی شخصیتیں پابندی سے درس میں شریک رہتی تھیں۔

طبی حذاقت ومہارت

آپ کے معالجانہ تجربات سے متعلق متعدد واقعات کتابوں میں ملتے ہیں، ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ لکھنو کے نواب زادہ کو چیچک نکلی جس میں حالت بہت خراب ہوئی، اطباء اور ڈاکٹروں کا جمگھٹ تھا، کئی اطباء نے نسخے لکھے، حکیم عبدالعزیز نے نسخہ دے کر کافور کا اضافہ کردیا، اطباء کو بڑی حیرت ہوئی، بعض نے مضر بتاتے ہوئے کافور کی سخت مخالفت کی، حکیم صاحب نے مدلل طور سے فرمایا کہ: بخار کی شدت کی وجہ سے سمیت پیدا ہوگئی ہے، لہذا تریاق کی حیثیت سے کافور کی ضرورت ہے، چنانچہ دوسرے ہی دن سے فائدہ شروع ہوگیا۔(۱)

ایک دوسرا واقعہ یوں ہے کہ حکیم صاحب کے مطب میں ایک لڑکا آیا، ساتھ ہی لوگوں نے یہ بتایا کہ یہ بغیر دستہ کے چاقو نگل گیا ہے، ممکنہ علاج کے بعد ڈاکٹروں نے آپریشن تجویز کیا تھا، مگر لڑکے کے والدین آپریشن کے لئے تیار نہیں ہوئے تھے، حکیم صاحب کی رائے لی گئی، آپ نے ایک چھٹانک پارہ دودھ میں پلوایا اور آدھے گھنٹے تک اس سے چہل قدمی کروائی، تھوڑی دیر کے بعد اس نے ناف کے درد کی شکایت کی تو آپ نے حقنہ کرایا، تیسری دفعہ حقنہ کرانے کے بعد پہلے چاقو کا پھل نکل آیا، پھر پارہ نکل آیا۔

طبی مناقشہ

حکیم صاحب کے زمانے میں دہلی اور لکھنو دو اہم طبی اسکول تھے، جو اہم سمجھے جاتے تھے، ان دونوں میں اکثر فنی امور میں مناقشہ چلتے رہتے تھے، حکیم صاحب اور حکیم عبدالمجید خان کے درمیان مخّ دماغ کی جس کے متعلق کافی دنوں تک بحث چلتی رہی،

---

(۱) رموز الاطباء: ۲۴۴، حکیم فیروز الدین صاحب

دونوں طرف سے متعدد رسائل شائع ہوئے، اس کے علاوہ طب کی تعلیمی زبان، کشتوں کا جواز وعدمِ جواز، حکیموں کے ساتھ ویدوں کی شمولیت جیسے بہت سے معاملات میں اختلاف پایا جاتا تھا، لکھنو والے حکیموں کے ساتھ آیورویدک والوں کی شمولیت کے مخالف تھے، چنانچہ طبی اینڈ آیورویدک کانفرس کا اکثر بائیکاٹ کرتے تھے، اس طرح طب کے کے ساتھ طبِّ جدید کی تعلیم کے تسلط کو بھی لکھنو کے اطباء کے لئے خطرہ سمجھتے تھے، مفردات کے وزن کے سلسلہ میں لکھنو اور دہلی میں اختلافِ رائے پایا جاتا تھا۔

ڈاکٹر مقبول علی حیدرآبادی (م:۱۹۵۴ء)

انگلستان کے فارغ (نلگنڈہ میں سول سرجن رہے) بیوی (ویسٹ انڈیز) بھی سول سرجن، وظیفہ کے بعد مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ میں مطب کرتے، جہاں اس وقت کے دانشور روزانہ جمع ہوا کرتے، مغرب کا وقت ہوتا تو امام کے لئے مجھے آگے کردیتے یہ کہہ کر طالب علم کا درجہ اونچا ہے، رمضان میں دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب نے صرف نمک سے روزہ کھولا، نماز پڑھی اور مطب میں آبیٹھے، ایام بیض کے بھی روزے رکھتے تھے، (اگرچہ فل سوٹ پہنتے اور کلین شیو رہتے) ماتحتین کو بھی سلام میں خود پیش قدمی کرتے، غریب مریضوں کی رقمی امداد کرتے۔ (پروفیسر میر محفوظ علی صدیقی۔ایران)

موسم سرما میں سخت سردی میں دونوں میاں بیوی فٹ پاتھ پر سونے والے فقیروں پر کمبل اڑھادیتے۔

ڈاکٹر یوسف قدوائی (م:۱۹۸۹/۲/۲۰ء)

ہومیو پیتھ۔انگریزی مترجم

وہ ۱۹۴۶ء سے دم آخر تک (یعنی ۴۳ سال) ایک مرض وعلاج کے نتیجہ میں مستقل صاحب فراموش تھے، کروٹ بھی نہیں لے سکتے؛ لیکن اسی حالت میں لکھنے پڑھنے کا کام کرتے تھے، ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ لندن یونیورسٹی کے مشہور نقاد ومحقق استاد سیاسیات پروفیسر لاسکی نے دیکھا تھا اور اس پر تعریفی نوٹ لکھا تھا۔

مولانا علی میاں ندوی کی کئی کتابوں کا انگریزی ترجمہ کیا، ''انسانی دنیا پر مسلمانوں

کے عروج وزوال کا اثر‘‘ کا ترجمہ ’’islam and the world‘‘ کے نام سے ہوا، اس کے متعلق ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری (پروفیسر انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد) نے مولانا سے فرمایا کہ مولانا آپ یقین کیجئے کہ کسی غیر انگریزی کتاب کا ابھی تک انگریزی میں اس کتاب سے بہتر ترجمہ نہیں۔

اسی مستقل علالت کی حالت میں انہوں نے فرائض کی پابندی، ذکر وشکر اور تحریری مشغولیت کے ساتھ علاج ومعالجہ کی خدمت کو بھی جاری رکھا۔(۱)

ڈاکٹر عبد المنان حیدر آبادی (م:۱۷/۷/۲۰۰۹ء)

وہ غریبوں کی نہ صرف مفت تشخیص کرتے ہیں ؛ بلکہ (اپنے گھر کے قریب کی) میڈیکل شاپ کو اشارہ بھی دیتے ہیں کہ دوا کی قیمت میرے ذاتی حساب میں شامل کردی جائے، ہم نے ان کی قیام گاہ پر یہ بھی دیکھا کہ پرانے شہر (حیدر آباد) سے کوئی مریض ان کے پاس آیا ہے اور وہ اس سے پوچھ رہے ہیں کہ دوا مہنگی ہے کیا خرید سکو گے؟ اور وہ مریض پھٹی پھٹی آنکھوں سے عرض حال کرتا ہے کہ میں آپ کے بنگلے تک ہی قرض لے کے آیا ہوں تو اس بات پر ڈاکٹر صاحب دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ میڈیکل شاپ کو اشارہ دیتے ہیں کہ، ہم نے بسا اوقات یہ بھی دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب مریض کو آمد ورفت کا خرچ بھی دے رہے ہیں (روزنامہ سیاست، جہاں دار افسر)۔(۲)

نامور طبیبات

علوم وفنون کی نشر واشاعت اور ترویج وارتقاء میں خواتین نے مردوں کے دوش بدوش گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، کوئی بھی میدان ہو، اس میں ان کے کارنامے قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، ٹھیک اسی طرح علمِ طب بھی ان کی خدمات سے محروم نہیں ہے۔

تاریخ میں طبیبات کا تذکرہ بہت کم ملتا ہے، لیکن اس کا سبب خواتین کی نا اہلی نہیں

---

(۱) پرانے چراغ، جلد سوم، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

(۲) سب کے لئے، مؤلف ابن غوری: ۹۶-۹۷، آئی جی، پبلیشرس، حیدر آباد

بلکہ مواقع کا عدم حصول ہے، عورتوں کا دائرہ کار عام طور پر گھر کی چہار دیواری ہوتی ہے، پہلے کے ادوار میں کہیں بھی تحصیلِ علم کے مواقع حاصل نہیں ہوتے تھے، اسلئے کہ تحصیلِ علم کے لئے دور دراز کے اسفار کرنے پڑتے تھے، اور اگر کسی ماہرِ فن کی صحبت نصیب بھی ہوجاتی تو اس کے بعد خدمت کے مواقع بہت کم ملتے تھے، لیکن اس کے باوجود تاریخِ طب کے تقریباً ہر دور میں طبیبات کا تذکرہ ملتا ہے، اور طبی میدان میں ان کی خدمات پر روشنی پڑتی ہے۔

تاریخِ طب کی ابتداء اسقلیبوس اول سے کی جاتی ہے، اسقلیبوس کو شیرون (chiron) کا شاگرد بتایا گیا ہے، شیرون (۱۱۴۳ ق م) نے صحت کے کچھ اہم اصول بیان کئے تھے، اسی وجہ سے اہلِ یونان اسے صحت کا دیوتا اپولوں کا بیٹا کہتے ہیں۔

اسقلیبوس کے ساتھ یونانیوں کے یہاں صحت کی دیویوں کے نام بھی ملتے ہیں، ایک ہائجیا اور دوسری پاناسا یہاں ایک بات قابلِ ذکر ہے اہلِ یونان بعض انسانوں کے کارناموں کی بنیاد پر انہیں دیوتا یا دیوتا کا بیٹا قرار دیتے تھے، اسلئے عین ممکن ہے کہ ان دونوں خواتین نے طب و صحت کے رہنما اصول دیئے ہوں، جس کی بنیاد پر انہیں صحت کے دیویاں قرار دیا گیا ہو۔
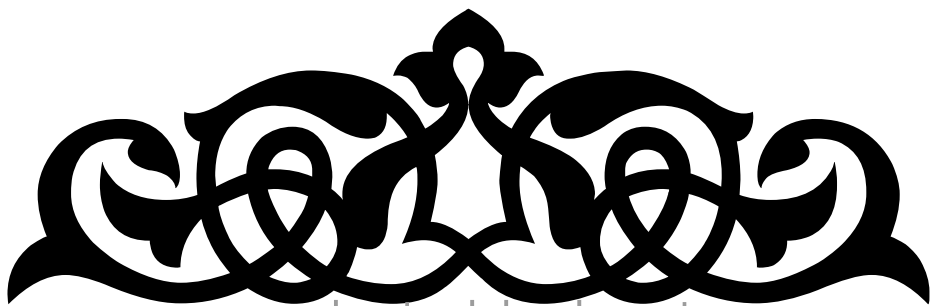
مسلم قضاۃ کے عادلانہ فیصلے

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فیصلے

حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (جب) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے قاضی بنا کر بھیجنے کا ارادہ کیا تو میں نے عرض کیا کہ آپ مجھ نوجوان کو (قاضی بنا کر) بھیج رہے ہیں (جو کم عمری کی وجہ سے نا تجربہ کار بھی ہے اور (جس کو) منصب قضا کی ذمہ داریوں کا پوری طرح علم بھی نہیں ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (تم اس بارے میں فکر نہ کرو) اللہ تعالی تمہارے دل کو فہم وفراست کی ہدایت عطا کرے گا اور تمہاری زبان کو صحیح اور برحق حکم وفیصلہ کرنے پر ثابت رکھے گا) پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منصب قضا کی ذمہ داریوں کی انجام دہی کے سلسلہ میں یہ تعلیم وہدایت دی کہ جب تمہارے پاس دو آدمی اپنا قضیہ لے کر آئیں تو تم پہلے آدمی (یعنی مدعا علیہ) کا بیان سن لو کیونکہ یہ (مدعا علیہ کا بیان تمہیں) صحیح حکم وفیصلہ دینے میں اچھی مدد دے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی) اس مبارک دعا کی برکت سے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت وتعلیم پر عمل کرنے کے بعد میں کسی بھی قضیہ کا حکم اور فیصلہ کرنے میں مذبذب نہیں ہوا ''فما شككت فی قضية بعد'' (۱)

حضرت زید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ یمن میں تھے تو ان کے پاس ایک عورت کو لایا گیا جس سے ایک ہی طہر میں تین آدمیوں نے بدکاری کی تھی انہوں نے ان میں سے دو آدمیوں سے پوچھا کہ کیا تم اس شخص کے لئے بچے کا اقرار کرتے ہو؟ انہوں نے اقرار نہیں کیا اسی طرح ایک ایک کے ساتھ دوسرے کو ملا کر سوال کرتے رہے یہاں تک کہ اس مرحلے سے فارغ ہو گئے اور کسی نے بھی بچے کا اقرار نہیں کیا پھر انہوں نے

---

(۱) حلية الأولياء : سعيد بن فيروز ابو البختری: ۳۸۲/۴،دار الكتاب العربی ، بيروت

ان کے درمیان قرعہ اندازی کی اور قرعہ میں جس کا نام نکل آیا بچہ اس کا قرار دے دیا اور اس پر دو تہائی دیت مقرر کردی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں یہ مسئلہ پیش ہوا تو نبی کریم ﷺ اتنے مسکرائے کہ دندان مبارک ظاہر ہوگئے ''فضحك حتی بدت نواجذہ''(۱)

حنش کنانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: یمن میں ایک قوم نے شیر کو شکار کرنے کے لئے ایک گڑھا کھود کر اسے ڈھانپ رکھا تھا شیر اس میں گر پڑا اچانک ایک آدمی بھی اس گڑھے میں گر پڑا، اس کے پیچھے دوسرا، تیسرا حتی کہ چار آدمی گر پڑے، اس گڑھے میں موجود شیر نے ان سب کو زخمی کر دیا، یہ دیکھ کر ایک آدمی نے جلدی سے نیزہ پکڑا اور شیر کو دے مارا، چنانچہ شیر ہلاک ہوگیا اور وہ چاروں آدمی بھی اپنے اپنے زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے دنیا سے چل بسے۔ مقتولین کے اولیا اسلحہ نکال کر جنگ کے لئے ایک دوسرے کے آمنے سامنے آگئے، اتنی دیر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ آپہنچے اور کہنے لگے کیا تم چار آدمیوں کے بدلے دوسو آدمیوں کو قتل کرنا چاہتے ہو؟ میں تمہارے درمیان فیصلہ کرتا ہوں، اگر تم اس پر راضی ہوگئے تو سمجھو کہ فیصلہ ہوگیا، فیصلہ یہ ہے کہ جو شخص پہلے گر کر گڑھے میں شیر کے ہاتھوں زخمی ہوا، اس کے ورثا کو چوتھائی دیت دے دو اور چوتھے کو مکمل دیت دے دو، دوسرے کو تہائی اور تیسرے کو نصف دیت دے دو، ان لوگوں نے یہ فیصلہ تسلیم کرنے سے انکار کردیا (کیونکہ ان کی سمجھ میں ہی نہیں آیا) چنانچہ وہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، نبی ﷺ نے فرمایا میں تمہارے درمیان فیصلہ کرتا ہوں، اتنی دیر میں ایک آدمی کہنے لگا، یارسول اللہ ! حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہمارے درمیان یہ فیصلہ فرمایا تھا، نبی ﷺ نے اسی کو نافذ کردیا: ''فأجاز رسول اللہ ا القضاء کما قضیت بینهم''(۲)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دوراندیشی

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں ایک عجیب وغریب مقدمہ عدالتِ فاروقی میں

---

(۱) مسند احمد ،حدیث:۱۹۳۴۸

(۲) أخبار القضاۃ : قضاء معاذ فی الیمن :۹۷/۱،المکتبة التجاریة الکبری ، بشارع محمد علي بمصر

پیش ہوتا ہے، ایک انصاری نوجوان لڑکا کہتا ہے کہ: میں اس عورت کا بیٹا ہوں، مگر وہ عورت مجھے بیٹا ماننے سے انکار کردیتی ہے،عورت سے سے پوچھا گیا تو اس نے کہا: میری تو کبھی شادی ہی نہیں ہوئی، ادھر عورت نے چند گواہوں کو بھی امیر المؤمنین کی خدمت میں پیش کردیا جنہوں نے ثابت کیا کہ یہ عورت شادی شدہ نہیں ہے، امیر المؤمنین نے ساری باتیں سن کر اس نوجوان پر حد جاری کرنے کا حکم دیا، اس دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور سارے مقدمے کی تفصیلات سنیں، پھر مسجد نبوی میں ان سارے حضرات کو بلا کر عورت سے پوچھا: کیا یہ تمہارا بیٹا نہیں ہے؟ اس عورت نے کہا: نہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس نوجوان سے کہا: تم بھی اس طرح اس کے ماں ہونے کا انکار کردو جیسے یہ تمہارے بیٹے ہونے کا انکار کررہی ہے، اس نوجوان نے کہا: میں یہ کیسے کرسکتا ہوں جب کہ میں خوب جانتا ہوں کہ یہ میری ماں ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس نوجوان کو ترغیب دلانے پر کہ آج سے تمہارا باپ میں اور تمہارے بھائی حسن وحسین ہوں گے تم اس عورت کے ماں ہونے کا انکار کردو تو اس نوجوان اس کے ماں ہونے کا انکار کردیا، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عورت کے اولیاء سے فرمایا: "أمری فی هذه المرأة جائز" کیا اس عورت کے سلسلے میں میری بات مانی جائے گی؛ اولیاء نے کہا: کیوں نہیں؟ ضرور آپ کی بات مانیں گے۔ ان کی باتیں سننے کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ گویا ہوئے: اے قنبر! (قنبر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے غلام کا نام تھا) ان حاضرین کے سامنے تم گواہ رہو کہ میں نے اس اجنبی خاتون کی شادی اس نوجوان سے کردی، تم جاکر درہموں کی تھیلی لاؤ۔ قنبر گئے اور (۴۸۰) درھم کی تھیلی لائے، حضرت علی رضی اللہ عنہ اس عورت کو وہ رقم بطور مہر دیتے ہوئے اس نوجوان سے کہا: اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑو اور اس کے بعد ہمارے پاس اسی وقت آنا جب کہ تمہارے اوپر سہاگ کے نشانات ہوں۔

یہ سنتے ہی اس عورت نے کہا: اے ابوالحسن! یہ نوجوان تو میرے حق میں جہنم کا ٹکڑا بن جائے، میں اقرار کرتی ہوں کہ یہ میرا لڑکا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ: اس نوجوان کا ایک باپ حبشی تھا، میرے بھائیوں نے اس کے ساتھ میری شادی کردی تھی، کچھ دنوں

کے بعد وہ اللہ کی راہ میں شہید ہوگیا، اس کے بعد میرا یہ بچہ پیدا ہوا تو میں نے اسے فلاں قبیلہ میں بھیج دیا، اس نے وہیں پرورش پائی، اس کے بعد میں نے اس کو بیٹا ماننے سے انکار کردیا" وأنفت أن يكون ابنی "(۱)

معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے قضا کے واقعات

معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے بعض ساتھیوں سے روایت ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجنے کا ارادہ کیا فرمایا تم کس طرح فیصلہ کروگے جب تمہارے پاس کوئی مقدمہ پیش ہوجائے انہوں نے کہا اللہ کی کتاب سے فیصلہ کروں گا آپ نے فرمایا اگر تم اللہ کی کتاب میں وہ مسئلہ نہ پاؤ تو؟ عرض کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کی سنت کے مطابق فیصلہ کروں گا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر سنت رسول میں بھی نہ پاؤ تو؟ اور کتاب اللہ میں بھی نہ پاؤ تو؟ انہوں نے کہا کہ اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوئی کمی کوتاہی نہیں کروں گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سینہ کو تھپتھپایا اور فرمایا کہ اللہ ہی کیلئے تمام تعریفیں ہیں جس نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغامبر (معاذ) کو اس چیز کی توفیق دی جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راضی ہیں" وفق رسول رسول الله لما يرضى رسول الله "(۲)

ابوالاسود دویلی کہتے ہیں کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ جس وقت یمن میں تھے تو ان کے سامنے ایک یہودی کی وراثت کا مقدمہ پیش ہوا جو فوت ہوگیا تھا، اور اپنے پیچھے ایک مسلمان بھائی چھوڑ گیا تھا حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اسلام اضافہ کرتا ہے کمی نہیں کرتا اور اس حدیث سے استدلال کر کے انہوں نے اسے وارث قرار دے دیا۔" إن الاسلام يزيد "(۳)

حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ بحیثیت قاضی یمن

حضرت ابوموسی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ

---

(۱) الطرق الحكمية :۴۳/۱،مكتبة دار البيان

(۲) اخبار القضاة : قضاء معاذ فی اليمن :۹۸/۱المكتبة التجارية الكبري ، بشارع محمد علي بمصر

(۳) اخبار القضاة : قضاء معاذ فی اليمن :۹۸/۱المكتبة التجارية الكبري ، بشارع محمد علي بمصر

کو یمن بھیجتے ہوئے فرمایا خوشخبری دینا، نفرت مت پھیلانا، آسانی پیدا کرنا، مشکلات میں نہ ڈالنا، ایک دوسرے کی بات ماننا اور آپس میں اختلاف نہ کرنا، چنانچہ ان دونوں میں سے ہر ایک کا خیمہ تھا جس میں وہ ایک دوسرے سے ملنے کے لئے آتے رہتے تھے۔ ''یزور أحدهما صاحبه''۔(۱)

اسحاق نضر شعبہ سعید بن ابی بردہ اپنے والد سے وہ ان کے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ جب ان کو اور معاذ بن جبل رضی اللہ تعالی عنہ کو رسول اللہ ﷺ یمن بھیجنے لگے تو دونوں سے فرمایا کہ آسانی کرنا سختی نہ کرنا اور خوش خبری سنانا نفرت نہ دلانا بلکہ رغبت دلانا ابوموسی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ! ہم ایک ایسے ملک میں رہتے ہیں جہاں شہد سے شراب بنائی جاتی ہے جس کو مزر کہا جاتا ہے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔''کل مسکر حرام''(۲)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور ان کے عدالتی فیصلے

عہدی اموری کے مشہور و معروف قضاۃ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں، ان کے فیصلے بھی نہایت معروف ہیں۔

☆ ایک مقروض شخص جو بالکل مفلس ہو چکا تھا، ادائیگی قرض سے عاجز ہو چکا تھا، قرض دینے والے نے یہ درخواست کی کہ اسے جیل بھیج دیا جائے، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ درخواست رد کر دی اور فرمایا کہ: میں صرف تمہارے لئے اسکو قید نہیں کرسکتا، میں اس کو آزاد کر دیتا ہوں کہ تلاش معاش کے ذریعہ تیرا قرض بھی ادا کرے اور اپنے اور اپنے اہل وعیال کے لئے رزق بھی حاصل کرسکے ''لا أحبسه لك ، ولكن ادعه يطلب لك ولنفسه ولعياله''(۳)

☆ مروان بن الحکم کے بھائی حارث بن حکم حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس آکر ان

---

(۱) مسند احمد : حديث أبي موسى الأشعري ،حدیث:۱۹۷۱۴،محقق شعیب الأرنؤط نے اس حدیث کو صحیح اور اس کے رجال کو ثقہ کہا ہے۔

(۲) بخاری: باب أبي موسي ومعاذ، حدیث:۴۰۸۸

(۳) اخبار القضاۃ :تسوية أبي هريرة بين الخصوم :۱/۱۱۲

کے تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے، اتنے میں ایک شخص آیا اور اس نے حارث کے خلاف دعوی کیا، سیدنا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فورا حارث کو حکم دیا اور اسے اٹھا کر اس کے فریق کے ساتھ بٹھایا، پھر مقدمہ سنا اور فیصلہ کیا۔(۱)

(۱) قاضی شریح بن حارث

نام شریح، کنیت ابوامامیہ، نسبا کندی ہیں، ایک روایت یہ ہے کہ شریح نسلا عرب نہ تھے؛ بلکہ ان خانوادوں میں سے تھے جو کندہ کے حلیف بن کریمن میں آباد ہو گئے تھے۔

علامہ ابن سعد اور حافظ ابن عبد البر وغیرہ تمام ارباب سیر وطبقات اسی کے قائل ہیں کہ وہ تابعی ہیں، البتہ وہ تابعین کے زمرے میں نہایت ممتاز اور اونچا درجہ رکھتے ہیں۔

قضا کی استعداد وقابلیت

ایک قاضی کے لئے جن اوصاف وکمالات کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان میں بدرجۂ اتم موجود تھے، فضل وکمال کا یہ حال تھا کہ امام نووی لکھتے ہیں کہ شریح کی توثیق، دینداری، فضل وکمال، ذکاوت اوران کی روایات سے احتجاج پر سب کا اتفاق ہے۔

"واتفقوا علی توثیق شریح، ودینه، وفضله، والاحتجاج بروایاته، وذکائه" (۲) حافظ صفی الدین خزرجی لکھتے ہیں کہ: وہ بڑے جلیل القدر اور ذکی علماء میں سے تھے۔(۳)

حدیث وفقہ کے علاوہ مروجہ فنون قیافہ شناسی اور شاعری میں بھی کمال دستگاہ رکھتے تھے، وہ طبعا نہایت ذہین، ذکی، طباع، فریس اور فہیم واقع ہوئے تھے، پیچیدہ سے پیچیدہ معاملات کی تہہ تک بآسانی پہنچ جاتے تھے، ان اوصاف وکمالات نے ان میں قدرۃ قضاء کی نہایت اعلیٰ استعداد پیدا کردی تھی، حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو زبان رسالت سے "أقضاهم علی" کی سند ملی اور شریح کو "اقضی العرب" عرب کا سب سے بڑا قاضی فرماتے تھے۔

(۱) اخبار القضاۃ: تسویة أبی هریرة بین الخصوم: ۱۱۲/۱

(۲) تهذیب الأسماء: حرف الشین المعجمة: ۳۴۱/۱

(۳) تهذیب الکمال: ۴۳۷/۱۲، مؤسسة الرسالة، بیروت

عہدۂ قضا پر تقرر سے پہلے ان کی یہ صلاحیت واستعداد زبان زد عام وخاص ہو چکی تھی ، لوگ اپنے معاملات اور فیصلہ کن امور میں ان کو حکم اور ثالث بناتے تھے ، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے ایک فیصلہ کو دیکھ کر انہیں کوفہ کا قاضی بنایا تھا۔

اس کا واقعہ یوں ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص سے بشرط پسندیدگی ایک گھوڑا خریدا اور امتحان کے لئے ایک سوار کو دیا، گھوڑا سواری میں چوٹ کھا کر داغی ہو گیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو واپس کرنا چاہا، گھوڑے کے مالک نے لینے سے انکار کر دیا، اس پر نزاع ہوئی اور شریح ثالث بنائے گئے، انہوں نے یہ فیصلہ دیا کہ اگر گھوڑے کے مالک سے اجازت لے کر سواری کی گئی تھی تو گھوڑا واپس کیا جا سکتا ہے ورنہ نہیں۔(۱)

اسی فیصلہ پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کو کوفہ کا قاضی بنایا، قاضی شریح نے اس قابلیت، اس خوش اسلوبی اور دیانت سے اس خدمت کو انجام دیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے لے کر عبدالملک کے زمانہ تک مسلسل ساٹھ سال قاضی رہے، اس طویل مدت میں بڑے بڑے انقلابات وحوادث ہوئے، خلافت راشدہ کا وجود ختم ہو کر اموی حکومت کا آغاز ہوا، ابن زبیر رضی اللہ عنہ اور امویوں میں خوں ریز معرکہ آرائیاں ہوئیں، ساری دنیائے اسلام میں انقلاب برپا ہوا، لیکن شریح بدستور مسند قضاء پر متمکن رہے، ابن زبیر رضی اللہ عنہما اور عبدالملک کی جنگ کے زمانہ میں اپنا دامن بچانے کے لئے صرف چند برسوں کے لئے مستعفی ہو گئے تھے۔

قاضی شریح کے مبنی برانصاف عدالتی فیصلے

فیصلوں میں عدل یہ ان کا عظیم اور بڑا وصف تھا، وہ فیصلہ کرنے میں کسی خارجی یا داخلی اثر سے بالکل متأثر نہ ہوتے، وہ قانون اور حق وانصاف کے مقابلے میں بڑی سے بڑی شخصیت کی بھی پرواہ نہیں کرتے تھے۔

☆ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مذکورہ بالا واقعہ بعض روایتوں میں یوں منقول ہے کہ: گھوڑا جب امتحان میں ہلاک ہو گیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسے واپس کرنا چاہا اور اس پر

---

(۱) كتاب الأوائل : الباب السابع ذكر القضاة

تنازعہ ہوا اور شریح حکم مقرر ہوئے، تو انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ جس کو خریدا ہے اسی کو لینا ہوگا یا جس حالت میں لیا تھا، اسی حالت میں واپس کرنا ہوگا، اس فیصلہ پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کو کوفہ قاضی بنا دیا ''فبعثه قاضيا ''(۱)

یہاں انہوں نے ایک معمولی شخص کے مقابلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خلاف فیصلہ دیا ہے، اگر ان کا لڑکا بھی قانون کی زد میں آجاتا تھا تو اس کی بھی پرواہ بالکل نہ کرتے تھے، ایک مرتبہ ان کے ایک لڑکے نے ایک ملزم کی ضمانت کی، ملزم بھاگ گیا تو اس کے بدلہ شریح نے لڑکے کو قید کر دیا۔(۲)

☆ ایک مرتبہ ان کے ایک اہم خاندان نے ایک شخص پر کچھ ناروا ظلم کیا، شریح نے اس کو ایک ستون میں بندھوا دیا، جب وہ فیصلہ کرکے اٹھے تو اس شخص نے کچھ کہنا چاہا تو شریح نے کہا: مجھ سے کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں ہے؛ اس لئے کہ میں نے تم کو نہیں قید کیا ہے؛ بلکہ حق نے قید کیا ہے ''إني لم أحبسك ، إنما حبسك الحق ''(۳)

☆ عدل گستری کی ایک اور مثال ملاحظہ کیجئے کہ: ان کے ایک لڑکے اور بعض دوسرے اشخاص کے درمیان کسی حق کے بارے میں تنازعہ تھا، لڑکے نے ان سے واقعات بتا کر پوچھا کہ اگر میرا حق نکلتا ہو اور مقدمہ میں کامیابی کی امید ہو تو میں دعوی کروں ورنہ خاموش رہوں، شریح نے مقدمہ کی نوعیت پر غور کر کے دعوی کرنے کا مشورہ کیا، لیکن جب مقدمہ ان کے سامنے پیش ہوا تو لڑکے کے خلاف فیصلہ دیا، فیصلہ دے کر جب گھر آئے تو لڑکے نے کہا: اگر میں نے پہلے آپ سے مشورہ نہ کرلیا ہوتا تو مجھ کو آپ سے کوئی شکایت نہ ہوتی؛ لیکن مشورہ دینے کے بعد آپ نے مجھے ذلیل کیا، شریح نے جواب دیا، جان پدر! تو مجھے ان لوگوں کے

---

(۱) طبقات ابن سعد: ۶/۱۳۱، دار صادر، بیروت

(۲) طبقات ابن سعد: ۶/۱۳۱، دار صادر، بیروت

(۳) طبقات ابن سعد: ۶/۱۳۵، دار صادر، بیروت

جیسے روئے زمین بھر کے آدمیوں سے زیادہ عزیز ہے، لیکن خدا مجھے تجھ سے زیادہ عزیز ہے،''یا بني والله أنت أحب إلی من ملء الأرض مثلهم ؛ولكن الله هو أعز علی منك ''جب تو نے مجھ سے مشورہ کیا تو مقدمہ دیکھنے کے بعد مجھے ان لوگوں کا حق نظر آیا، اگر میں اس وقت تجھ سے اس کو ظاہر کر دیتا تو تو ان سے صلح کر لیتا اور ان لوگوں کا حق ضائع ہو جاتا۔(۱)

☆ شعبی کہتے ہیں کہ: میں قاضی شریح کی خدمت میں بیٹھا تھا، اتنے میں ایک عورت روتے ہوئے اپنے شوہر کی شکایت لے کر آئی جو کہ گھر سے باہر تھا، عورت زار وقطار رو رہی تھی، میں نے قاضی شریح سے کہا: اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے، میرے خیال میں یہ عورت مظلوم ہے اور اس کا حق پامال ہوا ہے۔ قاضی شریح نے پوچھا: کس دلیل کی بنا پر تم اس عورت کو مظلوم سمجھ رہے ہو؟ میں نے عرض کیا: اس کے زار وقطار رونے اور آنسوؤں کا سمندر بہانے کی وجہ سے۔ قاضی شریح نے فرمایا: جب تک حقیقت معاملہ واضح نہ ہو جائے، فیصلہ سنانے میں جلدی مت کرو ؛ کیوں کہ یوسف علیہ السلام کے بھائی جب اپنے والد یعقوب علیہ السلام کی خدمت میں آئے تھے تو وہ بھی زار وقطار آنسو بہا رہے تھے، حالاں کہ انہوں نے یوسف علیہ السلام پر ظلم ڈھایا تھا''یا شعبي أن إخوة یوسف علیه السلام جاء وا أباهم عشاء یبکون''۔(۲)

عزیز قریب کی شہادت کا قانون

حدیث میں عزیز وقریب کی شہادت کی کوئی ممانعت نہیں ہے، اس لئے ایک عزیز کے مقدمہ میں دوسرے عزیز کی شہادت قبول کرنے میں کوئی قانونی رکاوٹ نہیں ہے، ابن ابی شیبہ کا بیان ہے کہ قاضی شریح نے عزیز کے مقابلہ میں عزیز کی شہادت نا قابل اعتبار قرار دی اور یہ قانون بنادیا کہ لڑکے کی شہادت باپ کے متعلق، باپ کی شہادت لڑکے کے متعلق، بی بی کی شہادت شوہر کے متعلق، شوہر کی شہادت بیوی کے متعلق، آقا کی

(۱) طبقات ابن سعد:۱۳۱/۶ (۲) وفیات الأعیان :القاضی شریح،۴۶۰/۲

شہادت غلام کے متعلق اور غلام کی شہادت آقا کے متعلق اور اجیر کی شہادت اس شخص کے متعلق جس نے اس کو اجرت پر لیا ہو قبول نہیں کی جاسکتی، اس اصول پر وہ اس سختی سے عامل تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی شہادت مسترد کردی، اس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زرہ کہیں گر پڑی اور ایک ذمی کے ہاتھ لگی، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شریح کی عدالت میں دعوی پیش کیا، شریح نے ذمی سے پوچھا: تم کیا کہتے ہو؟ اس نے کہا: میری ملکیت کا ثبوت یہ ہے کہ زرہ میرے قبضہ میں ہے، شرع نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ: آپ کے پاس اس کی کوئی شہادت ہے کہ زرہ گر گئی تھی، انہوں نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور قنبر کو شہادت میں پیش کیا، شریح نے کہا: قنبر کی شہادت تو قبول کرتا ہوں؛ لیکن حسن رضی اللہ عنہ کی شہادت رد کرتا ہوں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نہیں سنا ہے کہ "الحسن والحسين سيدا شباب أهل الجنة" شریح نے کہا سنا ہے؛ لیکن باپ کے مقابلہ میں لڑکے کی شہادت معتبر نہیں ہوتی، اس فیصلہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بلا چوں وچرا تسلیم کیا اور زرہ یہودی کے پاس رہنے دی، اس واقعہ کا اس یہودی پر یہ اثر ہوا کہ اس نے خود اقرار کرلیا کہ زرہ آپ ہی کی ہے اور تمہارا دین سچا ہے، مسلمانوں کا قاضی امیر المومنین کے خلاف فیصلہ کرتا ہے اور وہ بلا چوں وچرا سر خم کردیتا ہے، میں شہادت دیتا ہوں کہ محمد خدا کے سچے رسول ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس کے اسلام سے اتنی مسرت ہوئی کہ اس یادگار میں انہوں نے زرہ اپنی طرف سے اس کو دے دی۔(۱)

دینی واخلاقی مزاج

علمی کمالات کے ساتھ وہ فضائل اخلاق سے بھی آراستہ تھے، بڑے دیندار اور عبادت گذار تھے، قضاء کی ذمہ داریوں اور مشغولیتوں کے باوجود ان کا کافی وقت عبادت میں گذرتا تھا، ان کے غلام ابوطلحہ کا بیان ہے کہ: جب وہ صبح کی نماز پڑھ کر واپس آتے تھے تو گھر کے دروازے بند کرکے قریب قریب آدھے دن تک نوافل میں مشغول

---

(۱) شذرات الذهب: سنة ثمان وسبعين: ۸۵/۱، دار ابن کثیر

رہتے تھے ''فظن أنه يصلی''(۱)

طبعاً نہایت خوش اخلاق اور منکسر المزاج واقع ہوئے تھے، سلام میں ہمیشہ خود سبقت کرتے تھے، قاسم کا بیان ہے کہ کوئی شخص سلام میں شریح پر سبقت نہیں کرسکتا تھا، عیسیٰ بن حارث کا بیان ہے کہ میں ہمیشہ سبقت کرنے کی کوشش کرتا تھا، مگر کبھی کامیاب نہ ہوا ''كان أولاهما بالله الذی يبدأ بالسلام''(۲)

وہ فتنہ وفساد کو ناپسند کرتے تھے، ان کی زندگی میں بڑے بڑے سیاسی انقلابات آئے، عبدالملک اور ابن زبیر رضی اللہ عنہ کا ہنگامہ برسوں جاری رہا، جس کی لپیٹ سے بہت کم لوگ محفوظ رہ سکے، لیکن شریح کا دامن اس سے بھی بچا رہا، اس ہنگامہ کے زمانہ میں وہ چند سال کے لئے مستعفی ہوگئے تھے ''فأقام قاضيا خمسا وسبعين سنة لم يتعطل فيها إلا ثلاث سنين امتنع فيها من القضاء فی فتنة الزبير''(۳)

دوسروں کی راحت کا اتنا خیال تھا کہ اپنے لئے کسی کو ادنیٰ تکلیف دینا بھی پسند نہ کرتے تھے، اپنے گھر کے تمام پرنالے اندر لگاتے تھے کہ اس کے پانی سے دوسروں کو تکلیف نہ پہنچے ''لا يتخذ مثعبا فی داره''(۴)

وفات

آپ نے حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی اور حضرت معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں کوفہ کے عہدۂ قضا پر فائز رہے، اور ۱۰۸ سال کی عمر پا کر سرزمین کوفہ میں ۸۷ ہجری میں داغ مفارقت دے گئے، آپ نے آخری عمر ضعف پیری کی وجہ سے استعفیٰ دے دیا تھا، دم آخر یہ وصیت کی تھی کہ بغلی قبر کھودی جائے، جنازہ کی اطلاع کسی کو نہ دی جائے، جنازہ کے ساتھ نوحہ نہ کیا جائے، جنازہ کو آہستہ آہستہ لے جایا جائے، قبر پر چادر نہ ڈالی جائے، ان وصایا کے بعد انتقال فرمایا۔(۵)

---

(۱) طبقات ابن سعد: ۱۲۸/۶، دار صادر، بیروت (۲) طبقات ابن سعد: ۱۴۱/۶، دار صادر، بیروت

(۳) وفيات الاعيان: القاضی شريح: ۴۶۰/۲، دار صادر، بیروت

(۴) طبقات ابن سعد: ۱۴۳/۶، دار صادر، بیروت (۵) وفیات الاعیان: القاضی شریح: ۴۶۳/۲

(۲) کعب بن سوُر

کعب سے کوئی حدیث منقول نہیں ہے، اس لئے ارباب رجال نے ان کے حالات نہیں لکھے ہیں؛ لیکن وہ ایک ممتاز تابعی ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہم صحبت و ہم جلیس اور نہایت ذہین اور طباع تھے، ان کی ذہانت اور طباعی کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو عہدۂ قضاء پر مامور کیا۔

ان کے تقرر کا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک عورت آپ کے پاس حاضر ہوئی اور کہا کہ: میں آپ کے پاس دنیا کے ایک بہترین آدمی کی شکایت لے کر آئی ہوں، کوئی آدمی عمل میں اس پر سبقت نہیں لے جاسکتا، اور اس کے جیسا عمل نہیں کرسکتا، وہ قیام لیل میں صبح کر دیتا ہے، روزے میں سارا دن گذار دیتا ہے، اتنا کہنے کے بعد اس عورت کو شرم دامن گیر ہوئی اور اس کے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی کہ امیر المؤمنین مجھے معاف فرمایئے، آپ نے فرمایا: خدا تم کو جزائے خیر دے، تم نے اچھی تعریف کی، میں نے تم کو معاف کیا، اس کے بعد وہ عورت چلی گئی، اس کے واپس جانے کے بعد کعب نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ: امیر المؤمنین اس عورت نے آپ کے سامنے نہایت بلیغ پیرایہ میں شکایت پیش کی ہے، فرمایا کہ: کیسی شکایت؟ کعب نے کہا: اپنے شوہر کی (یعنی وہ رات دن عبادت میں مشغول رہتا ہے، اور اس کی طرف ملتفت نہیں ہوتا) یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عورت کو بلوا کر کعب سے کہا: تم دونوں کا فیصلہ کردو، کعب نے عرض کیا: آپ کی موجودگی میں فیصلہ کروں؟ فرمایا: جس چیز کو تم نے سمجھ لیا میں نہ سمجھ سکا، اس کا فیصلہ بھی تم ہی کو کرنا چاہئے، چنانچہ کعب نے کلام پاک کی اس آیت: ''فانکحوا ما طاب لکم من النساء ''تم کو جو عورتیں پسند ہوں ان سے نکاح کردو دو، تین اور چار تک۔(۱)

سے استدلال پر کہ جب قرآن میں چار بیویوں کی اجازت ہے تو اس کے یہ معنی

---

(۱) کنز العمال: حقوق متفرقۃ، حدیث: ۴۵۹۱۶

یہ ہوئے کہ ہر چار شبانہ یوم میں ایک شبانہ یوم ہر بیوی کا حق ہوا تو تنہا بیوی کا کم سے کم یہی حق ہوگا، اس عورت کے شوہر کو تین دن روزہ رکھنے اور ایک دن بیوی کے لئے افطار کرنے اور تین رات عبادت کرنے اور ایک رات بیوی کے پاس رہنے کا حکم دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ استدلال سن کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ: یہ (استدلال) میرے لئے پہلے (ذہانت) سے بھی زیادہ تعجب انگیز ہے، چنانچہ اسی وقت ان کو بصرہ کا قاضی بنا کر بھیج دیا ''أن عمر بن الخطاب بعث كعب بن سور على قضاء البصرة''(۱)

فتنہ سے اجتناب

کعب بصرہ جانے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتے رہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ میں اختلاف رونما ہوا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مقابلہ کی تیاری کے لئے طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ بصرہ آئیں تو کعب اس خانہ جنگی سے اپنے کو محفوظ رکھنے کے لئے ایک گھر میں خلوت نشیں ہوگئے اور کھانے کا سامان لینے کے لئے اس میں ایک سوراخ کرلیا، لوگوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے عرض کیا: اگر کعب آپ کے ساتھ ہوجائیں تو پورا قبیلہ ازد آپ کے ساتھ ہوجائے گا، یہ سن کر آپ کعب کے پاس تشریف لے گئیں اور باہر سے پکار کر کعب سے گفتگو کرنی چاہی، انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا، آخر میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: کعب کیا میں تمہاری ماں نہیں ہوں اور تم پر میرا حق نہیں ہے، یہ سن کر کعب جواب دینے پر مجبور ہوئے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے گفتگو کی، انہوں نے فرمایا: میں چاہتی ہوں کہ تم لوگوں کو سمجھا کر اصلاح کی کوشش کرو، اس حکم کی تعمیل میں کعب کو کیا عذر ہوسکتا تھا، چنانچہ وہ قرآن لے کر لوگوں کو سمجھانے کے لئے نکلے اور دونوں فریق کو سمجھاتے تھے اور قرآن کی طرف بلاتے تھے۔

---

(۱) طبقات ابن سعد: كعب بن سور: ۹۲/۷، دار صادر، بیروت

وفات

لیکن یہ معاملہ افہام وتفہیم سے بہت آگے بڑھ چکا تھا، اس لئے ان کی کوششیں بے کار ثابت ہوئیں اور جنگ شروع ہوگئی اور یہ اپنا فرض ادا کرتے ہوئے کسی شقی کے تیر سے ہلاک ہوگئے ''فجاء سهم غرب فقتله''(۱)

(۳) أیاس بن معاویہ

نام ایاس، کنیت ابو واثلہ، نسب اس طرح ہے کہ ایاس بن معاویہ بن قرۃ بن ایاس بن ہلال بن رئاب بن عبیدہ بن سواۃ بن ساریہ بن ذیبان بن ثعلبہ بن سلیم بن اور بن قریبہ مزنی۔

فضائل وکمالات

ایاس اس دور کے مشہور قضاۃ میں سے تھے، فقہ ان کا خاص فن تھا اس میں ان کے امتیازی اور خصوصی درجہ کی وجہ سے عجلی ان کو فقیہ لکھتے ہیں، اپنی فقہی کمال کی وجہ سے وہ اموی دور میں بصرہ کے عہدہ قضاء پر مامور ہوئے، ان کے تقرر کے وقت حضرت حسن بصریؒ ان کے پاس تشریف لے گئے، انہیں دیکھ کر ایاس رونے لگے ''لما استقضى إياس أتاه الحسن فبكى إياس''(۲)

ایاس کو فہم وفراست، ذکاوت ودور اندیشی سے بھی وافر حصہ ملا تھا، وہ عقل ودانش کے مجسم پیکر تھے، ابن سعد ان کی فراست اور ذکاوت کے تعلق سے لکھتے ہیں کہ: ''كان عاقلا من الرجال فطنا''(۳) ابن سیرین کے سامنے جب ان کا ذکر آتا تو فرماتے کہ: ''وہ مجسم فہم ہیں ''إنه فهم''(۴) ان کے عہد کے لوگ کہتے تھے کہ ہر صدی میں ایک بڑا عاقل پیدا ہوتا ہے اور اس صدی کے عاقل ایاس ہیں'' يولد

(۱) طبقات ابن سعد: کعب بن ثور: ۷/۹۳، دار صادر، بیروت

(۲) طبقات ابن سعد: ایاس بن معاویہ: ۷/۲۳۴، دار صادر، بیروت

(۳) طبقات ابن سعد: إياس بن معاويه: ۷/۲۳۴، دار صادر، بیروت

(۴) تهذيب التهذيب: حرف الألف، ۳/۳۸۳، مطبعة دائرة المعارف النعمانية

فی کل مائة سنة رجل تام العقل ، فکانوا یرون إیاس بن معاویة منهم ''(۱) ابن عماد حنبلی لکھتے ہیں کہ: ان کی ذکاوت اور فطانت ضرب المثل تھی، ابوتمام کا شعر ہے:

أقدام عمر وفی شجاعة غنتر
فی حلم أحنف فی ذکاء ایاس (۲)

قضاء اور فراست کے واقعات

قضاء میں مہارت بڑی حدتک ذہانت وفطانت پر موقوف ہوتی ہے، اس لئے ایاس اس دور کے ممتاز ترین قضاۃ میں شمار کئے جاتے تھے، ان کی دوراندیشی ان کی فراست وذکاوت کے یہ واقعات ملاحظہ کیجئے۔

☆ عمر بن ہبیرہ نے ایاس بن معاویہ کو بلایا اور پوچھا: آپ قرآن پڑھ سکتے ہیں؟ ایاس بن معاویہ نے کہا: ہاں، عمر بن ہبیرہ نے کہا: فرائض کا آپ کو علم ہے؟ ایاس بن معاویہ نے کہا: ہاں، عمر بن ہبیرہ نے کہا: عجم کی تاریخ سے آپ کو دلچسپی ہے؟ ایاس نے کہا: پڑھ رکھی ہے، عمرو بن ہبیر نے کہا: عرب کی تاریخ پڑھی ہے، قاضی ایاس نے کہا: ہاں پڑھی ہے، عمر بن ہبیر نے کہا: میری تمنا ہے کہ آپ کو اپنے ساتھ بحیثیت معاون مقرر کروں، ایاس نے کہا: میرے اندر تین خصلتیں ہیں اوران تینوں کے ہوتے ہوئے میں منصب قضا کے لئے مناسب نہیں ہوسکتا۔

عمرو بن ہبیر نے کہا: وہ تین خصلتیں کیا ہیں؟

ایاس نے کہا: پہلی خصلت تو یہ ہے کہ میں بدصورت ہوں جو آپ دیکھ رہے ہیں، دوسری یہ ہے کہ میرے اندر حدّت (تیز مزاجی) ہے اور تیسری یہ ہے کہ میں اس ذمہ داری کے نبھانے سے عاجز ہوں۔

عمرو بن ہبیر نے کہا: آپ بدصورت ہیں تو مجھے کوئی لوگوں کے سامنے بازار حسن

---

(۱) تهذیب التهذیب: حرف الألف، ۳۸۳/۳، مطبعة دائرة المعارف النعمانیة

(۲) وفیات الأعیان: أبوتمام: ۱۵/۲، دارصادر، بیروت

قائم کرنا نہیں ہے، "وأما الدمامة لا أريد أن أحاسن بك" آپ اپنی عاجزی کی بات کر رہے ہیں مگر میں سمجھتا ہوں آپ تکلف سے کام لے رہے ہیں، ورنہ آپ منصبِ قضا کے لئے بالکل موزوں ہیں اور جہاں تک آپ کی حدّت اور گرم مزاجی کا سوال ہے تو کوڑا آپ کو درست کر دے گا، جائیے میں نے آپ کو قاضی بنا دیا۔ پھر عمر بن ہبیرہ نے قاضی ایاس بن معاویہ کو سو درہم عطا کئے، یہ ان کی زندگی کی پہلی کمائی تھی۔(۱)

☆ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ایک شخص نے ایک شخص کے پاس کچھ مال امانت رکھوایا تھا، جب اس نے واپس مانگا تو امانت دار نے انکار کر دیا، مال کے مالک نے ایاس کی عدالت میں دعوی کیا، انہوں نے کہا: اس وقت لوٹ جاؤ، اس واقعہ کو پوشیدہ رکھنا، اس شخص کو یہ معلوم نہ ہونے پائے کہ تم میرے پاس آئے تھے، دو دن کے بعد پھر آنا، اس کو لوٹا کر ایاس نے امانت دار کو بلوایا اور اس سے کہا: میرے پاس بہت سی مال آ گیا ہے، میں اس کو تمہارے پاس رکھوانا چاہتا ہوں، تمہارا گھر محفوظ ہے، اس نے کہا: ہاں، ایاس نے کہا: تو مال رکھنے کے لئے کسی جگہ کا انتخاب کرلو، اور دو بار بردار لے کر آؤ، اس گفتگو کے بعد ایاس نے مال کے مالک کو بلوا کر کہا کہ: اب جا کر تم اس شخص سے اپنا مال مانگو اگر دے دے تو فبہا ورنہ اسکو کہنا کہ میں جا کر قاضی کو اطلاع کر دوں گا، اس شخص نے جا کر کہا کہ: میرا مال دو، ورنہ میں قاضی کو جا کر اطلاع دوں گا، یہ سن کر اس نے کل روپیہ واپس کر دیا اور صاحب مال نے آ کر قاضی کو اطلاع دے دی کہ میرا مال مجھ کو مل گیا، اس کے بعد سابق قرارداد کے مطابق وہ ایاس کے پاس روپیئے لینے کے لئے آیا، انہوں نے اس کو ڈانٹ کر نکال دیا: "وجاء الأمين إلى اياس لموعده فزجره وأشهره، وقال: لاتقربين يا خائن"(۲)

---

(۱) تاريخ دمشق لابن عساكر : إياس بن معاويه :۲۵/۱۰،دار الفكر للطباعة والنشر

(۲) الطرق الحكمية:فصل في الحكم بالفراسة :۲۵/۱،مكتبة دار البيان

☆ دو شخص قاضی عیاض کے یہاں اپنی دو چادروں کے سلسلے میں مقدمہ لے کر آئے ،ان میں ایک چادر سرخ تھی اور ایک ہری، ان میں سے ایک شخص نے کہا: میں حوض میں غسل کرنے کے لئے چلا گیا اور اپنی چادر اوپر رکھ چھوڑا، اور یہ شخص آیا اور اس نے اپنی چادر بھی میری چادر کے بازو رکھی اور وہ بھی غسل کرنے کی غرض سے حوض میں داخل ہو گیا اور یہ پہلے نکل کر میری چادر لے کر چلتا بنا، میں حوض سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہوا چلا، اس کا خیال یہ ہے کہ یہ چادر اسی کی تھی، تو قاضی عیاض نے کہا: تمہاری یہاں کوئی دلیل اور بینہ ہے، اس نے کہا: نہیں، تو انہوں نے ایک کنگھا منگوایا اور اس سے دونوں کے سروں میں کنگھی کی، ان میں سے ایک کے سر سے سرخ اون برآمد ہوا اور دوسرے کے سر سے ہرا اون، تو جس کے سر سے سرخ اون نکلا اس کے حق میں سرخ چادر کا فیصلہ کیا اور جس کے سر سے ہرا اون نکلا اس کے حق میں ہری چادر کا فیصلہ دیا ''فقضى بالحمراء للذى خرج من رأسه صوف أحمر، وبالخضراء للذى خرج من رأسه صوف أخضر''(۱)

☆ ابراہیم بن مرزوق بصری کہتے ہیں کہ: ہم ایاس کے عہدہ قضاء پر مامور ہونے سے پہلے ہی سے ان کی ذہانت اور فطانت کو نوٹ کیا کرتے تھے، کہتے ہیں کہ ایک شخص آیا اور اونچی جگہ پر بیٹھ گیا اور راہ تکنے لگا، پھر ایک شخص کو دیکھ کر اپنی جگہ سے نیچے اتر آیا اور اس کو بغور دیکھ کر پھر اپنی جگہ لوٹ آیا، ایاس بن معاویہ کے ہم نشینوں اور مصاحبوں نے کہا: اس آدمی کے متعلق آپ کا کہنا ہے، یہ کوئی ضرورت مند معلوم ہوتا ہے، ایاس نے کہا: یہ بچوں کا معلم اور اس کا کانا غلام کھو گیا ہے اور یہ اس کو تلاش کر رہا ہے، اس سے انہوں نے معلوم کیا تو ایسا ہی پایا، ان لوگوں نے ایاس سے پوچھا: تم نے کیوں کر اس کو اس کے مقصد کو جانا تو ایاس نے کہا: جب اس نے اپنے بیٹھنے کے لئے اونچی جگہ تلاش کی تو میں سمجھ گیا کہ یا تو یہ بادشاہ

(۱) أخبار القضاة: ما حفظناه من قضايا إياس بن معاوية وفقهه: ۳۳۹/۱

ہوسکتا ہے اور اس کی حیثیت بادشاہ کی سی نہ تھی یا بچوں کا معلم اور استاذ ہوسکتا ہے اور یہ جب راستہ اور آنے جانے والوں کو تک رہا تھا تو میں غور کیا اور اچانک اپنے غلام کے مشابہ آدمی پر اس کی نظر پڑی تو اس نے اس کی آنکھوں کی کھوج شروع کی تو میں نے اندازہ لگایا کہ اس کا اندھا غلام کھو گیا ہے "فعلمت أنه نظر في وجهه إلى عينيه ، فعلمت أن غلامه أعور قد ذهبت ااحدى عينيه " (۱)

☆ قاضی ایاس کہتے ہیں کہ: میں صرف ایک آدمی سے مغلوب ہوگیا، واقعہ یہ ہے کہ میں بصرہ کی عدالت میں تھا، اتنے میں ایک آدمی میرے پاس بحیثیت گواہ حاضر ہوا اور گواہی دی کہ فلاں باغیچہ کا مالک فلاں آدمی ہے، میں نے اس گواہ کو جانچنا چاہا کہ وہ جس بات کی گواہی دے رہا ہے اس کی جانکاری اس کو کہاں تک ہے، چنانچہ میں نے پوچھا: اس باغیچے میں کتنے درخت ہیں؟ گواہ بولا: میرے آقا قاضی صاحب اس عدالت میں کتنے برسوں سے منصبِ قضاء کی ذمہ داری ادا کر رہے ہیں؟۔ میں نے گھبرا کر کہا: اتنے برسوں سے۔ گواہ بولا: اس چھت کی کڑیوں کی تعداد کتنی ہے؟ گواہ کے سوال کا مقصد میں سمجھ گیا اور کہا: حق تمہارے ساتھ ہے، جاؤ میں نے تمہاری شہادت قبول کی۔ (۲)

قاضی ایاس بن معاویہ کی ذہانت اور فطانت کے چرچے تھے، عدالت میں بیٹھتے تو ایسے شاندار اور بے لاگ فیصلے کرتے کہ لوگ ششدر اور حیرت زدہ رہ جاتے، تاریخ نے ان کے فیصلوں کے حوالے سے متعدد واقعات بیان کئے ہیں، بڑی شخصیات کے جہاں بہت سارے مداح اور عزت وتوقیر کرنے والے ہوتے ہیں وہیں حاسدین کی بھی ایک بڑی ٹولی ہوتی ہے، چنانچہ کچھ لوگوں کی بڑی تعداد وہ بھی ہوتی ہے جو ان سے حسد اور جلن کرتے ہیں اور ہر وقت ان کی کوشش یہ ہوتی ہے ان کی سبکی اور خست کا موقع ہاتھ آجائے، چنانچہ وہ ان کے عیوب تلاش کرنا شروع کی، تاکہ ان کی شخصیت داغدار ہوجائے۔

---

(۱) تاريخ دمشق :اياس بن معاوية :۳۳/۱۰

(۲) سنہرے فیصلے :عبدالمالک مجاہد:۱۴۱

خاصی تگ و دو کے بعد ان کو ایک بات ہاتھ لگی کہ قاضی ایاس فیصلہ کرنے میں بہت جلد بازی کرتے ہیں، یقیناً یہ ایک بڑا عیب ہے جو قاضی کے شان کے منافی ہے، سنجیدگی اور متانت کا تقاضا یہ ہے کہ فیصلہ کرنے سے پہلے خوب غور وفکر کیا جائے اور اس کے بعد فیصلہ سنایا جائے ان حاسدین نے ان کے بارے میں لوگوں میں یہ شوشہ چھوڑ دیا اور رفتہ رفتہ عوام میں یہ بات مشہور ہوتی گئی کہ قاضی صاحب فیصلہ کرنے میں بڑے جلد باز ہیں۔

ادھر قاضی ایاس بن معاویہ کو بھی حاسدین کی چہ میگوئیوں کے بارے میں معلوم ہو گیا، انہوں نے بھی حاسدین کو سبق سکھانے کا فیصلہ کیا۔

قاضی ایاس نے نہایت ادب سے ان لوگوں کو مجلس میں بلایا، ان کی خوب آو بھگت کی، ان کو خوب کھلایا پلایا اور پھر گفتگو شروع کی، اس دوران میں اچانک انہوں نے اپنے ہاتھ کو بلند کیا اور کہنے لگے: ذرا بتانا ان انگلیوں کی تعداد کتنی ہے؟ حاضرین مجلس نے ایک نظر ان کے ہاتھ پر ڈالی اور ایک زبان ہو کر کہا: پانچ ہیں، پوری پانچ۔ قاضی ایاس نے ان کی طرف تبسم بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا کہ: ساتھیو! تم نے جواب دینے میں اس قدر جلدی کیوں کی، تم ایک دو تین چار پانچ تک گن کر تھوڑی دیر انتظار کرتے، غور کرتے اور قدرے توقف کے بعد جواب دیتے؟ وہ کہنے لگے: قاضی صاحب! اس میں انتظار اور توقف کی کیا ضرورت ہے؟ جس چیز کی گنتی ہمیں معلوم ہو، بھلا اس میں توقف کیوں کریں؟ اب قاضی ایاس نے نہایت اطمینان اور سکون کے ساتھ ان سے کہنا شروع کیا: جب میرے پاس مقدمات آتے ہیں، میں فریقین کی بات سننے کے بعد فوراً ہی معاملے کی تہہ تک پہنچ جاتا ہوں تو پھر فیصلہ سنانے میں کیوں توقف کروں؟ اب قاضی ایاس نے اس مثال سے معترضین کو جواب دیا، اس طرح حاسدین کی چال ناکام ہو گئی اور انہیں منہ کی کھانی پڑی، اور انہیں معلوم ہوا کہ وہ فیصلہ کرنے میں عجلت اور جلد بازی سے کام نہیں لیتے؛ بلکہ وہ اپنی خداداد ذہانت وفطانت کی بدولت بجلد معاملہ کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں اور بغیر کسی تاخیر کے مقدمہ کا فیصلہ کر دیتے ہیں۔

☆ ایک آدمی نے حکومت کے ایک بڑے عہدیدار کے پاس ایک تھیلی بطور امانت

رکھوائی اور بتایا کہ یہ دیناروں سے بھری ہوئی ہے اور خود ایک طویل مدت تک غائب رہا، جب امانت رکھوانے والا شخص طویل عرصہ اعلی افسر کے پاس نہ آیا تو اس نے ایک چال چلی، وہ یہ کہ اس نے تھیلی کے نچلے حصہ سے نہایت احتیاط کے ساتھ ڈوری کاٹ دی اور اس میں سے سارے دینار نکال کر اس کی جگہ درہم رکھ دیئے، پھر تھیلی کو اسی طرح سی دیا جیسی پہلے تھی، صاحب مال پندرہ سال کے بعد اس اعلیٰ افسر کے پاس آیا اور اس نے بطور امانت رکھوائی ہوئی اپنی تھیلی طلب کی، افسر نے صاحب مال کو اس کی تھیلی واپس کر دی جو اس طرح سر بمہر تھی جس طرح اس نے پندرہ سال قبل امانت رکھوائی تھی۔ جب صاحب مال نے تھیلی کھولی تو اس میں دینار کے بجائے درہم تھے، وہ یہ دیکھ کر جھنجھلا اٹھا اور بولا یہ تھیلی میری نہیں ہے، میری تھیلی میں دینار تھے، جب کہ اس میں درہم ہیں، مجھے اپنی دیناروں والی تھیلی چاہیئے۔ عہدے دار نے کہا: بھئی! غور سے دیکھو، تھیلی وہی ہے جو تم نے میرے پاس رکھوائی تھی، آج تک یہ سر بند ہے، یہی تھیلی تمہاری ہے، میں نے تمہیں کوئی دھوکا نہیں دیا ہے، ادھر وہ شخص اس سے اصرار کرتا رہا کہ مجھے دینار چاہیئے، میری تھیلی وہ ہے جس میں دینار تھے، جب بات نہیں بنی تو صاحب مال نے اس وقت کے امیر عمر بن ہبیرہ کے پاس مقدمہ دائر کر دیا، عمر بن ہبیرہ نے قاضی ایاس بن معاویہ کے پاس مقدمہ بھیج دیا۔ قاضی ایاس نے صاحب مال سے پوچھا: نوعیت مقدمہ بیان کرو؟ صاحب مال نے عرض کیا: میں نے اس عہدہ دار کے پاس دیناورں کی تھیلی بطور امانت رکھوائی تھی، مگر یہ مجھے درہموں کی تھیلی دے رہا ہے، قاضی ایاس نے پوچھا: کتنا عرصہ پہلے؟ صاحب مال نے جواب دیا: پندرہ برس پہلے۔ اب قاضی ایاس اس عہدے دار کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا: تم کیا کہتے ہو؟ عہدے دار نے کہا: اس کی تھیلی سر بمہر رکھی ہوئی ہے، قاضی ایاس نے پوچھا: کتنے برسوں سے؟ عہدے دار نے کہا: پندرہ برسوں سے۔ قاضی ایاس نے خادموں کو حکم دیا کہ اس تھیلی کا بندھن کھول کر اس کے دراہم بکھیر دو، خادموں

نے حکم کی تعمیل کی اور تھیلی کے پورے دراہم بکھیر دیئے۔ بکھرے ہوئے دراہم میں کچھ تو دس سال پرانے سکے تھے اور کچھ پانچ سال پرانے اور کچھ اس کے آگے پیچھے سالوں کے سکے تھے، قاضی ایاس نے عہدیدار سے مخاطب ہوئے، تم نے اقرار کیا ہے کہ یہ تھیلی تمہارے پاس پندرہ سال سے تھی اور اس تھیلی کے اندر دس پانچ سال پرانے سکے بھی ہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ تھیلی اس پندرہ سالہ مدت میں کبھی کھلی ضرور ہے، اور اس وقت دیناروں کو دراہم سے بدلا گیا ہے قاضی ایاس کی دلیل نے مجرم کو اقرار جرم پر مجبور کر دیا اور بالآخر عہدے دار نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا ''فأقر بالدنانير فألزمه إياها''(۱)

☆ کسی شعبہ اور صنف کے اشخاص کا اس شعبہ سے متعلق ایک کمال یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ہم پیشہ اشخاص کی خصوصیات پر پوری نظر رکھتا ہو، ایاس اس عہد کے تمام مفتیوں اور قضاۃ کے محاسن ومعائب سے خوب واقف تھے، حبیب بن شہد کا بیان ہے کہ ایک شخص ایاس کے پاس ایک مقدمہ میں مشورہ کے لئے آیا کہ وہ اس میں کس کی طرف رجوع کرے تو انہوں نے کہا کہ: اگر تم اس کا صحیح فیصلہ چاہتے ہو تو عبدالملک بن یعلی کے پاس جاؤ، وہ صحیح معنوں میں قاضی ہیں، اور اگر محض فتوی لینا ہے تو حسن بصری کے پاس جاؤ، وہ میرے اور میرے باپ کے استاذ ہیں، اور اگر صلح مقصود ہے تو حمید الطّویل کی طرف رجوع کرو، وہ اس طریقہ سے صلح کرادیں گے کہ تم سے کہیں گے کہ: تم اپنے حق کا کچھ حصہ لے لو اور کچھ چھوڑ دو اور اگر مقدمہ بازی کرنا ہے تو صالح الدوسی کے پاس جاؤ وہ تم کو رائے دیں گے کہ دوسرے کے حق سے بالکل انکار کر دو، اپنے حق سے زیادہ کا مطالبہ کرو اور جو لوگ موجود نہیں ہیں ان کو گواہ بناؤ ''اجحد ما عليك وادّع ما ليس لك وادع بينة غُيّبا''(۲)

۱۲۰ھ میں وفات پائی، اور ان کی عمر اس وقت ۷۶ سال تھی۔

---

(۱) تاريخ دمشق :۳۳/۱۰،دار الفكر للطباعة والنشر

(۲) اخبار القضاة : ما حفظنا من أخبار بن معاوية :۳۵۰/۱، المكتبة التجارية بمصر

(۴) شریک بن عبداللہ النخعی

ان کا نام شریک اور ابو عبداللہ کنیت تھی، یمن کے قبیلہ بنو مدحج کی ایک بڑی شاخ بنوالنخع سے نسبی تعلق رکھنے کے باعث نخعی کہلاتے ہیں۔ان کی ولادت خراسان کے مشہور مردم خیز شہر بخارا میں ۹۵ھ میں ہوئی، بنوالنخع بعد طلوع اسلام کے یمن سے کوفہ آ کر آباد ہو گئے، اس لئے قاضی شریک بھی تا حیات کوفہ ہی میں رہے، ان کا خاندان علم وفضل کے اعتبار سے نہایت بلند مقام رکھتا تھا، امام ابراہیم نخعی جیسے جلیل القدر تابعی اسی گلستان فضل ودانش کے ایک گل سر سبز تھے۔

عملی لیاقت اور علّو مرتبت

قاضی شریک کو فضل وکمال خاندانی ورثہ میں ملا تھا، فقہ وحدیث میں ان کی مہارت مسلّم تھی، اس کے علاوہ فہم ودانش، ذہانت وفطانت سے بھی بہرہ وافر پایا تھا، سلاطین وقت ان کے اکرام وتعظیم میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے، کوئی علماء حدیث کی مرویات کا ان سے بڑا واقف اس وقت نہ تھا۔(۱) ابن خلکان نے لکھا ہے کہ وہ عالم، فقیہ، ذی فہم، ذہین اور فطین تھے "کان عالما فهيما ذكيا" (۲) علامہ ذہبی نے بھی ان کو کثیر الروایہ اور بلند پایہ محدث قرار دیا ہے۔

فقہ میں بھی غیر معمولی کمال حاصل تھا اور اسی باعث وہ ایک طویل زمانہ تک واسط، اہواز اور کوفہ میں مسند عدل وانصاف کی زینت بنے رہے، علماء نے ان کے علم وفضل کا اعتراف کرتے ہوئے کمال تفقہ کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔

عہدۂ قضا

فقہ وفتاوی میں ان کے کمال تبحر کی وجہ سے بہت سے سلاطین نے انہیں اپنے زمانہ خلافت میں قضاء کے عہدۂ جلیلہ پر فائز کیا، سب سے پہلے خلیفہ منصور نے ۱۵۳ھ

---

(۱) میزان الاعتدال: شريك بن عبدالله النخعی: ۲/ ۲۷۰، دار المعرفة للطباعة والنشر، بيروت

(۲) وفيات الأعيان: القاضي شريك النخعي: ۲/ ٤٦٤، دار صادر، بيروت

میں انہیں کوفہ کا قاضی مقرر کیا اور پھر کچھ عرصہ کے بعد معزول کر دیا، اس کے بعد جب مہدی مسند خلافت پر جلوہ افروز ہوا تو اس نے قاضی شریک کو دوبارہ اس منصب پر مامور کیا "فعزله موسى الهادي" (۱) مؤرخ ابن خلکان نے اہواز کے قاضی ہونے کا بھی ذکر کیا ہے۔(۲)

عدل پروری

قاضی شریک کی کتابِ زندگی کا اصل باب ان کے زمانۂ قضا کا کردار و عمل ہے، وہ اس عظیم آزمائش سے بھی بڑی خوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے، اس پوری مدت میں عدل پروری، انصاف پسندی اور غیر جانبداری کی ایسی مثالیں قائم کیں کہ یہ تاریخ کا مستقل اور روشن باب ہے۔

خود قاضی صاحب کے زبانی یہ واقعہ لکھا ہے کہ:

☆ جب خلیفہ منصور نے مجھے کوفہ کا قاضی مقرر کیا تو میں وہاں گیا، والی کوفہ محمد بن سلیمان کا کاتب حماد بن موسی کسی قضیہ میں ماخوذ ہو کر میرے سامنے پیش ہوا، میں نے دلائل و شواہد کی بنیاد پر فیصلہ صادر کر کے جیل بھیج دیا، ایک دن ناگاہ مجھے خبر ملی کہ حاکم نے اسے رہا کر دیا ہے، میں نے سوچا کہ یہ پہلا موقع ہے، اگر اس بار ہی میں نے کمزوری کا ثبوت دیا تو پھر حالات پر قابو حاصل کرنا مشکل ہوگا۔

چنانچہ میں فوراً محمد بن سلیمان کے پاس پہنچا اور نہایت درشت لب و لہجہ میں کہا کہ: تمہیں تو میرے فیصلوں کے نفاذ میں ممد و معاون بننا چاہئے تھا نہ کہ مخالف تم نے قید سے رہا کر کے توہین عدالت کا ارتکاب کیا ہے، بخدا اگر تم نے اسے دوبارہ قید میں نہ پہنچایا تو میں امیر المؤمنین کے سامنے تمہاری حقیقت کی پول کھول کر رکھ دوں گا، یہ رنگ دیکھ کر حاکم مذکور نے فوراً اپنے کاتب کو قید خانہ میں واپس کر دیا "فرده إلى الحبس" (۳)

---

(۱) الاعلام: شریک بن عبداللہ: ۱۶۳/۳

(۲) وفيات الأعيان: القاضي شريط النخعي: ۴۶۴/۲، دار صادر، بیروت

(۳) أخبار القضاة: شريك بن عبد الله النخعي: ۱۵۱/۳، المكتبة التجارية بمصر

☆ کوفہ میں نہر فرات کے کنارے ایک خوبصورت باغ تھا جس کا مالک کوفہ کا ایک شخص تھا، اس باغ کے ساتھ ہی کوفہ کا گورنر موسیٰ کا محل تھا، موسیٰ کی خواہش تھی کہ کسی طرح یہ باغ خرید لے تا کہ اس کا محل کھلا اور کشادہ ہوسکے، چنانچہ اس نے اس کے مالک کو پیش کش کی کہ وہ باغ اسے فروخت کردے مگر اس نے انکار کردیا۔ کچھ عرصہ گذرا، وہ شخص فوت ہوگیا، اس کے ورثاء میں چند بیٹے اور ایک بیٹی تھی، اب موسیٰ بن عیسیٰ نے ورثاء کو دوبارہ پیش کش کی کہ وہ باغ خریدنا چاہتا ہے اور اس کے لئے خطیر رقم بھی پیش کی، لڑکوں نے اپنا حصہ بیچنے پر رضامندی ظاہر کردی، مگر بیٹی نے اپنا حصہ بیچنے سے انکار کردیا، اس نے اپنی حصہ کے اردگرد دیوار تعمیر کردی، وہ تمام ترغیبات کے باوجود اس کے حصہ کو فروخت کرنے پر آمادہ نہ ہوئی، گورنر نے ایک دن اپنے نوکروں کو حکم دیا جنہوں نے دیوار کو گرا کر اس زمین کو محل میں شامل کردیا، ادھر اس لڑکی نے گورنر کوفہ موسیٰ بن عیسیٰ کے خلاف قاضی شریک کی عدالت میں مقدمہ دائر کردیا۔ قاضی شریک نے گورنر کو حاضر عدالت ہونے کا حکم دیا، اس نے اس کو اپنی سبکی اور بے عزتی تصور کرتے ہوئے اس نے پولیس چیف کو یہ کہلا بھیجا کہ قاضی کو سمجھاؤ کہ اس نے ایک عورت کے دعوے کو بغیر کسی گواہوں کے کیسے قبول کرلیا۔ پولیس چیف حاضر عدالت ہوکر گورنر کا موقف بیان کیا، قاضی شریک نے کہا: میں نے تمہیں تو نہیں گورنر کو بلوایا تھا، اسے خود آکر وضاحت کرنی چاہئے، تم نے اپنا مشورہ دے کر عدالت کے معاملات میں دخل اندازی کرتے ہوئے توہین عدالت کی ہے، لہٰذا تمہیں جیل جانا ہوگا، اس کے ساتھ قاضی نے عدالتی پولیس کو حکم دیا کہ پولیس چیف کو حوالات میں بند کردیا جائے۔ گورنر کو جب پتہ چلا کہ پولیس چیف کے ساتھ کیا بیتی تو اس نے قاضی کو سمجھانے کے لئے چند معززین شہر کو روانہ کیا، چنانچہ یہ وفد قاضی کے پاس آیا، گورنر کا پیغام دیا اور اس کی ناراضگی سے آگاہ کیا۔ چنانچہ قاضی شریک نے کہا کہ عدالت کی نظر میں عام وخاص برابر ہیں؛ لہٰذا تمہیں بھی توہین عدالت کے

جرم میں جیل بھجوایا جاتا ہے، یہ احوال دیکھ کر خود گورنر اپنی پولیس فورس کو لے کر سیدھا جیل گیا اور پولیس چیف سمیت تمام لوگوں کو رہا کر دیا۔ادھر جیل کا نگراں سیدھا قاضی شریک کے پاس آیا اور سارا واقعہ کہہ سنایا، قاضی شریک نے کہا: کہ میں نے اس عہدے کی نہ تو طلب کی تھی اور نہ تمنا، یہ تو مجھے خلیفہ نے مجبور کیا تھا اور میں نے اس شرط پر اس عہدے کو قبول کیا تھا کہ میرے ہر فیصلے کو نافذ کیا جائے گا، قاضی نے اپنے کاغذات، کتب اور اپنا ذاتی سامان اکٹھا کیا، اپنی سواری پر بیٹھے اور بغداد کا رخ کیا۔

گورنر کو جب قاضی کے شہر کو چھوڑنے کی اطلاع ملی تو بڑا پریشان ہوا، اسے خوب معلوم تھا کہ اگر خلیفہ کو سارے حالات کا پتہ چل گیا تو میری گورنری ختم ہو جائے گی، چنانچہ اس نے قاضی شریک کو کوفہ کے باہر روک لیا اور ان کی بات ماننے کے لئے تیار ہو گیا، قاضی نے کہا: میں اس شرط پر تمہاری بات ماننے کے لئے تیار ہوں کہ جن لوگوں کو تم نے رہا کیا ہے ان کو دوبارہ جیل واپس بھیجنا ہوگا اور تمہیں اس عورت کے ساتھ عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہونا ہوگا۔

قاضی نے بیان سننے کے بعد فیصلہ سنایا، جو دیوار گرائی گئی ہے اسی طرح دوبارہ بنوائی جائے، عورت کی زمین واپس کی جائے اور اسے زمین فروخت کرنے پر مجبور نہ کیا جائے، گورنر کے فیصلہ تسلیم کرنے پر تمام قیدیوں کو رہا کرنے کا قاضی نے حکم دیا، دوسرے دن قاضی شریک گورنر کے دربار میں تشریف لے گئے، گورنر نے خیر مقدم کیا، اپنے ساتھ بٹھایا اور آنے کا مقصد دریافت کیا، قاضی شریک کہنے لگے: ”أیھا الأمیر ! ھل تأمرنی الآن بشیء“ ؟میں آپ کے پاس اس لئے آیا ہوں کہ اگر میرے لائق کوئی کام یا خدمت ہو تو اس کو حکم دیجئے ، میں اسے بجالاؤں؟ گورنر نے کہا: کل تو تم نے میری سبکی کی اور آج یہ کہہ رہے تھے، قاضی شریک نے کہا: ’’فذاك حق الشرع وھذا حق الأدب ‘‘جو میں نے کل کیا وہ شرعی حق تھا، نافذ کرنا میری ذمہ داری تھی، جہاں تک ادب کا تعلق ہے، آپ حاکم

شہر ہیں، آپ کا احترام اور عزت کرنا بہت ضروری ہے، لہٰذا یہ ادب کا حق ہے۔(۱)

مذہبی رنگ اور دینی مزاج

قابل ذکر بات یہ ہے کہ قاضی شریک نے اس آزمائش سے محفوظ رہنے کی حتی الامکان پوری جدوجہد کی، جب بھی حاکم وقت نے ان کو بلا کر اس عہدہ کی پیشکش کی تو انہوں نے برملا اس سے اپنے آپ کو نااہل بتا کر معذوری ظاہر کر دی، چنانچہ منصور عباسی نے ان سے کہا:"قد وليتك قضاء الكوفة " یعنی میں نے آپ کو کوفہ کا قاضی مقرر کیا ہے تو فوراً عاجزی سے فرمایا: "ياأمير المؤمنين إني إنما أنظر في الصلاة والصوم فأما القضاء فلا أحسنه " (اے امیر المومنین! میں تو صرف نماز روزہ ہی کے امور سے واقفیت رکھتا ہوں قضاء کی ذمہ داریوں سے باحسن عہدہ برآنہ ہوسکوں گا)۔

اسی طرح جب مہدی نے انہیں یہ منصب تفویض کرنے کے لئے بلایا تو فرمایا: ''لا أصلح لذلك ''یعنی میں اس کی صلاحیت نہیں رکھتا، لیکن بالآخر حکمرانوں نے جبر وزبردستی کی حد تک اصرار کیا تو وہ بادل ناخواستہ اس کو قبول کرنے پر تیار ہو گئے۔(۲)

پورے زمانۂ قضا میں ان کا یہ مستقل معمول رہا کہ مجلس عدل منعقد کرنے سے قبل دوپہر کا کھانا تناول فرماتے، پھر اپنے موزے میں سے ایک کاغذ نکال کر اسے بغور دیکھتے، اس کے بعد مقدمات کی پیشی کا حکم دیتے، ان کے بعض احباب کو تجسس پیدا ہوا کہ آخر اس کاغذ میں کیا لکھا ہے جسے روزانہ پابندی سے دیکھنے کا معمول ہے، چنانچہ انہوں نے دیکھا تو اس میں تحریر تھا:

"ياشريك بن عبدالله أذكر الصراط وحدّته يا شريك بن عبد الله أذكر الموقف بين يدى الله عزوجل "(۳)

''اے شریک بن عبد اللہ! پل صراط اور اس کی باریکی کو یاد رکھو، اے

---

(۱) أخبار القضاة:شريك بن عبد الله النخعي :۱۷۱/۳، المكتبة التجارية بمصر

(۲) اخبار القضاة :۱۴۳/۳

(۳) البداية والنهاية :۱۸۳/۱۰،دار احياء التراث العربى

شریک بن عبد اللہ ! اس دن کو یاد رکھو جب تم خداوند قدوس کے روبرو کھڑے ہوگے“

یہ دراصل اللہ عزوجل کے سامنے ایک حلف نامہ تھا؛ تاکہ عدالت کی کاروائی کے ہر ہر موڑ پر اس ذات کبریا کے حاضر وناظر ہونے کا یقین دل کی گہرائیوں میں جاگزیں رہے اور کہیں لغزش وزیادتی نہ ہونے پائے۔

نہایت ہی عبادت گذار تھے، محمد بن عیسی عینی شاہد ہیں کہ میں نے قاضی شریک کی پیشانی پر سجدہ کے واضح نشانات دیکھے۔

(۵) حفص بن غیاث

حفص نام اور کنیت ابوعمر تھی، یمن کے مشہور قبیلہ مذحج کی نخع نامی ایک شاخ کوفہ میں آباد ہوگئی تھی، اسی خاندان کی بنا پر نخعی کہلائے، ان کی ولادت ۱۱۷ھ میں ہشام عبد الملک کے ایام خلافت میں ہوئی ”ولد حفص بن غياث سنة سبع عشرة ومائة في خلافة هشام بن عبد الملك“ (۱) خود ان کی ہی زبانی منقول ہے ”ولدت سنة سبع عشرة ومائة“ کوفہ کی اس مردم خیز سرزمین سے ان کا تعلق ہے جس کی خاک سے علماء وفضلاء کی کئی نسلیں اٹھی تھیں۔

فضل وکمال

علمی حیثیت سے نہایت بلند مقام رکھتے تھے، انہوں نے مشاہیر تابعین سے کسب فیض کیا، حدیث وفقہ میں پوری مہارت کے ساتھ استغناء وبے نیازی حفظ واتقان، سیر چشمی وفراخ دستی کا پیکر مجسم تھے، یحی بن سعید القطان کا قول ہے: ”أوثق أصحاب الأعمش حفص بن غياث“ (۲) امام اعمش کے تلامذہ میں حفص بن غیاث سب سے زیادہ ثقہ تھے۔

---

(۱) طبقات ابن سعد: الطبقة السابعة: ۳۸۹/۶، دار صادر، بیروت

(۲) تاریخ بغداد: حفص بن غیاث: ۶۸/۹، دار الغرب الإسلامی، بیروت

خطیب بغدادی رقم طراز ہیں:

”کان حفص كثير الحديث حافظا له ثبتا فيه و كان أيضا مقدما عند المشائخ اللذين سمع منهم الحديث“ (۱)

”حفص بن غیاث کثیر الحدیث، حافظ اور ثقہ تھے، یہاں تک کہ وہ اپنے شیوخ سے بھی بلند مرتبہ تھے“۔

منصب قضاء

ان کی کتابِ زندگی کا سب سے زرّیں، تابناک اور روشن صفحہ قضاء وافتاء کے سلسلے میں ان کی خدمات ہیں، کوفہ، بغداد میں وہ سالہا سال تک اس منصب کی زینت بنے رہے۔

بغداد کے مشرقی ومغربی حصوں میں ہمیشہ علاحدہ علاحدہ دو قاضیوں کا تقرر ہوا کرتا تھا، سب سے پہلے ۱۷۷ھ میں خلیفہ ہارون الرشید نے انہیں شرق بغداد کے منصب قضاء پر فائز کیا تھا، اس وقت قاضی حفص کی عمر ۶۰ سال تھی، دو سال تک وہ نہایت شان وشوکت کے ساتھ بغداد کے قاضی رہے، خلیفہ ان کی بڑی تعظیم وتکریم کیا کرتا تھا، اور ان کے عدالتی فیصلوں کو بہت قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔

ان کے منصبِ قضاء پر فائز ہونے کا واقعہ یہ ہے کہ: ابن ادریس، حفص بن غیاث اور وکیع بن جراح کو منصب قضاء پر فائز کرنے کے لئے ہارون الرشید کے ہاں لایا گیا، ابن ادریس تو لنگڑاتے ہوئے آئے، پھر کہا: السلام علیکم، اور وہاں آکر بادشاہ کے سامنے گر گئے، ہارون رشید نے کہا: ان میں کوئی فضل وکمال معلوم نہیں ہوتا، وکیع بن جراح نے کہا: مجھے منصب قضاء پر فائز کیجئے، پھر کہا پھر اپنی شہادت کی انگلی کو آنکھ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا: امیر المؤمنین! میں نے اس سے ایک سال سے کچھ نہیں دیکھا ہے، انہوں نے اس سے اپنی شہادت کی انگلی مراد لی تھی، ہارون نے سمجھا اس سے آنکھ کی خرابی مراد لیا، اور یہ معذرت کر کے وہاں سے نکل گئے، صرف حفص بن غیاث رہ گئے، انہوں نے کہا:

---

(۱) تاریخ بغداد: حفص بن غیاث: ۶۸/۹، دار الغرب الإسلامی، بیروت

میرے اوپر قرض بھی ہے اور میرے اہل وعیال بھی ہیں، اگر آپ مجھے اس سے بے نیاز کر دیں تو منصب قضاء کو سنبھال سکتا ہوں، چنانچہ ان کو قضاء کی ذمہ داری سونپی گئی:

"علیّ دین ولی عیال، فإن کفیتنی وأعفیتنی وإلا ولیت، قال: بلی، فولاه القضاء"(۱)

حفص اپنے اس عہدۂ قضا سے تین سو درہم پاتے ہیں، اپنے ان دونوں ساتھیوں پر سو سو دراہم خرچ کرتے تھے "فکان یأخذ مائة ویدفع إلی کل واحد من ذینك مائة"(۲)

بے لاگ عدالتی فیصلے

☆ قاضی حفص نے ایک قرضدار مجوسی سردار کے مقدمہ میں دلائل وشواہد کی بنیاد پر اس کے خلاف فیصلہ دیا، ۲۹ ہزار کے اس قرض کا کچھ تعلق امام جعفر سے بھی تھا، اس نے خلیفہ پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ وہ قاضی حفص کو معزول کر دیں؛ لیکن ہارون الرشید اس کے لئے کسی طرح تیار نہ ہوا؛ بلکہ اس بے لاگ فیصلہ سے اس قدر مسرور ہوا کہ اس نے حفص بن غیاث کو تیس ہزار درہم دیئے جانے کا حکم دیا؛ لیکن پھر جب ان کی معزولی کے لئے امام جعفر کا دباؤ حد سے زیادہ بڑھا تو ہارون نے ان کو کوفہ کا قاضی مقرر کر دیا، جہاں انہوں نے پوری شان سے ۱۳ سال تک اس منصب کی عزت بڑھائے رکھی۔(۳)

قاضی حفص نے کوفہ وبغداد کو ملا کر تقریباً ۱۵ سال تک اس فرض کو انجام دیا، اس طویل مدت میں انہوں نے کبھی بھی اس اعلیٰ عہدہ کی شان سے فروتر کوئی بات نہیں کی، جرأت، بے باکی، حق گوئی سے وہ زیریں دوراں مقدمات کو فیصل فرماتے، اس میں کسی صاحب جاہ ومنصب کی کوئی پرواہ نہ کرتے اور نہ ارباب ثروت ودولت کو خاطر میں لاتے؛

---

(۱) أخبار القضاة: حفص بن غیاث النخعی: ۱۸۴/۳

(۲) أخبار القضاة: حفص بن غیاث النخعی: ۱۸۴/۳

(۳) سیر الصحابہ: ۱۲۴/۹، کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند

بلکہ کتاب وسنت اور دلائل ونظائر کی روشنی میں جو بات قرین حق وانصاف ہوتی اسے بے باکانہ انداز میں ظاہر فرماتے۔

☆ ایک دفعہ حفص بن غیاث مسند قضاء پر بیٹھے اپنے کام میں منہمک تھے کہ خلیفہ کا قاصد ان کی طلبی کا پروانہ لے کر حاضر ہوا، قاضی حفص نے اس سے کہا: مقدمات سے فارغ ہوکر آؤں گا، کیوں کہ میں عوام کا خادم ہوں، چنانچہ وہ اس وقت تک اپنے مقام سے نہ ہٹے جب تک تمام مقدمات فیصل نہ ہوجاتے۔

مذہبی رنگ اور دینی مزاج

ان کے خوف وخشیت کا یہ عالم تھا کہ وہ منصب قضاء کی ذمہ داریوں اور اس کی نزاکت اور عنداللہ اس کے مسئول ہونے کا خوف ان کو اس قدر دامن گیر تھا کہ وہ اکثر بلک بلک کر رویا کرتے تھے کہ ایسا گراں بار فریضہ میرے ناتواں کاندھوں پر لاد دیا گیا ہے، نہ معلوم اس سے کماحقہ عہدہ برآ ہوں گا یا نہیں ان ہی کا قول ہے: "لأن یدخل الرجل إصبعه فی عینه فیقتلعها فیر ی بها خیر له من أن یکون قاضیا" آدمی اپنی انگلی آنکھوں میں ڈال کر اسے نکال پھینکے یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ قضاء کا کام کرے"(۱)

لیکن یہ حقیقت مسلم ہے کہ انہوں نے اس منصب قضاء کی ذمہ داریوں کو نہایت احسن اور بہتر طور پر انجام دیا، یہی وجہ ہے ان کی حیثیت کو محققین نے نہایت اجاگر کیا ہے، امام وکیع سے جب بھی کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا تو فرماتے: "اذهبوا إلی قاضیا فاسئلوه" اسے قاضی سے دریافت کرلو، ولید بن ابی بدر کہتے ہیں کہ: جب قاضی حفص منصب قضاء سے سبکدوش ہوئے تو امام وکیع نے فرمایا: "ذهبت القضاء بعد حفص" (۲) سجادہ کا بیان ہے کہ حفص پر قضائت کا خاتمہ ہوگیا" کان یقال ختم القضاء حفص بن غیاث"(۳)

---

(۱) أخبار القضاة: حفص بن غیاث النخغی :۱۸۶/۳

(۲) أخبار القضاة: حفص بن غیاث النخغی :۱۸۴/۳

(۳) العبر فی خبر من غبر: ۲۴۴/۱، دار الکتب العلمیة، بیروت

کسبِ حلال میں فرط احتیاط کا یہ عالم تھا کہ اپنے عہدۂ قضا کے دوران ایک مرتبہ پندرہ روز تک علالت کی بنا پر فرائض منصبی انجام نہ دے سکے، چنانچہ صحت یاب ہونے کے بعد سودرہم یہ کہہ کر عالم کو واپس بھیجا کہ "هذه رزق خمسة عشرة يوما لم أحكم فيها بين المسلمين ،لا حظ لی فيها" (۱) یہ پندرہ دن کا روزینہ ہے جس میں میں نے مسلمانوں کا کوئی فیصلہ نہیں کیا، اس لئے اس رقم کو لینے کا مجھے کوئی حق نہیں۔

قاضی حفص بغداد و کوفہ کے (چیف جسٹس) تھے جو حکومت کا بلند ترین عہدہ ہوتا ہے، دنیا اور اس کے الوان وتنعّمات ان کے قدموں میں پڑے ہوئے تھے، لیکن ان کی بے نیازی اور استغناء کا عالم یہ تھا کہ وہ اپنے جملہ مصارف کے لئے سو درہم رکھ کر ما بقیہ مستحقین میں تقسیم کر دیا کرتے تھے۔

اسی کے ساتھ وہ بہت سیر چشم اور سخی واقع ہوئے تھے، ان کا دسترخوان اس قدر وسیع تھا کہ جس میں ان کے تلامذہ کے علاوہ بہت سے مقامی و بیرونی لوگ بھی شریک رہتے تھے، مزید برآں گاہ بگاہ پوری بستی کی دعوت بھی کر دیا کرتے تھے، امام وکیع کا قول ہے کہ ''وكان سخيا ، عفيفا ، مسلما''(۲)

ابوجعفر المسند ی کہتے ہیں کہ: "كان حفص بن غياث من اسخى العرب وكان يقول من لم يأكل من طعامی لا احدثه ، وإذا كان يوم ضيافته لا يبقى رأس من الرواسيين" حفص بن غیاث عرب کے سب سے زیادہ سخی آدمی تھے، وہ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص میرا کھانا نہیں کھائے گا اس سے میں حدیث بیان نہیں کروں گا، جب ان کے یہاں دعوت کا دن ہوتا تو کوئی شخص اس میں شرکت سے باقی نہیں رہتا تھا۔(۳)

اس کا نتیجہ تھا کہ پوری عمر عسرت اور تنگ دستی میں گذاری، رحلت کے وقت ان

---

(۱) تاریخ بغداد : حفص بن غياث :۸/۹، دارالغرب الإسلامی، بیروت

(۲) تاریخ بغداد : حفص بن غياث :۸/۹، دارالغرب الإسلامی، بیروت

(۳) تذكرة الحفاظ :الطبقة السادسة من الكتاب:۲۱۸/۱، دار الكتب العلمية ، بيروت

کے پاس ایک درہم نہ تھا؛ بلکہ نوسو درہم کے مقروض نکلے جوان کے پسماندگان نے ادا کیا۔(۱)

وفات

تاحیات ان کی یہ تمنا رہی کہ وفات کے وقت قضاۃ کی زنجیروں سے آزاد ہوجاؤں، خداوندقدوس نے ان کی یہ آرزو پوری فرمائی اور وفات سے دوسال قبل عہدۂ قضا سے ان کی علاحدگی کے سامان فراہم کردیئے۔

ملازمت سے سبکدوشی کے بعد فالج کے شکار ہوگئے، اور بالآخر امین کے عہدِ خلافت میں ۱۰ ذی الحجہ کو ان کی شمع حیات گل ہوئی (۲) امیر کوفہ فضل بن عباس نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔(۳)

(۶) یحیی بن یعمرؒ

ان کا نام یحیی، ابوسلیمان کنیت تھی، ان کا قبیلۂ لیث سے تعلق تھا۔

فضل وکمال

قرآن، وحدیث، فقہ، زبان ادب جملہ علوم وفنون کے جامع تھے۔

قرآن کے ممتاز عالم ہونے کے علاوہ حافظ حدیث بھی تھے، انہوں نے اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایتیں نقل کی ہیں، فقہ پر بھی ان کو کافی عبور اور درک حاصل تھا، جس کی بنا پر ان کو مرو کا عہدۂ قضا ان کے سپرد کیا گیا۔

زبان وادب پر بھی ان کو کافی عبور حاصل تھا، نحو ادب عربی زبان کے یگانہ فاضل تھے، اس کے علاوہ نہایت فصیح وبلیغ تھے۔

ان کا سب سے اہم کارنامہ جو ابدالآباد قائم رہے گا، قرآن کو منقوط کرنا ھے، ابتداء میں قرآن پاک نقطوں سے خالی تھا، سب سے اول یحیی نے پڑھنے والوں کی آسانی کے لئے نقطے لگائے۔(۴)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ :الطبقة السادسة من الكتاب:۲۱۸/۱،دار الكتب العلمية ، بيروت

(۲) طبقات ابن سعد: الطبقة الرابعة :۳۴۶/۶ (۴) طبقات ابن سعد:۳۶۸/۷،دار صادر، بیروت

(۳) تاریخ بغداد : حفص بن غیاث :۸/۹،دارالغرب الإسلامی ، بیروت

بحیثیت قاضی ان ایک کا انوکھا انداز

یحیی خراسان کے پایہ تخت مرو کے قاضی تھے، مرو میں با قاعدہ دارالقضاء تھا، لیکن حاجت مندوں کی آسانی کے لئے وہ چلتے پھرتے، راستے گلی میں تنازعوں کا فیصلہ کر دیتے تھے، یحیی بن موسی کا بیان ہے کہ: میں نے یحیی بن یعمر کو بازاروں اور گلیوں میں فیصلہ کرتے ہوئے دیکھا، بسااوقات وہ سواری پر چلتے ہوتے، اس حالت میں دو فریق آجاتے تو سواری روک کر کھڑے کھڑے فیصلہ دے دیتے:

"رأيت يحيى بن يعمر على القضاء بمرو فربما رأيته يقضى في السوق وفي الطريق، وربما جائه الخصمان وهو على حمار فيقف على الحمار حتى يقضي بينهما"(۱)

(۷) اسد بن فرات

اسد نام، کنیت ابوعبداللہ، والد کا اسم گرامی فرات اور جد امجد کا نام سنان تھا۔ ان کا خاندان بنی سلیم بن قیس کے آزاد کردہ غلاموں میں سے تھا، قاضی اسد کا آبائی وطن نیشاپور (خراسان) تھا، وہ ابھی بطن مادر ہی میں تھے کہ ان کے والد ہجرت کر کے حران (دیار ابی بکر) چلے آئے ۱۴۲ھ میں ان کی ولادت ہوئی۔

انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم امام مالک سے حاصل کی، پھر انہوں نے امام محمد کے زیر تربیت حنفی فقہ حاصل کیا، چنانچہ اگر چہ وہ مسلکا مالکی تھے، لیکن منصب قضاء پر فائز ہونے کے بعد انہوں نے تمام نزاعات اور معاملات کو فقہ حنفی کی رو سے فیصل کیا۔

منصب قضاء پر تقرر

ان کے کمال تفقہ کے باعث عہدہ قضاء پر فائز رہے، جس زمانہ میں وہ آفریقہ آئے، عبداللہ بن غانم اس زمانہ میں قیروان کے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) تھے، وہ اسد کے قدرداں اور ان کے علم وفضل کے معترف تھے، جب تک زندہ رہے، مسائل

(۱) طبقات ابن سعد: تسمية من كان بخراسان :۳۶۸/۷

ومعاملات میں انہیں سے رجوع کرتے رہے۔

ان کی وفات کے بعد ۱۹۱ھ میں ایک دوسرے اہل علم ابومحرز اس عہدہ پر سرفراز کیئے گئے، پھر افریقہ کے شیوخ وعلماء نے اسد ممتاز عہدہ پر مامور کرانا چاہا، چنانچہ علی بن حمید نے والی افریقہ زیادۃ اللہ کے سامنے اسد کی علمی مرتبت، فضل وکمال اور شہرت کا تذکرہ کر کے اس خواہش کا اظہار بھی کیا، لیکن ابومحرز کو دولتِ اغلبیہ کے بانی ابراہیم بن اغلب نے اس عہدہ پر نامزد کیا، اس لئے زیادۃ اللہ نے انہیں معزول کرنا مناسب نہ سمجھا اور اس کی یہ دوسری شکل اختیار کی کہ اسد کو ۲۰۳-۲۰۴ھ میں اس عہدہ میں مساوی حیثیت سے ابومحرز کا شریک بنادیا، یہ اسلامی حکومت میں پہلی مثال تھی کہ ایک ہی عہدہ پر ایک ہی حیثیت اور اختیار کے ساتھ دو اشخاص مامور کیئے جائیں۔

اسد کا یہ تقرر ابومحرز کو ناگوار گذرا، علاوہ ازیں ان دونوں میں کسی قدر علمی چشمک موجود تھی، اب یہ معاصرانہ چشمک پہلے سے زیادہ تیز ہوگئی اور باہمی مسابقت کے جذبات پیدا ہوگئے اور کبھی کبھی مناظرہ ومجادلہ کی نوبت تک آجاتی، صاحب معالم نے ان دونوں کی علمی نوک جھونک کے واقعات کا ذکر کر کے ان کے علم وفضل کا موازنہ کیا ہے اور فرماتے ہیں کہ:

> ''اسد ابومحرز سے علم وفضل میں زیادہ تھے اور انہیں فقہ پر بھی زیادہ عبور حاصل تھا اور ابومحرز اگرچہ اسد سے علم وفقہ میں کم پایہ تھے، مگر بعض اوقات (مسائل کے جواب میں) حق ان کے ساتھ رہتا تھا''

اس کے بعد ۲۰۹ھ میں منصور طبندی نے زیادۃ اللہ کے خلاف خروج کیا اور دار السلطنت قیروان پر قابض ہوگیا، منصور کے مستولی ہونے کے بعد قاضی ابومحرز اور قاضی اسد دونوں اس کے پاس پہنچے، اس کی مجلس میں سلطنت کے اعیان اور فوج کے ممتاز قائدین موجود تھے، منصور نے ان دونوں کے عہدۂ قضا کی مناسبت سے ان کے سامنے زیادۃ اللہ کے مظالم بیان کیئے اور دونوں کی رائے طلب کی، ابومحرز نے موقع ومحل سے خائف ہوکر اس کے بیان کی تائید کردی؛ لیکن قاضی اسد نے صاف گوئی سے کام لیا اور نہ

صرف یہ کہ منصور کی تردید کردی؛ بلکہ اسے ظالم ٹھہرایا، یہ سن کر ایک فوجی افسر تلوار سونت کر اسد کے سر پر کھڑا ہوگیا، مگر معاملہ رفع دفع ہوگیا، اس کے بعد دونوں لوٹ آئے اور خائف رہے کہ پھر کوئی ناگوار صورت نہ پیش آئے۔

زیادۃ اللہ نے ۲۱۱ھ میں منصور پر غلبہ حاصل کرلیا اور قیروان پر قابض ہوگیا، منصور کے روبرو اسد اور محرز کی جو گفتگو ہوئی تھی وہ امیر زیادۃ اللہ کے کانوں تک پہنچ چکی تھی، اسی بناء پر زیادۃ اللہ نے دوبارہ اقتدار حاصل کرنے کے بعد ابومحرز کو عہدۂ قضا سے معزول کردیا اور قاضی اسد اپنے عہدہ پر فائز رہے، اور اب وہ افریقہ کے تنہا قاضی القضاۃ تھے۔

پھر اس کے بعد ان کی اس صاف گوئی سے متاثر ہوکر زیادۃ اللہ نے ان کو فوج کا سپہ سالار بھی بنایا اور یہ ان دونوں عہدوں کو بحسن وخوبی انجام دیتے رہے، اور ان ہی کی قیادت میں صقلیہ فتح ہوا دوران جنگ ہی یہ زخم ہوگئے، زخم اتنا کاری تھا کہ جانبر نہ ہوسکے، اور انہیں زخموں کی تاب نہ لاکر بماہ ربیع الآخر ۲۱۳ھ کو علم وفضل اور شجاعت وشہامت کا یہ آفتاب غروب ہوگیا۔

(۸) محمد بن عبدالرحمٰن بن أبی لیلی الانصاری

ان کا نام محمد، کنیت ابوعبدالرحمٰن تھی، اپنے دادا کی طرف منسوب ہوکر عام شہرت ابن ابی لیلی سے پائی۔ ان کے جد امجد یسار رضی اللہ عنہ عظیم اور جلیل القدر صحابی ہیں، جنگ احد وغیرہ متعدد غزوات میں وہ رسول اللہ ﷺ کے ہمرکاب رہے، ان کے والد عبدالرحمن بن أبی لیلی بھی کبار تابعین میں شمار کئے جاتے ہیں۔

علمی فضل وکمال

ان کو حدیث میں سے بلند رتبہ حاصل نہ تھا، البتہ فقہ پر ان کو کامل دسترس حاصل تھا، علمی اعتبار سے یہ بلند رتبہ اتباع تابعین میں شمار ہوتے ہیں، فقہ میں ان کو شعبی سے خصوصی تلمذ حاصل تھا، ان کی محدثانہ حیثیت پر نقد وجرح کے باوجود تمام ائمہ ومحققین نے ان کی فقیہانہ تیز نگاہی کا بالاتفاق اعتراف کیا ہے

امام احمد فرماتے ہیں: ”کان فقه ابن ابی لیلي أحب إلینا من حدیثه “(۱) محمد بن عبدالرحمٰن کی فقہ ہمارے نزدیک ان کی حدیث سے پسندیدہ تر ہے۔

منصب قضاء

فقہ وفتاوی میں غیر معمولی مہارت اور کمال کی بناء پر وہ طویل ترین مدت تک منصب قضاء پر فائز رہے، ان کے فیصلوں اور فتووں کو بڑی قدر ومنزلت سے دیکھا جاتا تھا، چنانچہ ساجی کا بیان ہے کہ ”کان یمدح فی قضاء ہ“

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ:

”ما ولی قضاء احد أفقه فی دین الله ولا أقرء لکتاب الله ولا أقول حقا بالله ولا أعف من الأموال من ابن أبی لیلي “(۲) ابن ابی لیلی سے زیادہ دین کی سمجھ رکھنے والا، کتاب اللہ کو پڑھنے والا، حق گو اور مالی امور میں پاک دامن کوئی شخص مسند قضاء کی زینت نہیں دیکھا۔

سلیمان بن مسافر کہتے ہیں کہ: میں نے منصور سے ایک بار پوچھا کہ کوفہ میں اس وقت سب سے بڑا فقیہ کون ہے؟ اس نے فوراً جواب دیا: قاضی کوفہ محمد بن عبدالرحمٰن بن أبی لیلی۔(۲)

ان کے زمانہ میں اس منصب پر طویل عرصہ تک فائز رہنے کی بنا پر مفتی کوفہ اور قاضی کوفہ ان کے نام کے جزو بن گئے تھے، سب سے پہلے یوسف بن عمر وثقفی نے انہیں قضاء کا منصب سپرد کیا تھا، پھر تقریباً ۳۳ سال تک وہ عہد بنی امیہ اور عہد بنی عباس دونوں میں اس فریضہ کو بحسن وخوبی انجام دیتے رہے۔

رمضان المبارک ۱۴۸ھ میں علم کی یہ شمع فروزاں گل ہوگئی، وفات کے وقت بھی قاضی کوفہ تھے۔

---

(۱) تهذیب التهذیب: ۳۰۲:۳۰، مطبعة دائرة المعارف النظامية، الهند

(۲) تاریخ بغداد: ۳۵۹/۳، دار الغرب الإسلامی، بیروت

(۳) میزان الاعتدال

(۹) اسماعیل بن علیہ

ان کا نام اسماعیل، ابوالبشر کنیت تھی، والد کا نام ابراہیم بن مقسم اور والدہ کا نام علیہ تھا، علیہ قبیلہ بنوشیبان کی لونڈی تھیں؛ لیکن بڑی صاحب علم تھیں، انہی کی نسبت سے اسماعیل ابن علیہ کہلائے۔

ان کے والد ابراہیم بھی غلام تھے اور کپڑے کی تجارت کرتے تھے، اس سلسلہ میں وہ برابر بصرہ آیا جایا کرتے تھے، وہاں آمد ورفت کے دوران انہوں نے علیہ بنت حسان سے شادی کر لی اور بصرہ ہی میں مستقل طور پر رہائش اختیار کر لی، اور یہیں ۱۱۰ھ میں اسماعیل بن علیہ پیدا ہوئے، ان کی والدہ فضل وکمال کے باوجود چونکہ باندی تھیں اس لئے ان کی طرف وہ اپنی نسبت پسند نہیں کرتے تھے۔

غالباً اس لئے انہوں نے اپنی کنیت ابوالبشر رکھ لی تھی، مگر ابن علیہ کے مقابلہ میں یہ کنیت مشہور نہ ہوسکی۔ ابتدائی تعلیم اپنی والدہ ہی سے حاصل کی اور پھر اس کے بعد ان کی والدہ ان کو ایک مشہور محدث عبدالوارث کے پاس لئے گئی کہ اس کو تمہاری طرح محدث بنانا ہے، عبدالوارث نے ان کو تمام محدثین اور ان کی مجالس کا حاضر باش بنایا۔

فضل وکمال

اسماعیل بن علیہ کو یوں تو ہر فن میں خوب مہارت تھی؛ لیکن علم حدیث میں ان کو خصوصی درک اور کمال حاصل تھا، امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ: بصرہ میں اتقان اور وتثبت ابن علیہ پر ختم ہوجاتا ہے "إليه ينتهى فى التثبت بالبصرة "(۱) ان کی جلالت علمی کی وجہ کبار محدثین بھی روایت حدیث میں ان کی مخالفت کرنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔

حدیث کے علاوہ ان کو فقہ پر عبور اور درک حاصل تھا، امام شعبہ انہیں "ریحانة الفقهاء" کہا کرتے تھے۔(۲)

---

(۱) شذرات الذهب :سنة ثلاث وتسعين ومائة :۴۲۸/۲، دار ابن کثیر، دمشق

(۲) تهذيب الأسماء للنووى: باب إسماعيل :۱۲۰/۱، دار الكتب العلمية ، بيروت

عہدۂ قضاء اور اس سے معزولی کے اسباب

فقہی مہارت اور تبحر علمی کی وجہ سے متعدد عہدوں پر بھی فائز ہوئے، چنانچہ ان کو سب سے پہلے بصرہ کی صدقات کا انتظام سپرد کیا گیا، پھر بغداد کے محکمہ فوجداری کے ذمہ دار بنائے گئے اور آخر میں بغداد کے منصب قضاء پر فائز ہوئے، لیکن عرصہ تک اس منصب پر قائم نہیں رہ سکے، عبداللہ بن مبارکؒ کی ناخوشی کا علم ہوتے ہی اس عہدہ سے مستعفی ہوگئے۔

واقعہ کی تفصیل یہ بیان کی جاتی ہے کہ عبداللہ بن مبارکؒ تجارت کرتے تھے اور اس میں انہیں کافی نفع بھی تھا، لیکن یہ پیشہ جلب زر و منفعت کے لئے نہیں تھا؛ بلکہ علماء اور طلبہ کی خدمت اور ان کی دنیوی ضروریات پوری کرنے کے لئے تھا، چنانچہ ابن مبارکؒ خود ہی فرماتے ہیں: اگر سفیان بن عیینہ، سفیان ثوری، فضیل ابن السماک اور ابن علیہ، یہ پانچ حضرات نہ ہوتے تو میں تجارت نہ کرتا۔

ابن علیہ کے قاضی ہونے کے بعد جب ابن مبارک بغداد آئے اور انہیں اس کا علم ہوا تو نہایت آزردہ خاطر ہوئے اور جو تحفے وہ ابن علیہ کے پاس معمولاً بھیجا کرتے تھے انہیں موقوف کر دیا اور جب ابن علیہ ابن مبارکؒ کی خدمت میں ملاقات کے لئے حاضر ہوئے تو آپ نے کوئی التفات نہیں کیا، ابن علیہ تھوڑی دیر بیٹھ کر گھر واپس چلے گئے اور دوسرے دن اس مضمون کا ایک خط لکھا:

> ”میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کے لطف و کرم کا منتظر تھا؛ لیکن آپ نے مجھ سے کلام ہی نہیں کیا، معلوم نہیں جناب کو میری کون سی حرکت ایسی ناگوار ہوئی؟“

یہ خط پڑھ کر حضرت ابن مبارکؒ نے فرمایا کہ: یہ شخص بغیر سختی کے نہیں مان سکتا اور پھر جواب میں یہ تیز و تند اشعار لکھ کر بھیجے۔

یا جاعل الدین له بازیا
یصطاد أموال المساکین

''اے دین کے ذریعہ غیروں کے اموال کا شکار کرنے والے''

احتلت للدنیا ولذّاتها
بحیلة تذهب بالدین

''تو نے دنیا اور اس کی لذتوں کو حاصل کرنے کے لئے ایک ایسا حیلہ اختیار کرلیا ہے جو دین کو تباہ کر کے رہے گا''

صرت مجنونا بها بعد ما
کنت دواء للمجانین

''پہلے تم دنیا کے مجنون کا علاج کرتے تھے، اب خود تم اس کے مجنون ہو گئے ہو''

أین روایاتك فی سودها
لترك أبواب السلاطین

اب بادشاہوں کے دروازے سے بے پرواہ ہوکر تمہارا روایت حدیث کرنا کہاں گیا؟

ان قلت أکرهت فذاباطل
ذل حمار العلم فی الطین

''اگر تم یہ کہو کہ مجھے عہدۂ قضا کے قبول کرنے پر مجبور کیا گیا تو یہ عذر سراسر باطل ہے، اب تو یہ کہنا زیادہ موزوں ہے کہ حمار کیچڑ میں گر گیا''

ابن علیہ کے پاس جب عبداللہ بن مبارک کا یہ خط پہنچا تو آپ پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ آپ اسے پڑھتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے، پورا خط پڑھنے کے بعد آپ فوراً مجلس قضاء سے اٹھے اور ہارون رشید کے پاس جا کر اپنا استعفاء پیش کرتے ہوئے فرمایا: خدا کے لئے آپ میرے بڑھاپے پر رحم کیجئے؛ کیوں کہ اب میں اس عہدہ پر باقی نہیں رہ سکتا۔

خلیفہ ہارون الرشید نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مجنون (ابن مبارک) نے

آپ کو بہکا دیا ہے، ابن علیہ نے فرمایا: بہکایا نہیں؛ بلکہ انہوں نے تو مجھے فی الحقیقت ایک مصیبت سے نجات دلائی ہے، اور میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بھی اس سے رستگاری عطا فرمائے، ہارون الرشید نے آپ کا استعفاء منظور کر کے آپ کو خدمت قضاء سے سبک دوش فرمایا، حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کو اس کی اطلاع ملی تو بے انتہا خوش ہوئے اور حسب سابق ایک تھیلی رقم کی ابن علیہ کے یہاں بھیجا۔(۱)

امام نووی کی رائے ہے کہ یہ پہلے بصرہ کے صدقات وزکوۃ کے والی بنائے گئے، پھر ہارون الرشید کے آخری دور میں بغداد کے قاضی بنائے گئے۔(۲)

عبادت اور خوف خدا

ابن علیہ کو قرآن مجید کی تلاوت اور عبادت سے بے حد شغف، بلکہ عشق تھا، ابن مدینی نے ایک رات ان کے ساتھ بسر کی تو انہوں نے دیکھا کہ حضرت ابن علیہ نے اسی شب میں تہائی قرآن مجید کی تلاوت کی۔

زہد واتقاء اور احساسِ آخرت اس دور کی ایک عام خصوصیت تھی، ابن علیہ بھی ان صفات میں زمرۂ تابعین میں نمایاں تھے، حضرت ابن مبارکؒ کا ان کی طرف میلان اور پھر ان کی مدد کرنا خود اس بات کا واضح ثبوت ہے، پھر ابن مبارک کی تنبیہ پر ان کا استعفاء دینا غایتِ تقوی کی دلیل ہے، ابن علیہ بلاشبہ "فلیضحکوا قلیلا ولیبکوا کثیرا" کی مجسم تصویر تھے، ان کی خشیت الٰہی کا یہ عالم تھا کہ برسوں وہ ہنسے نہیں، ان کے تلامذہ کا بیان ہے کہ جب سے وہ بصرہ کے والی بنائے گئے، انہیں کبھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔

وفات

جمعرات کے دن ۲۴ یا ۲۴ ذی قعدہ ۱۹۳ھ کو علم وعمل کی یہ شمع فروزاں گل ہوگئی(۳)

---

(۱) تاریخ بغداد: اسماعیل بن ابراھیم: ۱۹۶/۷، دار الغرب الإسلامی، بیروت

(۲) تهذيب الأسماء للنووي: باب إسماعيل: ۱۲۰/۱، دار الکتب العلمیۃ، بیروت

(۳) شذرات الذهب: سنة ثلاث وتسعين ومائة: ۴۲۸/۲، دار ابن کثیر، دمشق

جنازہ کی نماز ان کے صاحبزادے ابراہیم نے پڑھائی اور بغداد کے مشہور قبرستان ابن مالک میں تدفین عمل میں آئی۔

(۱۰) امام ابو یوسفؒ

نام یعقوب، کنیت ابو یوسف تھی، سلسلہ نسب ان کے جد اعلی سعد بن خَنْبَتَهُ سے جاملتا ہے، یہ جلیل القدر صحابی رضی اللہ عنہ تھے، غزوۂ احد میں شرکت کی اجازت چاہی مگر کم سنی کی وجہ سے اجازت نہیں ملی، دو سال کے بعد غزوۂ خندق پیش آیا تو اس میں شرکت کا شرف حاصل کیا، اس غزوہ میں انہوں نے بڑی جانبازی دکھائی، دشمنوں سے برسر پیکار تھے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ ان پر پڑی، فرمایا: کون ہو تو بولے: مجھے سعد خنبتہ کہتے ہیں، پھر قریب بلایا اور سر پر دست شفقت رکھا، امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست شفقت پھیرنے کی برکت ہم اب تک محسوس کر رہے ہیں ”فتلك المسحة فينا إلى الساعة“ (۱)

ان کے والد ابراہیم ایک غریب آدمی تھے، اور کوفہ میں مزدوری کر کے گذر اوقات ہوتا تھا۔

امام ابو یوسفؒ کوفہ میں ۱۱۳ھ یا ۹۳ میں پیدا ہوئے۔ (۲)

تعلیم کا آغاز اور معاشی تنگی

ابتدائے عمر ہی سے ان کو لکھنے پڑھنے کا شوق تھا، مگر ان کے والد اپنی غربت کی وجہ سے چاہتے تھے کہ حصول معاش میں ان کا ہاتھ بٹائیں، اس وجہ سے ان کو بہت دنوں تک باقاعدہ تحصیل علم کا موقع نہ مل سکا، مگر ان کے ذوق علم اور طلب اور جستجو نے ان کو اکسایا کہ اسی تنگی و ترشی میں والد سے چھپ چھپا کر علمائے کوفہ کی خدمت میں حاضری دی جائے، کوفہ میں اس وقت فقہ و حدیث کی بہت سی مجلسیں چلتی تھیں، جن میں محمد بن ابی لیلی اور امام

---

(۱) مناقب الامام الاعظم للموفق: ۲/۲۱۰، طبع: دائرۃ المعارف النظامیہ بحیدر آباد ۱۳۲۱ھ

(۲) مناقب موفق

ابوحنیفہ رحمہما اللہ کی مجالس درس کو خاص خصوصیت حاصل تھی، چنانچہ امام ابو یوسف پہلے خصوصیت سے ابن ابی لیلی کی مجالس میں شریک ہوتے رہے، اور تقریبا ۸۔۹ سال تک ان سے کسبِ فیض کیا، اس کے بعد امام صاحب کی مجالس میں شرکت کرنے لگے اور ان کو یہ مجلس ایسی بھائی کہ پھر امام صاحب کی زندگی میں اس سے علاحدہ نہ ہو سکے۔(۱)

عہدہ قضا

ان کی علمی لیاقت اور صلاحیت کا شہرہ چہار دانگ عالم میں عام وتام ہے، اسلئے یہ تو محتاجِ بیان نہیں ہے، لیکن انہوں نے قضاء کے عہدہ کو بھی ایک طویل مدت زینت بخشی اور قضاء کا عہدہ جو حفظ وامانت، عدل پروری اور انصاف کا طالب ہوتا ہے اس کا تمام حق ادا کر دیا۔

ائمہ اسلاف کا عہدۂ قضاء سے انکار کے اسباب

عہد نبوی اور عہد صدیقی میں عہدۂ قضاء اسلامی حکومت کا کوئی الگ شعبہ نہیں تھا، بلکہ ہر صوبہ اور ضلع کا والی ہی قاضی ہوا کرتا تھا، حضرت عمر رضی اللہ کے دور خلافت میں جب اسلامی حکومت کے حدود وسیع ہو گئے اور انتظامی اور عدالتی ضرورتوں کی بنا پر انتظامیہ اور عدلیہ کو ایک ساتھ رکھنا مشکل ہو گیا اور پھر ولاۃ کی بدعنوانیاں سامنے آئیں تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ان دونوں شعبوں کو الگ کر دیا، پھر خلفائے بنی امیہ کو دین اور دین کے تقاضوں اور کاموں سے شغف باقی نہ رہا تو انہوں نے عہدہ قضاء کی اہمیت کم کر دی، ایسے لوگوں کا عہدہ قضا پر تقرر ہونے لگا تو جو علم وفقہ سے تو کم مناسبت رکھتے تھے، دنیا کے لالچی، حریص اور امراء اور بادشاہوں کے خوشامد واقع ہوئے تھے، چنانچہ واقعہ ہے کہ بنو امیہ کا تیسرا فرماں روا جب وہ مصر پہنچا تو وہاں کے قاضی کو بلایا، اس وقت وہاں کے قاضی عابس تھے، اس نے ان سے پوچھا کہ قرآن یاد ہے، بولے: نہیں، پھر پوچھا: فرائض یعنی تقسیم وراثت میں پختگی پیدا کر لی ہے، جواب ملا: نہیں، مروان کو اس جواب سے حیرت ہوئی اور بولا ''فبم تقضی'' پھر آپ فیصلہ کیسے کرتے ہیں۔(۲)

---

(۱) مناقب الامام الاعظم للکردری :۱۲۳/۲، طبع: دائرۃ المعارف النظامیۃ بحیدرآباد ۱۳۲۱ھ

(۲) کتاب الولاۃ : وکتاب القضاۃ للکندی :عابس بن سعد :۲۲۶/۱

صرف یہی نہیں قاضیوں کے انتخاب میں اہل و نااہل کا بہت کم خیال کیا جاتا؛ بلکہ حکمراں طبقہ قاضیوں کے فیصلوں تک میں دخل اندازی کرتا تھا، چنانچہ اموی اور عباسی دور کا مشکل سے کوئی ایسا قاضی ملے گا جس کے فیصلہ میں ارباب حکومت کی مداخلت کا کوئی نہ کوئی واقعہ پیش نہ آیا ہو، صرف اموی دور کے قاضی خیر بن نعیم اور عباسی دور کے قاضی حفص بن غیاث کے متعلق ان کے تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ ارباب حکومت نے ان کو اپنے فیصلوں کے بدلنے پر مجبور کرنا چاہا مگر حکومت سے منسلک رہتے ہوئے بھی ان کے پائے ثبات میں کوئی تزلزل نہ آیا۔ یہی وجہ تھی محتاط فقہاء و محدثین حکومت کا تعاون لینے کو برا ہی سمجھتے تھے، اگر کسی مجبوری کی بناء پر تعاون کرتے بھی تھے تو اسے اضطرار سمجھ کر انجام دیتے تھے۔

قاضی حفص فرماتے ہیں کہ: جب میری یہ حالت ہوگئی کہ مردار کھانا میرے لئے حلال ہوگیا تو اس وقت میں نے عہدۂ قضا قبول کیا، قاضی شریک کو مجبوراً عہدہ قضاء قبول کرنا پڑا، تو انہوں نے اس کو دین کے فروخت کرنے سے تعبیر کیا، ان کے الفاظ یہ ہیں:

"بعت دینی" "میں نے اپنے دین کو بیچ دیا

چونکہ وہ جانتے تھے کہ عہدۂ قضاء پر فائز ہونے کے بعد اس جرأت اور آزادی کے ساتھ دینی احکام کی روشنی میں معاملات کا فیصلہ نہیں کر سکتے جس آزادی سے وہ عہدہ افتاء پر کر سکتے تھے، لیکن ان میں جو غیر معمولی لوگ تھے انہوں نے کسی بھی حالت میں عہدۂ قضا کو قبول نہیں کیا، ان ہی لوگوں میں سفیان ثوری، امام مالک، امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ اور ان کے بعض تلامذہ امام زفر وغیرہ ہیں، امام ابوحنیفہؒ نے تو بنو امیہ اور بنی عباس دونوں کا عہد حکومت دیکھا اور ان کو ان دونوں عہدوں میں یہ لقمہ تر پیش کیا گیا؛ لیکن انہوں نے اس کو کسی بھی قیمت پر قبول نہیں کیا، امام ابو یوسف اور امام محمد نے ایک مصلحت کی بناء پر اس عہدہ قضاء کو قبول کیا۔ مگر کبھی انہوں نے حق و عدل کی روش سے سرمو انحراف نہیں کیا، اس کی وجہ سے ان کو کئی دفعہ جیل بھی جانا پڑا، ان کے عہدۂ قضا کے قبول کرنے کی مزید ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے ذریعہ سے وہ اسلامی نظام اور ان قوانین کو نافذ کرنا چاہتے

تھے جو امام صاحب، اور ان کی وفات کے بعد خود انہوں نے اور ان کے احباب نے کتاب وسنت کی روشنی میں مستنبط کئے تھے۔

امام ابو یوسفؒ کے عہدۂ قضاء کی مدت

امام ابو یوسفؒ عہدۂ قضاء پر کتنے دن مامور رہے اس میں اختلاف ہے، ایک مرتبہ خود انہوں نے اپنے شاگرد سے بیان کیا کہ: میں ۱۷ برس امام صاحب کی خدمت میں رہا اور ۱۷ برس دنیا کے کاموں میں (یعنی عہدۂ قضاء پر) سب سے پہلے مہدی کے وقت قاضی مقرر ہوئے اور ان کی وفات ۱۸۲ھ میں عہدۂ قضا کی حالت میں ہوئی تو اگر ان کے تقرر کا ۱۵۹ھ مانتے ہیں تو قضاء کی مدت ۲۲-۲۳ برس ہوتی ہے۔

زمانۂ قضاء کے چند واقعات

امام ابو یوسفؒ تین عباسی خلفاء کے دور میں قاضی رہے، مہدی، ہادی اور ہارون رشید، مہدی نے ان کو صرف بغداد کے مشرق کا قاضی بنایا تھا، مگر خلیفہ ہادی کے زمانہ میں وہ پورے بغداد کے قاضی بنا دیئے گئے۔

☆ ایک باغ کے معاملہ میں خلیفہ ہادی اور کسی عام آدمی میں اختلاف ہو گیا، ہادی نے حکم دیا کہ معاملہ قاضی کے روبرو پیش کیا جائے، امام ابو یوسفؒ کے سامنے شہادتیں گذریں جن سے باغ ہادی کا ثابت ہوتا تھا، لیکن امام نے انہی شہادتوں پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ خفیہ تحقیقات کیں، جس سے معلوم ہوا کہ باغ خلیفہ کے مخالف فریق ہی کا ہے، جس کے خلاف عدالت میں شہادتیں گذر رہی ہیں، امام صاحب نے مقدمہ کو اس وقت تو ملتوی کر دیا، ہادی سے ملاقات ہوئی تو اس نے پوچھا کہ مقدمہ میں آپ نے کیا فیصلہ کیا، امام ابو یوسفؒ نے فرمایا: کہ شہادتیں تو آپ کے موافق ہیں، مگر مدعا علیہ کی طرف سے یہ مطالبہ ہوا ہے کہ مدعی (خلیفہ) سے حلف لے لی جائے، ہادی نے پوچھا: تو آپ کی کیا رائے ہے، کیا آپ مدعی کا حلف اٹھانا صحیح سمجھتے ہیں، امام ابو یوسفؒ نے فرمایا کہ: قاضی ابن ابی لیلی کی تو یہی رائے ہے، "قد كان ابن أبي ليلى يراه" (امام ابو یوسف کا یہ مسلک

نہیں تھا) اسکے بعد ہادی نے کہا کہ: اچھا تو باغ مدعاعلیہ کے حوالہ کر دیجئے۔(۱)

اسی طرح کا ایک فیصلہ انہوں نے ہارون الرشید کے خلاف بھی دیا تھا، مگر اس میں ان سے ذرہ سی غلطی ہوگئی تھی، جن کا ان کو زندگی بھر افسوس رہا، واقعہ یہ ہے کہ سواد عراق کے ایک بوڑھے نے ہارون کے خلاف یہ دعوی دائر کیا کہ فلاں باغ میرا ہے؛ لیکن خلیفہ نے اس پر غاصبانہ قبضہ کرلیا ہے، اتفاق سے یہ مقدمہ اس روز پیش ہوا جس روز خود ہارون الرشید فیصلے کے لئے بیٹھا ہوا تھا، قاضی ابو یوسفؒ نے فریقین کے بیانات اور ان کے دعوی ہارون کے سامنے پیش کررہے تھے، جب اس مقدمہ کی باری آئی تو انہوں نے خلیفہ کے سامنے اس کو پیش کیا اور کہا کہ: آپ کے اوپر دعوی ہے کہ آپ نے فلاں آدمی کا باغ زبردستی لے لیا ہے، مدعی یہاں موجود ہے، حکم ہو تو حاضر کیا جائے، بوڑھا سامنے آیا تو قاضی ابو یوسفؒ نے پوچھا: بڑے میاں! آپ کا دعوی کیا ہے؟ اس نے کہا کہ میرے باغ پر امیر المؤمنین نے ناحق قبضہ کرلیا ہے، جس کے خلاف دادرسی چاہتا ہوں، قاضی نے سوال کیا: اس وقت وہ کس کے قبضہ اور نگرانی میں ہے، بولا: امیر المؤمنین کے ذاتی قبضہ میں ہے، اب قاضی ابو یوسفؒ نے ہارون رشید سے مخاطب ہوکر کہا کہ: دعوی کے جواب میں کچھ آپ کہنا چاہتے ہیں، ہارون نے کہا: میرے قبضہ میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس میں اس شخص کا حق ہو، نہ خود باغ ہی میں اس کا کوئی حق ہے، قاضی نے فریقین کے بیانات سننے کے بعد مدعی سے پوچھا کہ تمہارے دعوی کے ثبوت کے لئے کوئی دلیل بھی ہے، کہا: ہاں خود امیر المؤمنین سے قسم لی جائے، ہارون نے قسم کھا کر کہا کہ: یہ باغ میرے والد مہدی نے مجھے عطا کیا تھا، میں اس کا مالک ہوں، بوڑھے نے یہ سنا تو اس کو بہت غصہ آیا اور یہ بڑبڑاتا ہوا عدالت سے نکل گیا، جس طرح کوئی شخص آسانی سے ستو گھول کر پی جائے اسی طرح اس شخص نے آسانی سے قسم کھالی (استقه كأنه سويق) ایک معمولی آدمی کی زبان سے یہ الفاظ سن کر ہارون کا چہرہ غصہ سے تمتما اٹھا، یحیی برمکی نے ہارون کو خوش کرنے کے لئے امام ابو یوسف سے مخاطب ہوکر کہا کہ: آپ نے دیکھا اس

(۱) مناقب الامام الاعظم للموفق: ۳۱۷/۲، طبع: دائرۃ المعارف النظامیۃ بحیدرآباد ۱۳۲۱ھ

عدل وانصاف کی نظیر دنیا میں مل سکتی ہے، امام ابو یوسفؒ نے اس کی تحسین کی، کہا کہ: مگر انصاف کے بغیر کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔(۱)

اس واقعہ میں امام ابو یوسفؒ نے انصاف کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی، مگر پھر بھی آخر وقت تک ان کو جب اس واقعہ کا خیال آتا تو فرماتے تھے: میں اپنے اندر سخت کوفت محسوس کرتا ہوں اور ڈرتا ہوں کہ میں نے انصاف میں جو کوتاہی کی ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا کیا جواب دوں گا؟ لوگوں نے کہا کہ: آپ نے انصاف میں کیا کوتاہی کی اور آپ اس سے زیادہ کیا کر سکتے تھے کہ ایک معمولی کسان کے مقابلہ میں وقت کے سب سے بڑے بادشاہ کو قسم کھانے پر مجبور کر دیا، فرمایا: لوگوں نے نہیں سمجھا کہ مجھے کس خیال سے تکلیف ہوتی ہے، پھر افسوس کے لہجہ میں فرمایا کہ: مجھے تکلیف اور کڑھن اس کی ہے کہ میں ہارون رشید سے یہ نہ کہہ سکا کہ آپ کرسی سے اتر جائیے جہاں آپ کا فریق کھڑا ہے وہیں ایک فریق کی حیثیت سے آپ بھی کھڑے ہو جائیے، یا اجازت دیجئے کہ اس کے لئے بھی کرسی لائی جائے "فأقول يا أمير المؤمنين ! أنت على كرسي وهو على الأرض ، فيدعى له بكرسي فيجلس عليه "(۲)

امام ابو یوسفؒ نے جب خلفاء کی پرواہ نہیں کی تو وزراء وارکان حکومت کی پرواہ کیا کرتے، چنانچہ انہوں نے متعدد وزراء اور خواص حکومت کی شہادتیں رد کر دیں، ایک بار علی بن عیسی وزیر مملکت نے کسی معاملہ میں شہادت دی، تو امام صاحب نے اسے قبول نہیں کیا، یہ ایک وزیر کی توہین تھی، اس نے معاملہ ہارون رشید کے سامنے پیش کیا، ہارون نے امام صاحب سے دریافت کیا تو فرمایا کہ: میں شہادت اس لئے رد کر دی کہ میں نے اپنے کانوں سے ان کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں تو خلیفہ کا عبد اور غلام ہوں اور جب یہ غلام ہیں تو غلاموں کی شہادت معتبر نہیں، بعض روایتوں میں ہے کہ: انہوں نے کہا کہ: یہ جماعت سے نماز نہیں پڑھتے؛ اس لئے میں ان کی شہادت رد کرتا ہوں۔(۳)

---

(۱) مناقب الامام الاعظم للکردری :۱۴۶/۲، طبع: دائرۃ المعارف النظامیۃ بحیدر آباد ۱۳۲۱ھ

(۲) مناقب الامام الاعظم للموفق :۲۲۴/۲، طبع: دائرۃ المعارف النظامیۃ بحیدر آباد ۱۳۲۱ھ

(۳) مناقب الامام الاعظم للموفق :۲۲۴/۲، طبع: دائرۃ المعارف النظامیۃ بحیدر آباد ۱۳۲۱ھ

قاضی القضاۃ عہدہ کی ابتداء

امام ابو یوسفؒ خلیفہ مہدی کے عہد خلافت میں بغداد کے مشرقی حصہ کے قاضی مقرر ہوئے تھے، خلیفہ ہادی کے زمانہ میں بھی اسی عہدہ پر تھے، ہارون الرشید کے ہاتھوں میں خلافت کی باگ ڈور آئی تو سال بھر تک تو اس نے ان کو اسی حیثیت میں رکھا، مگر اس کے بعد تمام ممالک محروسہ کا قاضی القضاۃ بنادیا" کان إلیه تولیة القضاء فی الآفاق من الشرق والغرب "(۱)

خود امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں:" فولانی قضاء البلاد کلها"(۲)

ان بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رسماً اور تبرکاً قاضی نہیں تھے، بلکہ کہنا چاہئے کہ حکومت کے محکمۂ عدلیہ کے پورے انچارج یا بالفاظ دیگر وزیر عدل وقانون تھے، امام ابو یوسفؒ نے اس عہدہ کو جس کی کوئی قیمت نہ تھی اس قدر باوقار عہدہ بنادیا تھا، اس کی تائید ابوالولید الطیالسی کی روایت سے ہوتی ہے :" هذا هو الوزیر وقاضی القضاۃ " یہی وہ شخص ہے جو وزیر اور قاضی القضاۃ ہے۔ ہارون بھی ان کا احترام بجالاتا تھا، ان کو ہر وقت دربار میں باریابی کی اجازت تھی، ان کی سواری باب خلافت سے اندر چلے جانے کے باوجود بھی سواری سے نہیں اترتے تھے، حریم خلافت کا پردہ اٹھایا جاتا اور ان کی سواری اندر چلی جاتی۔ جب ہارون کا سامنا ہوتا تو وہ خود سلام میں سبقت کرتا اور ان کا اعزاز واکرام کرتا۔

علالت اور وفات

موت سے کچھ دن پہلے بیمار ہوئے، ان کو بیمار ہونے سے پہلے ہی اپنی موت کا کچھ اندازہ ہوگیا تھا، وہ برابر کہا کرتے تھے کہ ۱۷ برس امام صاحب کی خدمت میں رہا اور ۱۷ برس دنیا کے کاموں میں، اب میرا وقت قریب ہے، موت سے پہلے وصیت کی کہ میرے مال میں سے ایک ایک لاکھ درہم اہل مکہ، اہل مدینہ اور اہل کوفہ پر تقسیم کردیا

(۱) شذرات الذهب :۱/۲۹۳ دار الکتب العلمیۃ، بیروت

(۲) مناقب الامام الاعظم للموفق :۲/۲۱۱، طبع: دائرۃ المعارف النظامیۃ بحیدرآباد ۱۳۲۱ھ

جائے، اس کے بعد وراثت تقسیم ہو۔(۱)

علالت کے ایام میں ان پر کچھ عجیب رقت طاری تھی، عہدۂ قضا کی ذمہ داریوں کو انہوں نے جس دیانت سے انجام دیا، اس کی تفصیل اوپر آ چکی ہے، لیکن آخر وقت میں وہ کہتے تھے کہ: کاش! میں فقر وفاقہ کی حالت میں اس دنیا سے چلا جاتا اور عہدۂ قضا نہ قبول کرتا، پھر بھی میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں نے قصداً نہ کسی پر ظلم کیا ہے اور نہ کسی فریق کی پاسداری کی ہے اور نہ میری خواہش ہوئی کہ فلاں فریق کامیاب ہو اور فلاں نہ کامیاب "ولا أحببت خصما على خصم "(۲)

جس روز ان کی وفات ہوئی، ان کی عجیب کیفیت تھی، اور زبان پر یہ کلمات جاری تھی:

> ''بارالہا! تو جانتا ہے کہ میں نے کسی فیصلہ میں جو تیرے بندوں کے درمیان تھا، خود رائی سے کام نہیں لیا اور نہ خلاف واقعہ فیصلہ کیا، ہمیشہ میری کوشش رہی کہ جو فیصلہ ہو وہ تیری کتاب اور تیرے رسول کی سنت کے موافق ہو، جب کسی مسئلہ میں دشواری پیش آتی تھی تو میں امام ابوحنیفہ کو اپنے اور تیرے درمیان واسطہ بناتا تھا، اور جہاں تک مجھے معلوم ہے کہ امام ابوحنیفہؒ احکام کو خوب سمجھتے تھے، اور عمداً وہ کبھی حق کے دائرے سے باہر نہیں جاتے تھے، یہ بھی زبان پر تھا کہ: اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میں ہمیشہ پاک دامن رہا اور کبھی ایک درہم جان بوجھ کر حرام کا نہیں کھایا"جعلت بيني وبينك أباحنيفة لأنى علمت أنه لم يكن فى علمك أحدا أعلم به منه "(۳)

ان کی وفات کا لوگوں پر بڑا اثر ہوا، خصوصیت سے ہارون رشید بہت غمگین تھا،

---

(۱) مناقب الامام الاعظم للکردری :۱۴۵/۲، طبع: دائرۃ المعارف النظامیۃ بحیدر آباد ۱۳۲۱ھ

(۲) مناقب الامام الاعظم للموفق :۲۲۴/۲، طبع: دائرۃ المعارف النظامیۃ بحیدر آباد ۱۳۲۱ھ

(۳) مناقب الامام الاعظم للموفق: ۲۴۱، والکردری: ۱۴۵/۲، طبع: دائرۃ المعارف النظامیۃ بحیدر آباد ۱۳۲۱ھ

جنازہ نکلا تو مشایعت کی اور خود نماز جنازہ پڑھائی اور اپنے خاندان کے مقبرے خاص میں دفن کرایا(۱) اس سے فارغ ہوا تو لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا: تمام اہل اسلام کو چاہئے کہ ان کی وفات پر ایک دوسرے کی تعزیت کریں یعنی حادثہ ایک شخص کا نہیں، ایک خاندان کا نہیں؛ بلکہ پوری ملت کا ہے۔

تقوی وخشیت الٰہی

اللہ کا خوف اور اس کا ڈر اس کے رگ و پے میں سرایت کیا ہوا تھا۔

علی بن عیسی کہتے ہیں:

''میں ایک بار ایسے وقت میں امام ابو یوسفؒ کے پاس آیا کہ مجھے گمان تھا کہ وہ آرام گاہ میں ہوں گے اور ملاقات نہ ہو سکے گی، میں نے اطلاع کرائی تو فوراً بلالیا، دیکھا کہ ایک علاحدہ کمرے میں لنگی باندھے بیٹھے ہیں اور ان کے گرد کتابوں کا انبار ہے، میں نے کہا: میں تو سمجھتا تھا کہ آپ سے ملاقات نہ ہو سکے گی، امام ابو یوسفؒ نے فرمایا کہ: دیکھو اس کمرے کے چاروں طرف یہ الماریاں ہیں، ان میں کتابیں اور کاغذات کے بہت سے پوٹ رکھے ہوئے ہیں، یہ تمام میرے فیصلوں کی نظیریں ہی، قیامت کے دن جب مجھ سے باز پرس ہوگی کہ تم نے فیصلے کس طرح کیے تو خدا کے حضور اس کے جواب میں یہی پیش کروں گا ''هذه كلها قضايا قضيت بها وأنا محتاج إلي اعد لها جوابا إذا سئلت يوم القيامة'' (۲)

(۱۱) امام محمد شیبانی

محمد نام، ابو عبد اللہ کنیت، شجرہ نسب کچھ اس طرح ہے، محمد بن الحسن الفرقد الشیبانی۔

---

(۱) تاریخ بغداد: ۱۴

(۲) مناقب الامام الاعظم للموفق: ۲/۲۴۴، طبع: دائرۃ المعارف النظامیۃ بحیدر آباد ۱۳۲۱ھ)

ان کے والد دمشق کے ایک گاؤں حرستا کے رہنے والے تھے، ترک وطن کر کے بہ سلسلۂ ملازمت عراق آئے اور وہیں ایک گاؤں ''واسط'' میں سکونت اختیار کرلی، امام محمد یہیں ۱۳۲ھ میں پیدا ہوئے۔ واسط میں ابھی عمر کے چند سال گذرنے پائے تھے کہ ان کے والد وہاں سے شامی لشکر کے ساتھ کوفہ چلے آئے اور پھر وہیں مستقل بود وباش اختیار کرلی، کوفہ اس وقت علم وفن کا مرکز اور علماء ومشائخ کا گہوارہ تھا، علمی اعتبار سے اسے تمام ممالک اسلامیہ میں ''ام البلاد'' کی حیثیت حاصل تھی، اسی مادر علمی کی آغوش میں امام محمد نے تعلیم وتربیت حاصل کی اور اسی ماحول میں انہوں نے نشو ونما پائی، سب سے پہلے حسب روایت قرآن کی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد ادب ولغت کی ابتداء کی گئی، ادب اور لغت کی تعلیم سے فراغت کے بعد کوفہ کے بڑے بڑے شیوخ کے درس میں شریک ہونے لگے، فطری استعداد وصلاحیت اور کوفہ کے علمی ماحول نے کم سنی ہی میں انہیں ایک جوہر قابل بنا دیا۔(۱)

امام ابوحنیفہؒ کے یہاں آمد اور ان سے شرف تلمذ

ابھی تیرہ چودہ برس کے ہی تھے کہ ایک مسئلہ دریافت کرنے کی غرض سے امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، وہ مسئلہ یہ تھا کہ اگر نابالغ عشاء کی نماز پڑھ کر سو جائے اور اسی رات میں وہ بالغ ہو جائے تو کیا وہ عشاء کی نماز دہرائے گا، امام صاحب نے اثبات میں جواب دیا، یہ سوال چونکہ انہوں نے اپنے متعلق کیا تھا، اس لئے وہاں سے فوراً اٹھے، وضو کیا اور مسجد کے ایک گوشہ میں جا کر عشاء کی نماز دہرائی، امام صاحب نے یہ دیکھ کر حاضرین سے فرمایا کہ انشاء اللہ یہ لڑکا رشید ہوگا ''إن هذا الصبی یفلح''(۲)

گویا یہ ایک معمولی واقعہ تھا؛ لیکن یہی واقعہ تحصیل فقہ اور امام صاحب سے ان کی عقیدت وتلمذ کا سبب بن گیا، چنانچہ کچھ دنوں کے بعد وہ پھر امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حلقہ تلمذ میں داخل ہونے کی خواہش کا اظہار کیا، امام صاحب نے اپنے دستور کے مطابق شریک درس ہونے کے لئے حافظ قرآن ہونے کی شرط ان کے سامنے

---

(۱) مناقب الامام الاعظم للکردری :۲/۱۴۶، طبع: دائرۃ المعارف النظامیۃ بحیدرآباد ۱۳۲۱ھ

(۲) مناقب الامام الاعظم للکردری :۲/۱۵۵، طبع: دائرۃ المعارف النظامیۃ بحیدرآباد ۱۳۲۱ھ

رکھی تو پھر وہ ایک ہفتہ کے بعد اپنے والد کے ساتھ امام صاحب کے پاس آئے اور عرض کیا کہ میں نے قرآن حفظ کرلیا ہے،"فغاب سبعة أيا م ، ثم جاء وقال حفظته "(۱) اس کے بعد انہوں نے کوئی مسئلہ دریافت کیا، امام صاحب نے ان سے پوچھا کہ: یہ مسئلہ تم کسی سے سن کر دریافت کر رہے ہو یا تمہارا طبع زاد ہے، امام محمدؒ نے کہا: یہ سوال خود میرے ذہن میں آیا ہے، امام صاحبؒ نے ان سے فرمایا کہ تم تو بڑے لوگوں جیسا سوال کرتے ہو تم برابر میرے حلقۂ درس میں آتے رہو، اس کے بعد امام محمدؒ مستقل طور پر امام صاحب کے سلسلہ تلامذہ میں داخل ہوئے اور ہمیشہ سفر وحضر میں ان کی صحبت میں رہا کرتے، ان کی حیات تک کسی دوسرے حلقۂ درس میں نہیں گئے، امام ابوحنیفہؒ سے ان کو صرف چار سال استفادہ کا موقع ملا، پھر امام صاحبؒ کی وفات کے بعد امام ابویوسفؒ کی طرف رجوع کیا جو امام صاحب کے محبوب اور سب سے زیادہ ذی علم تلامذہ میں سے تھے، اور ان کے حلقۂ درس میں فقہ کی تکمیل کی، اور بجز چند آخری سالوں کے بہت کم ان سے علاحدہ رہے۔(۲)

عہدۂ قضاء سے انکار

اسلاف امت میں بہت سی ہستیاں ایسی گذری ہیں جنہوں نے حکومت کے کسی بھی عہدہ کو قبول کرنے کو پسند نہیں کیا اور نہ امراء وسلاطین کی قربت اور نزدیکی ہی کو گوارہ کیا، اس کی ایک وجہ تو یہ تھی جیسا کہ پہلے مذکور ہوا کہ ان کو امراء وسلاطین کے دباؤ میں فیصلے کرنے پڑتے تھے، جو دینی حمیت اور غیرت کے مغائر تھا، اما ابوحنیفہؒ کو جب خلیفہ منصور نے عہدۂ قضا پیش کیا تو یہ کہہ کر اس ذمہ داری سے سبکدوشی اختیار کر لی تھی کہ "میں اس عہدہ کی صلاحیت نہیں رکھتا، امام ابویوسفؒ کچھ مصلحتوں سے عہدۂ قضاء کو قبول کیا تھا، انہیں عہدۂ قضا کے انکار کرنے والوں میں امام محمدؒ، عبداللہ بن مبارکؒ اور امام زفرؒ بھی شامل تھے، امام محمدؒ اس بارے میں اس قدر سخت اور شدید واقع ہوئے تھے کہ امام ابویوسفؒ نے

(۱) مناقب الامام الاعظم للكردری :۲/۱۵۵،طبع: دائرۃ المعارف النظامیۃ حیدر آباد ۱۳۲۱ھ

(۲) مناقب امام محمد، تذکرۃ الحفاظ

جب عہدۂ قضا قبول کیا تو انہوں نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا، لیکن بعد میں کچھ احوال ایسے پیش آئے کہ امام محمدؒ نے عہدۂ قضا کو قبول کیا۔

امام ابو یوسفؒ نے عہدہ قضا اس لئے قبول کیا تھا کہ اس منصب پر فائز ہو کر امام کے مستنبط کردہ مسائل کی ترویج واشاعت کا کام کیا جائے، اس لئے ان کی خواہش تھی کہ امام محمد بھی اسی کاز کی تکمیل کے لئے عہدہ قضا قبول کرلیں، اتفاق سے اسی زمانہ میں ''رقہ'' میں قاضی کے تقرر کا مسئلہ درپیش ہوا اور اس سلسلہ میں امام ابو یوسفؒ سے مشورہ کیا گیا تو انہوں نے امام محمدؒ کے انتخاب کا مشورہ دیا، امام محمدؒ اس وقت کوفہ میں تھے، کوفہ سے بغداد بلائے گئے، چنانچہ وہ بغداد آئے اور پہلے امام ابو یوسفؒ کے پاس گئے اور ان سے اپنے انتخاب کی وجہ دریافت کی کہ کوفہ اور بصرہ میں تو ہمارے مسلک کی اشاعت اور ترویج ہو چکی ہے، اگر آپ شام میں چلے جائیں تو وہاں بھی اس کی ترویج کا ذریعہ پیدا ہو جائے گا، امام محمدؒ نے اس مصلحت کو اپنے انتخاب کے لئے پسند نہیں کیا اور کہا کہ: اس میں براہ راست مجھ سے گفتگو کرنی چاہئے تھی، اس گفتگو کے بعد امام ابو یوسفؒ نے ان سے یحی برمکی کے پاس چلنے کے لئے کہا، دونوں صاحب یحیی برمکی کے پاس گئے، امام ابو یوسفؒ نے یحی سے کہا کہ: محمد بن حسنؒ سامنے موجود ہیں، ان سے (عہدۂ قضا کے) معاملات طے کر لیجئے، یحی نے امام محمد پر ایسا دباؤ ڈالا کہ وہ عہدۂ قضا قبول کرنے پر مجبور ہو گئے۔(۱)

امام محمد نے عہدہ قضا قبول تو کر لیا؛ لیکن یہ بات چونکہ ان کی طبیعت اور ضمیر کے خلاف تھی اور اس کا ذریعہ امام ابو یوسفؒ ہوئے تھے، اس لئے انہوں نے امام ابو یوسفؒ سے ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور اس میں اس قدر شدت اختیار کی کہ ان کے یہاں آمد ورفت بھی ترک کردی، اور مشہور ہے کہ وفات کے بعد ان کے جنازہ میں شرکت بھی نہیں کی۔(۲)

دوسری روایت اس سلسلے میں یہ ہے کہ ہارون رشید نے خود ان کو اس عہدہ کے

---

(۱) مناقب الامام الاعظم للکردری :۱۶۵/۲، طبع: دائرۃ المعارف النظامیۃ بحیدر آباد ۱۳۲۱ھ

(۲) تاریخ بغداد: امام ذہبی، ترجمہ امام محمد

لئے منتخب کیا تھا، جب امام محمدؒ کو معلوم ہوا تو وہ امام ابو یوسفؒ کے پاس گئے اور اپنے گذشتہ تعلقات کو یاد دلا کر فرمایا کہ مجھے اس آزمائش میں نہ ڈالئے، امام ابو یوسفؒ ان کو لے کر یحییٰ کے پاس گئے، اس نے ان کو ہارون رشید کے پاس بھیج دیا اور اس طرح مجبور ہو کر انہیں یہ عہدہ قبول کر لینا پڑا۔(۱)

بے لاگ فیصلہ اور عہدۂ قضا سے برطرفی

امام محمد نے یہ عہدہ بادل ناخواستہ قبول کیا تھا، ان کی خواہش کو اس میں ذرہ برابر دخل نہ تھا، اس لئے وہ جب تک اس عہدہ پر فائز رہے بڑی دیانت داری سے بلاکسی رو ورعایت کے اس کے فرائض انجام دیتے رہے، انہوں نے کبھی اپنے فیصلہ میں خلیفۂ وقت یا ارکان دولت کی پرواہ نہ کی، چنانچہ ان کے قاضی ہونے کے کچھ ہی روز بعد یحییٰ بن عبداللہ کی امان کا قصہ دربار میں پیش ہوا، ہارون نقض عہد کر کے یحییٰ کو سزا دینا چاہتا تھا؛ لیکن اس ارادہ کی تکمیل کے لئے قضا کے فیصلہ کی ضرورت تھی، چنانچہ تمام قضاۃ دربار میں بلائے گئے، امام محمدؒ بھی موجود تھے، ہارون نے سب سے پہلے امام محمدؒ سے دریافت کیا، انہوں نے فرمایا کہ: یحیی بن عبداللہ کو جو امان دی جاچکی ہے وہ صحیح ہے اور اس امان کا نقض اور یحی کا قتل کسی طرح جائز نہیں ہے، ان کے بعد ہارون بن حسن بن زیاد سے مخاطب ہوا، انہوں نے کچھ صاف جواب نہ دیا، پھر اس نے ابوالبختری وہب بن وہب سے دریافت کیا، انہوں نے ہارون کی مرضی کے مطابق جواب دیا، امام محمد پر عتاب شاہی نازل ہوا اور وہ عہدۂ قضا سے برطرف کر دیئے گئے اور انہیں افتاء سے بھی روک دیا گیا" ومنعه عن الفتوى"(۲)

قید وبند

غالبا اسی فتوے کے سلسلہ میں استاد کی سنت کے مطابق انہیں قید وبند کی مشقت اٹھانی پڑی، مناقب کردری میں محمد بن سلام (امام محمد کے خاص شاگرد) کا بیان ہے کہ:

(۱) مناقب الامام الاعظم للکردری :۱۶۵/۲،طبع: دائرۃ المعارف النظامیۃ بحیدر آباد ۱۳۲۱ھ

(۲) مناقب الامام الاعظم للکردری :۱۶۵/۲،طبع: دائرۃ المعارف النظامیۃ بحیدر آباد ۱۳۲۱ھ)

" طلب محمد للقضاء فحبس ووكل به قرين حتى لا يطلع أحد ولا يدخل عليه أحد ، وضيق فی السجد الفقه ، فرشوت السجّان رشوة عظيمة ودخلت عليه بكيس من الدراهم "(۱)

امام محمد فیصلہ کے لئے بلائے گئے اور پھر قید کردیئے گئے اور ان کو قید تنہائی دے دی گئی، گویا علم فقہ کے افادہ کو محبوس کردیا گیا، میں نے دربان کو کچھ دے دلا کر ان کے پاس ایک تھیلی درہم لے کر پہنچا۔

اتفاق سے اسی زمانے میں ام جعفر (ہارون کی بی بی) کو کوئی جائداد وقف کرنے کا خیال پیدا ہوا، اس نے امام محمد سے سے وقف نامہ لکھنے کی درخواست کی، انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کردی کہ مجھے فتوی دینے سے روک دیا گیا ہے، ام جعفر نے امام محمد کے معاملہ (غالباً پابندی اٹھالینے کے بارے میں) ہارون سے گفتگو کی، ہارون نے انہیں فتوی کی اجازت دے دی اور پھر ان کو بڑے اعزاز واکرام کے ساتھ قاضی القضاۃ کا عہدہ پیش کیا، (۲) جس پر وہ غالباً آخر وقت تک فائز رہے۔

وفات

امام محمد کے قاضی القضاۃ ہونے کے کچھ ہی دن بعد ہارون کو کسی ضرورت سے ''رے'' جانا پڑا، امام محمد کو بھی وہ اپنے ساتھ لے گیا، اسی مقام پر ۱۷۹ میں ۵۸ برس کی عمر میں امام فقہ نے داعی اجل کو لبیک کہا، اتفاق سے کسائی مشہور امام نحو بھی اس سفر میں ہارون کے ساتھ تھے، انہوں نے بھی اسی دن یا دودن کے بعد انتقال کیا، ہارون کو ان دونوں ائمہ فن کے پے در پہ انتقال کا بڑا رنج ہوا اور اس نے غایت افسوس میں کہا کہ: فقہ ونحو دونوں کو میں نے ''رے'' میں دفن کردیا ''دفنت اليوم اللغة والفقه ''(۳) حیل

(۱) مناقب الامام الاعظم للكردری :۱۶۵/۲، طبع: دائرۃ المعارف النظامیہ حیدرآباد ۱۳۲۱ھ

(۲) مناقب الامام الاعظم للكردری :۱۶۵/۲، طبع: دائرۃ المعارف النظامیہ حیدرآباد ۱۳۲۱ھ

(۳) تاريخ بغداد : حرف الحاء :۱۸۱/۲، دار الكتب العلمية ، بيروت

طبرک جورے کا مشہور قلعہ ہے اسی میں امام فقہ کو سپرد خاک کیا گیا۔

جرأت وحق گوئی

آپ کے صحیفہ اخلاق کا ایک نمایاں باب جرأت وحق گوئی بھی تھا، جب کبھی حق بات کے اظہار کا موقع آجاتا تو آپ اس میں کسی کی رو و رعایت اور مداہنت نہیں کرتے تھے، یحیی طالبی کا ذکر اوپر آچکا ہے، ہارون نے اس سلسلہ میں بڑی کوشش کی کہ اس کی مرضی کے مطابق فتوی دے دیں؛ لیکن انہوں نے اس کے شاہانہ دبدبہ کی پرواہ کئے بغیر پوری جرأت کے ساتھ حق کا اظہار کیا۔

ایک روز امام محمدؒ دوسرے علماء کے ساتھ ہارون کے محل میں بیٹھے ہوئے تھے، اتفاق سے اس وقت ہارون رشید بھی آگیا، تمام حاضرین اس کی تعظیم کے لئے کھڑے ہوگئے؛ لیکن امام محمدؒ نے اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کی، تھوڑی دیر بعد ہارون نے امام محمدؒ کو تخلیہ میں بلایا، امام محمدؒ اندر گئے تو ہارون نے ان سے کہا: بنوتغلب (نصاری) کو نقض عہد کر کے میں قتل کرانا چاہتا ہوں، امام محمد نے فرمایا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں امن دے دی ہے، اس لئے نقض عہد کی کوئی گنجائش نہیں ہے، ہارون نے کہا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس شرط پر امان دی تھی کہ وہ اپنے بچوں کو بپتسمہ (عیسائی بنانا) نہ کریں؛ لیکن انہوں نے اس کی خلاف ورزی کی ہے، امام محمدؒ نے فرمایا کہ: انہوں نے بپتسمہ کے باوجود انہیں امان دی تھی، اس پر ہارون نے کہا کہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان سے جنگ کا موقع نہیں مل سکا، امام محمد نے فرمایا: اگر ایسا ہے تو اس کے بعد حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کو ان سے جنگ کرنی چاہئے تھی؛ حالاں کہ ان لوگوں نے ان سے کوئی تعرض نہیں کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے: ہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے بلاشرط صلح کی تھی، اس پر ہارون بہت خفا ہوا اور ان کو محل سے باہر نکلوایا، بعض روایتوں میں ہے کہ جب لا جواب ہوگیا تو اس نے پوچھا کہ: میرے آنے پر آپ میری تعظیم کے لئے کیوں کھڑے نہیں ہوتے، امام محمدؒ نے جواب دیا کہ یہ خدام کا کام ہے، علماء کے درجہ سے یہ چیز فروتر ہے، آپ کے ابن عم (حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ) نے آنحضرت ﷺ سے روایت

کیا ہے کہ جو شخص یہ پسند کرتا ہے کہ لوگ اس کی تعظیم کے لئے باادب کی طرح کھڑے رہیں تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔(۱)

ایک مرتبہ ہارون رشید نے کسی شخص کے بارے میں امان لکھوائی، غالبا اس خیال سے دوسرے سے لکھوائی کہ ضرورت کے وقت اس سے انکار کی گنجائش نکل سکے، چنانچہ اس نے اس امان کے بارے میں امام محمدؒ سے فتوی پوچھا کہ میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے نہیں لکھا ہے، دوسرے سے لکھوایا ہے، تو کوئی شخص اگر قسم کھائے کہ وہ کوئی خط یا تحریر اپنے ہاتھ سے نہ لکھے گا؛ لیکن اگر دوسرے سے لکھوائے تو اس کی قسم ٹوٹے گی یا نہیں، امام محمدؒ نے اپنی ذکاوت سے مسئلہ کی نوعیت کو سمجھ لیا، فرمایا کہ وہ قسم کھانے والا شخص عوام میں ہے تو جب تک وہ نیت نہ کرے اس کی قسم نہ ٹوٹے گی؛ لیکن اگر بادشاہ ہے تو قسم ضرور ٹوٹ جائے گی، اس لئے کہ بادشاہ کے حکم سے جو چیز لکھی جائے گی وہ بادشاہ کی ہی ہوگی، اس پر ہارون رشید بہت برافروختہ ہوا۔

انہیں تمام واقعات اور امام محمد کی حق گوئی اور بے باکی اور حق کی حمایت میں امراء اور سلاطین کی پرواہ بالکل نہ کرنے کی وجہ سے ہارون رشید کو یہ شبہ ہوا کہ ہمارے خلاف آئے دن جو طالبیوں کی سازش ہوا کرتی ہے، اس میں امام محمد کا ہاتھ ہے، چنانچہ اس نے حکم دیا کہ ان کی کتابوں کا جائزہ لیا جائے کہ ان میں اس قسم کے باغیانہ خیالات تو نہیں پائے جائے، امام محمد کو جب معلوم ہوا تو انہوں نے محمد بن سماعہ سے جو ان تمام واقعات میں ان کے ساتھ تھے، کہا کہ: فورا گھر پر جاکر میری کتابوں کو محفوظ کرلو، ورنہ ہوسکتا ہے کہ ایسی کوئی چیز ان میں شامل کردی جائے جو ان میں موجود نہ ہو، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا، اس کے بعد جب ہارون کے سامنے یہ کتابیں پیش ہوئیں تو ان میں بجز حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل کی حدیثوں کے اور کوئی چیز نہیں ملی، اس پر ہارون رشید نے کہا کہ: اس سے زیادہ تو ان کے فضائل ہمارے پاس موجود ہیں۔

(۱) مناقب الامام الاعظم للکردری :۱۶۳/۲، طبع: دائرۃ المعارف النظامیۃ بحیدرآباد ۱۳۲۱ھ

(۱۲) سوّار بن عبداللہ

اپنے علم میں ممتاز، حق کے معاملہ میں جری اور کار قضا میں مضبوط کردار ادا کرنے والے ہیں، قاضی بھی رہے، امیر بھی، طبیعت میں غیر معمولی قناعت تھی، ان کے صاحبزادے عبداللہ بن سوار نے ان سے پوچھا: ہم لوگ زیادہ دولت مند ہیں یا امیر المؤمنین؟ انہوں نے حکیمانہ جواب دیا: مال کے اعتبار سے امیر المومنین اور غناء نفس کے اعتبار سے ہم لوگ۔

عہدۂ قضا اور اصلاحات

منصب قضاء پر آتے ہی انہوں نے پوری شدت سے کام لیا، امین اور نائبین مختلف کاموں کے لئے مقرر کئے، ان کی تنخواہیں مقرر فرمائیں، اوقاف کا بندوبست اپنے ہاتھ میں لیا، مختلف اموال کے وصی اور نگرانوں کے کام کی نگہداشت کے لئے اپنی طرف سے عہدہ دار مقرر فرمائے، مقدمات اور متعلق کاموں کے لئے طویل فائلیں تیار کرائیں، اور ایسے اموال جن کے مالکوں کا پتہ نہیں ہوتا انہیں اپنی نگرانی میں لیا، ایسے مال کا نام ''حشریہ'' رکھا، مزاجاً بردبار تھے، خیر کی تلاش میں رہتے، غصہ بہت کم آتا، گفتگو میں بڑی حکمت تھی، مسائل کو سلجھانے اور مفاہمت کرانے کا خاص سلیقہ تھا۔(۱)

☆ بصرہ میں ایک نہر تھی جسے ''نہر ابن عمر'' کہا جاتا تھا، خلیفہ منصور نے اسے بند کر دینا چاہا، حضرت سوار ایک وفد لے کر منصور کے دربار میں حاضر ہوئے اور ان سے کہا کہ: امیر المؤمنین! اگر آپ ایک لاکھ انسانوں کو پیاس سے مار دینا چاہتے ہیں تو نہر بند کر دیں، میں آپ کو اہل بصرہ سے ڈراتا ہوں، خلیفہ نے کہا: تم مجھے بصرہ والوں سے ڈراتے ہو، میں سپہ سالار کو بھیج کر ان کے آخری سے آخری آدمی کو ختم کر دوں گا، سوار نے کہا: حضرت! میرا وہ مقصد نہیں تھا جو آپ نے سمجھا، میں آپ کو یتیم کی بددعا سے، بیواؤں اور بے سہارا لوگوں سے ڈراتا ہوں، خلیفہ منصور اپنے ارادہ سے باز آ گیا اور اسی وقت انہیں بصرہ کا قاضی مقرر کیا۔

(۱) اخبار القضاة : سوار بن عبد الله بن قدامة:۲/۵۷، مكتبة التجارية بمصر

☆ ایک دفعہ سوار ابوجعفر المنصور کے یہاں گئے اور اس کے دست بوسی کئے بغیر بیٹھ گئے ، ابوجعفر کو چھینک آئی اس نے الحمداللہ نہیں کہا تو سوار نے بھی اس کا جواب نہیں دیا، پھر اس کو چھینک آئی تو اس نے الحمدللہ کہا تو سوار نے چھینک کا جواب دیا، پھر سوار وہاں سے اٹھ کر چلے گئے اور ابوجعفر ان کو تکتا رہ گیا'' فأتبعه أبو جعفر بصره''(۱)

☆ ایک دفعہ عقبۃ بن سلم الھنائی بصرۃ کے گورنر نے ایک شخص سے موتی لے لیا جس کو اس نے سمندر سے حاصل کیا تھا اور اس کو قید کر دیا، اس شخص کی بیوی سوار بن عبداللہ کے پاس مقدمہ لے کر آئی ،اس نے کہا: میں اللہ پر بھروسہ کرتی ہوں ، پھر قاضی پر، امیر عقبہ بن مسلم نے میرے شوہر کو گرفتار کرلیا ہے اور اس کا موتی اس سے چھین لیا ہے،اور اسے جیل میں قید کر دیا ہے، چنانچہ سوار نے اس بات کی حقیقت جاننے کے لئے امیر کے پاس کارندہ بھیجا اور یہ کہلا بھیجا کہ اگر یہ بات درست ہے تو اس آدمی کو رہا کر دو اور اس کا موتی اس کے حوالے کر دو،عقبہ کو جب پیغام پہنچا تو اس نے اس کو ٹھکرا دیا، اور سوار کو بری بری گالیاں دیں، چنانچہ کارندے نے ساری تفصیلات سوار کو بتا دیں،تو سوار نے یہ کہلا بھیجا کہ اگر تم اس آدمی کو رہا نہ کرو گے اور اس کا موتی اس کے حوالہ نہ کرو گے تو میں خود تمہارے پاس سفید کپڑے زیب تن کر کے آؤں گا ، اور تمہیں بغیر کسی ہتھیار اور فوج کے تباہ وتاراج کر دوں گا، اور تمہارا ایسا انجام کروں گا لوگ ایک مدت تک اس کا چرچا کریں گے،'' ولأقتلنك قتلة يتحدث الناس بها '' جب عقبہ کے مصاحبوں نے اس درشت کلام اور سخت لب ولہجہ کو سنا تو اس کو سمجھایا کہ قاضی کی بات مان لی جائے۔(۲)

---

(۱) اخبار القضاة : سوار بن عبد الله بن قدامة :۲/۵۷

(۲) اخبار القضاة : سوار بن عبد الله بن قدامة :۲/۵۷

(۱۳) قاسم بن معن

نام قاسم، کنیت ابوعبداللہ اور اسم گرامی معن تھا، مخزن علم کوفہ کو ان کی وطنیت کا شرف حاصل ہے، ان کے جد امجد حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی شخصیت آسمان صحابیت کا وہ کوکب تاباں تھی جس پر پوری اسلامی تاریخ فخر کرتی ہے، وہ نہ صرف قرآن وحدیث اور اصول وفرائض وغیرہ میں یگانہ روزگار تھے؛ بلکہ فقہ میں ایک مستقل مکتبِ فکر کے بانی بھی تھے، جس کی اساس پر بعد میں فقہ حنفی کا فلک رفعت محل تعمیر ہوا، قاضی قاسم نے اپنی اس آبائی وراثت سے خوب وافر حصہ پایا تھا۔

فضل وکمال

علمی اعتبار سے ان کا مرتبہ اور مقام نہایت ہی بلند تھا، جملہ علوم وفنون پر انہیں کامل دسترس حاصل تھا، حدیث، فقہ، تاریخ ورجال، زبان وادب میں ان کا عبور مسلم خیال کیا جاتا تھا، امام ابوحاتمؒ بیان کرتے ہیں۔ ’’كان من أروى الناس للحديث والشعر وأعلمهم بالعربية والفقه ‘‘(۱) وہ حدیث، فقہ اور عربیت کے بہت بڑے واقف کار تھے ۔:’’كان إماما علامة ثقة قاضی الكوفة‘‘(۲)

ابن ناصر کہتے ہیں کہ وہ امام، علامہ، ثقہ اور کوفہ کے قاضی تھے۔

علامہ یاقوت حموی لکھتے ہیں کہ:

”إن القاسم من المحدثين والفقهاء والزهاد والثقات ولم يكن بالكوفة فی عصر ہ نظيره ولا أحد يخالفه فی شئ يقوله “ (۳)

’’بلاشبہ قاسم بن معن محدثین، فقہاء، زہاد اور ثقات کے زمرہ میں شمار کئے جاتے ہیں، اور کوفہ میں اس زمانے میں ان کی کوئی نظیر نہ تھی اور نہ ان کے

(۱) تذكرة الحفاظ: الطبقة الخامسة من الكتاب: ۱/۱۷۵، دار الكتب العلمية، بيروت

(۲) شذرات الذهب: ۱/۲۷۹، دار الكتب العلمية، بيروت

(۳) معجم الأدباء: القاسم بن معن المسعودی: ۵/۲۲۳۲، دار الغرب الإسلامی، بيروت

قول کی مخالفت کرنے والا کوئی شخص تھا“۔

اگر قاضی قاسم اپنی تبحر علمی اور فضل وکمال کی وجہ سے امامت اور اجتہاد کے درجہ پر فائز تھے؛ لیکن چوں کہ انہوں نے ایک عرصہ تک امام ابوحنیفہؒ کی ہم نشینی کا شرف حاصل کیا تھا اور وہ ان کی علمی ژرف بینی اور نکتہ رسی سے بے حد متاثر تھے، اس لئے بیشتر امور میں ان ہی کے مسلک کے پیرو تھے، اور اسی کے مطابق فتوی دیتے تھے، ”کان فقیها فی رأی أبی حنیفة ولقیه “(۱) ایک مرتبہ ان سے کسی نے دریافت کیا کہ: آپ خود کو امام ابوحنیفہؒ کے غلاموں میں شمار کرنا پسند کریں گے، برجستہ فرمایا:

”ما جلس الناس إلی أحد أنفع من مجالسة أبی حنیفه“(۲)

”امام ابوحنیفہؒ کی صحبت سے زیادہ نفع بخش کسی اور کی مجلس نہیں“

عہدۂ قضا

فقہ وافتاء میں غیر معمولی مہارت کے باعث کوفہ کے عہدۂ قضا پر بھی ایک طویل عرصہ تک مامور رہے، ان کے جد امجد حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بھی کامل دس سال تک کوفہ کے قاضی اور افسر خزانہ رہ چکے تھے، جب قاضی شریک نخعی کی معزولی کے بعد یہ آبائی وراثت قاسم کے ہاتھوں میں آئی تو انہوں نے اس فرض کو ایسی شان وشوکت اور احتیاط وانصاف کے ساتھ انجام دیا کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے دور کی یاد تازہ ہوگئی۔

خلیفہ منصور کے زمانہ میں اس عہدہ کی ذمہ داریاں سنبھالیں اور پھر ہارون الرشید کے عہد تک برابر اس پر مامور رہے۔

ایثار وتبرع

استغناء اور بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ اپنے طویل زمانہ قضاء میں کبھی مشاہرہ اور اجرت لینا پسند نہ کیا اور تاحیات تبرعاً یہ خدمت انجام دی، علامہ ابن سعد رقم طراز ہیں:

”ولی قضاء الکوفة ولم یرزق علیه شیئا حتی مات “ (۳)

---

(۱) معجم الأدباء: القاسم بن معن المسعودی: ۲۲۳۲/۵، دار الغرب الإسلامی، بیروت

(۲) اخبار القضاة (۳) معجم الأدباء: القاسم بن معن المسعودی: ۲۲۳۱/۵

''وہ کوفہ کے قاضی مقرر ہوئے اور زندگی بھر اس کا مشاہرہ نہیں لیا''

جب ان کی خدمت میں تنخواہ پیش کی جاتی تو اس کو فوراً مستحقین میں تقسیم کر دیتے اور اس میں سے ایک حبہ اپنے استعمال میں نہ لاتے۔

یزید بن یحیی کہتے ہیں:

" كان القاسم يقسم أرزاقه إذا جاء ته ولا يستحل أن ياخذ رزقا " (۱)

''امام قاسم کے پاس جب تنخواہ آتی تو اس کو تقسیم کر دیتے تھے اور کوئی مشاہرہ لینا جائز نہیں سمجھتے تھے''

حالت مرض میں فریضۂ قضاء کی ادائیگی

اس تبرع و بے نیازی کے باوجود منصب قضاء کی منصبی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں سرمو کوتاہی نہ کرتے؛ یہاں تک کہ شدید علالت ونقاہت کی حالت میں بھی مجلس عدالت منعقد کرتے اور پوری حاضر دماغی کے ساتھ عدالتی فیصلے نافذ کرتے، ابن کناسہ بیان کرتے ہیں کہ: قاسم سخت بیماری کے عالم میں بھی عدالت میں بیٹھے تھے ''كان يحكم الحكم وهو عليل " (۲)

شرافت ونجابت

فطری شرافت، نرم خوئی اور بلند ظرفی ان کی شخصیت کے خاص جوہر تھے، اس کا اندازہ لگانے کے لئے صرف اس واقعہ کا نقل کر دینا کافی ہے:

ایک شخص نے اپنے مکان کی چھجہ اتنا نیچا لگوا رکھا تھا کہ اس سے راہ گیروں کو دقت پیش آتی تھی، لوگوں نے اس معاملہ کو قاضی قاسم کی بارگاہِ عدل وانصاف میں پیش کیا، قاضی موصوف نے اس کے انہدام کا فیصلہ صادر کیا، اس پر مالکِ مکان نے بغیر کسی رو

(۱) أخبار القضاة : القاسم بن معن :۱۷۷/۳

(۲) أخبار القضاة : القاسم بن معن :۱۷۸/۳

ورعایت کے قاضی سے کہا کہ: ''پھر آپ نے کیوں اپنے مکان میں سرراہ روزن کھلوار رکھے ہیں؟ فرمایا: اس سے کسی راہگیر کو زحمت نہیں ہوتی اور نہ سواریوں کی آمد ورفت میں کوئی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے'' اس کے بعد فوراً اپنے بعض خدام کو حکم دیا کہ وہ جا کر پہلے ان کے مکان کے روزن بند کردیں اور پھر بعد میں اس شخص کے چھجہ کو منہدم کریں؛ تا کہ پھر آئندہ کوئی شخص اس معاملہ میں انہیں شرمندہ نہ کرسکے۔''فأهدم فی منزلی أولا ، ثم أهدم فی منزله '' (۱)

خلیفہ کے نزدیک قدر ومنزلت

ان کے علم وفضل اور ایثار وقربانی سے خلیفہ ہارون رشید بے حد متاثر تھا، بعض مفسد قاضی قاسم کے خلاف برابر ریشہ دوانیوں میں مصروف رہتے اور خلیفہ کو ان کے خلاف برانگیختہ کرنے کی کوشش کرتے؛ لیکن وہ کسی بات پر کان نہ دھرتا۔

ایک مرتبہ ہارون ''حیرۃ'' گیا اور چالیس دن تک وہاں مقیم رہا؛ لیکن قاضی قاسم بن معن اس سے ملنے نہ آئے، اس پر وزیر فضل نے خلیفہ سے کہا کہ: حضور آپ چالیس دن سے یہاں آئے ہوئے ہیں، اس عرصہ میں تمام شرفاء اور قضاۃ آپ کے دربار میں حاضر ہوئے، مگر آپ نے خیال نہ فرمایا کہ قاسم بن معن ابھی تک نہیں آئے، یہ سن کر خلیفہ نے نہایت ترش لب ولہجہ میں جواب دیا۔

''ما أعرفنی أی شئ ما ترید ، ترید أن أعزله ، لا والله لا أعزله ''(۲)

''مجھے معلوم نہیں کہ تم کیا چاہتے ہو؟ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ میں قاسم کو معزول کردوں، نہیں بخدا میں ایسا نہیں کرسکتا''

وفات

۱۷۵ھ میں خلیفہ ہارون الرشید کے ہمراہ مقام رقہ کی طرف روانہ ہوئے، درمیان میں مقام رأس العین میں پہنچ کر پیغام اجل آگیا اور محبوب حقیقی سے جاملے، احمد بن کامل

(۱) اخبار القضاۃ:القاسم بن معن :۱۷۷/۳ (۲) اخبار القضاۃ:القاسم بن معن :۱۸۰/۳

نے ان کا سنہ وفات ۱۸۸ھ بتلایا ہے؛ لیکن بقول مرزبانی اول الذکر ہی صحیح ہے۔(۱)

خواجہ غلام الثقلین۔وکیل (م ۱۹۱۵/۹/۳ء):

وہ وکالت کرتے تھے؛ لیکن ایک آزاد منش مزدور کی طرح، اگر مہینے کے پہلے چند روز میں ماہوار خرچ کے لائق فیس مل جاتی تو وہ باقی سارا وقت اپنے قومی اور علمی کاموں میں لگا دیتے، عدالت میں دکان لگا کر نہ بیٹھتے، بارہا ایسا ہوا کہ ان کے پاس گاؤں سے مقدمہ والے آتے اور انہیں وکیل کرنا چاہتے؛ لیکن اکثر وہ ان فریقوں کو بلا لیتے، انہیں مقدمہ بازی کے خطروں سے آگاہ کرتے اور ان کا اعتماد حاصل کر کے خود ہی بغیر ایک پیسہ لئے جھگڑے کا فیصلہ کر دیتے۔(خواجہ غلام السیدالدین)

علی گڑھ کالج میں ان سے پہلے اور غالبا ان کے بعد بھی، کوئی ایسا طالب علم نہیں ہوا جس کا مطالعہ ایسا گہرا اور معلومات اتنی وسیع ہو اور جو کام کرنے میں ایسا انتھک ہو۔(مولوی عبدالحق)

علمی لحاظ سے ہمارے طلبہ میں کوئی طالب علم غلام الثقلین جیسا نہیں ہوا۔(کالج پرنسپل، سرتھیوڈ وربک)

کالج کے زمانے سے ان کا معمول تھا کہ تقریبا ہر روز یا انگریزی یا فارسی کی ایک کتاب ختم کر دیتے تھے اور اس شغف میں اکثر کھانا بھول جاتے تھے (خواجہ غلام السیدالدین)

ان کا انتقال، قرآن سنتے ہوئے ہوا۔(۲)

---

(۱) معجم البلدان :۶/۲۰۰

(۲) سب کے لئے، مولف ابن غوری:۹۴

☆ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور خالد بن زید جہنی روایت کرتے ہیں دونوں نے بیان کیا کہ: ایک اعرابی آیا اور عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! ہمارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کر دیجئے، اس کا فریق مخالف کھڑا ہوا اور عرض کیا: ٹھیک ہے ہمارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کر دیجئے، اعرابی نے کہا کہ: میرا بیٹا اس کے یہاں مزدور تھا، اس نے اس کی بیوی سے زنا کیا، لوگوں نے مجھ سے کہا کہ تیرے بیٹے کو سنگسار ہونا چاہئے، میں نے اپنے بیٹے کو سو بکریاں اور ایک لونڈی دے کر چھڑا لیا، پھر میں نے علم والوں سے دریافت کیا تو انہوں نے کہا تیرے بیٹے کو ایک سو کوڑے لگنے چاہئیں اور ایک سال کے لیے جلا وطن ہونا چاہئے، نبی ﷺ نے فرمایا: تمہارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کردوں گا، لونڈی اور بکریاں تو تجھے واپس کی جاتی ہیں اور تیرے بیٹے کو ایک سو کوڑے پڑیں گے اور ایک سال کے لیے جلا وطن ہوگا اور ایک آدمی سے آپ ﷺ نے فرمایا: اے انیس کل تو اس شخص کی بیوی کے پاس جا اگر (وہ زنا کا اقرار کرے تو) اس کو سنگسار کر دے ''فإن اعترفت فارجمها'' چنانچہ انیس نے صبح کے وقت جا کر اس کو سنگسار کر دیا۔(۱)

☆ قاضی امیر حکم کی شہادت کو رد کرتا ہے

سعید بن عبدالرحمٰن الداخل نے قاضی ابن بشیر کی خدمت میں ایک مقدمہ میں اپنی

---

(۱) بخاری: باب من أمر غير الإمام بإقامة الحد، حديث:٦٤٤٦

طرف سے ایک آدمی کو نائب بنا کر بھیجا، دراصل سعید بن عبدالرحمٰن کے قبضہ میں ایک تحریر تھی، جس میں چند صاحب اثر لوگوں کے دستخط تھے، دستخط کنندگان میں سے سارے لوگوں کی وفات ہوچکی تھی، صرف امیر المؤمنین حکم اور ایک آدمی زندہ تھا، یہ دوسرا آدمی سعید بن عبدالرحمٰن کے حق میں لکھی گئی تحریر کی گواہی تو دیتا تھا؛ مگر کچھ دنوں بعد اس کی بھی موت واقع ہوگئی، ادھر تحریر سے متعلقہ مقدمہ وقت کے ساتھ ساتھ پیچیدہ ہوتا جارہا تھا۔

ایک دن سعید بن عبدالرحمٰن یہ نوشتہ دیوار لے کر امیر حکم کے پاس گیا اور اس کے عہدہ امیر کے دستخط دکھلائے جو اس نے اپنی خلافت سے پہلے اپنے باپ کے عہدِ حکومت میں کئے تھے، سعید بن عبدالرحمٰن نے امیر کو یہ نوشتہ دیوار بطور یاددہانی دکھلایا؛ تاکہ قاضی کے پاس جب نوشتہ دیوار جائے تو وہ اسے نافذ کرے اور اس کو باطل قرار دینے سے گریز کرے۔

امیر حکم اپنے چچا سعید بن عبدالرحمٰن سے کہا کہ: چچا جان! ہم اب شہادت کے دینے کے قابل نہ رہے، ہم دنیوی چاہت میں جس طرح ٹوٹ پڑے ہیں اس سے آپ بخوبی واقف ہیں، اس لئے ہماری شہادت قبول نہ کی جائے گی، اس لئے مجھے رسوا نہ کیجئے، سعید بن عبدالرحمٰن نے حکم کی تجویز قبول کرنے سے انکار کردیا اور کہا کہ سبحان اللہ! بھلا قاضی کی کیا مجال کہ وہ آپ کے حکم کو رد کردے، الغرض حکم نے چچا کا اصرار دیکھ کر قاضی کے سامنے شہادت دینے کا وعدہ کرلیا، چنانچہ اس نے مشہور زمانہ دو فقیہوں کو بلایا، ایک کاغذ پر اپنی شہادت کا مضمون قلم بند کیا اور اس پر مہر لگا کر فقیہوں کو دے دیا، پھر گویا ہوا، آپ دونوں میرا یہ نوشتہ لے کر قاضی کی خدمت میں جائیں، دونوں فقیہ حکم کی تعمیل میں قاضی کی عدالت میں اس وقت پہنچے، جب وہ عدالت کی کرسی پر گواہوں کے بیانات سننے کے لئے جلوہ افروز ہوا، جب انہوں نے خلیفہ کا خط قاضی کے ہاتھ میں دیا تو اس نے خط کا مضمون پڑھا اور پھر فقیہوں کی بات سن کر گویا ہوا۔

میں نے آپ دونوں کا مقصد سن لیا، اب آپ لوگ بخیر وعافیت اللہ کی حفظ وامان میں واپس جاسکتے ہیں۔

اتنے میں سعید بن عبدالرحمٰن کا نائب حاضر ہوا اور پورے اعتماد کے ساتھ قاضی سے یوں مخاطب ہوا: آپ کے پاس امیر کی شہادت بھی پہنچ چکی ہے، اب اس سلسلے میں آپ کیا کہیں گے؟ قاضی نے نائب سے وہ نوشتہ دیوار لیا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد کہا: ''میرے نزدیک یہ شہادت قابل قبول نہیں، میرے پاس کوئی عادل شاہد لے کر آؤ'' یہ فیصلہ سنتے ہی نائب گھبرا سا گیا اور جلدی سے سعید بن عبدالرحمٰن کی خدمت میں پہنچا اور حقیقت حال سے آگاہ کیا، جب سعید بن عبدالرحمٰن کے کانوں سے قاضی کا فیصلہ ٹکرایا تو گویا کہ اس کے پاؤں تلے زمین کھسک گئی، فوراً سواری پر بیٹھا اور امیر حکم کی خدمت میں پہنچ کر یہ واویلا کرنے لگا۔

''ہماری سلطنت چلی گئی، ہمارا رعب و دبدبہ زائل ہوگیا، اس قاضی کی یہ مجال کہ آپ کی شہادت کو بھی ردی کی ٹوکری میں ڈال دے'' سعید نے امیر کو مزید اکساتے ہوئے کہا کہ: اللہ تعالی نے آپ کو حکومت سونپی ہے اور اپنے بندوں کے امیر کے طور پر منتخب فرمایا ہے اور مسلمانوں کے جان و مال کا نگہبان بنایا ہے، یہ قاضی اس لائق نہیں ہے کہ اسے آپ یہ اہم منصب سونپیں۔ سعید کا طویل کلام سن کر امیر گویا ہوا: ''چچا جان! کیا میں نے اس قضیے میں کسی شک کا اظہار کیا ہے؟ قاضی ایک نیک و صالح آدمی ہے، اللہ کی راہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت اس کو حق بات سے نہیں پھیر سکتی، جو اس پر واجب تھا اس نے کیا، اور وہ چور دروازہ بند کر دیا جس سے بمشکل داخل ہوا جا سکتا تھا، اللہ تعالیٰ قاضی کو جزائے خیر دے، یہ سن کر سعید کو غصہ آ گیا اور وہ کہنے لگا: میرے حق میں آپ کی طرف سے یہی کچھ کہنے کو رہ گیا ہے۔

امیر نے جواب دیا: ''نعم قد قضيتُ الذي كان لك علي ولستُ والله! أعارض القاضي فيما احتاط لنفسه ولا أخون المسلمين في قبض يد مثله'' ہاں میرے اوپر آپ کا حق بنتا تھا اسے میں نے پورا کر دیا اور اللہ کی قسم! قاضی نے اپنے آپ کو جس احتیاط سے محفوظ رکھا ہے، میں اس کے بارے میں اس کے آڑے نہیں آؤں گا اور نہ اس قسم کے (خوددار اور اچھے) لوگوں کو (حق بات سے) روک

کر مسلمانوں کے حق میں خیانت کا مرتکب ہوں گا''۔(۱)

☆ گورنر کے سامنے اس کا بیٹا کوڑے کھاتا ہے:

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں مصر کے حاکم تھے، مصر کا ایک آدمی حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا:

اے امیر المؤمنین! میں ظلم سے آپ کی پناہ لینے آیا ہوں۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: تم نے ایسے آدمی کی پناہ حاصل کی ہے جو تمہیں پناہ دے سکتا ہے، مصری بولا: میں نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے بیٹے کے ساتھ دوڑ میں مقابلہ کیا، میں اس سے آگے بڑھ گیا تو وہ مجھے کوڑے سے مارنے لگا اور کہنے لگا: میں شریف خاندان کا بیٹا ہوں، یہ شکوہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مصر کے حاکم حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ تشریف لائیں، عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اپنے بیٹے کے ساتھ امیر المؤمنین کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے پوچھا: مصری کہاں ہے؟ وہ سامنے آیا اور کہنے لگا: یہ کوڑا لے اور مار، امیر المؤمنین کا حکم ملتے ہی عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے بیٹے پر کوڑا برسانے لگا اور امیر المؤمنین کہتے جارہے تھے، شریف خاندان کے بیٹے کو مارو، حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ: مصری نے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے بیٹے کو کوڑے لگائے اور اللہ کی قسم! بہت مارا اور ہم اس کی پٹائی چاہتے بھی تھے؛ لیکن مصری برابر مارے جارہا تھا، حتی کہ ہماری خواہش ہوئی کہ اب اس کی پٹائی بند ہوجائے، پھر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے مصری سے فرمایا: کوڑا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی چندیا (گنجے سر) پر بھی لگاؤ'' مصری نے عرض کیا: اے امیر المؤمنین! ان کے بیٹے نے میری پٹائی کی ہے اور میں اس سے قصاص لے لیا، پھر امیر المؤمنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ عمرو رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

''تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنا رکھا ہے جب کہ ان کی ماؤں نے

---

(۱) قصص العرب: ۹۶/۳-۹۷

انہیں آزاد جنا تھا‘‘(مذ کن تعبدتم الناس وقد ولدتهم امهاتهم أحرارا)۔عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:’’یا أمير المؤمنين ! لم أعلم ولم يأتني ‘‘اے امیر المومنین! مجھے اس معاملے کی کچھ خبر بھی نہیں اور نہ یہ میرے پاس شکایت لے کر آیا تھا‘‘(۱)

☆مجھ سے اپنا بدلہ لے لو

احنف بن قیس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ: ہم چند لوگ ایک عظیم الشان خوشخبری سنانے کے لئے امیر المومنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے دریافت کیا، آپ لوگوں نے کونسی جگہ قیام فرمایا؟ ہم نے عرض کیا: فلاں جگہ، امیر المؤمنین ہمارے ساتھ ہمارے پڑاؤ کی طرف چلنے لگے جہاں ہم نے اونٹوں کو بھی باندھ رکھا تھا اور اونٹوں کی حالت یہ تھی کہ مسلسل بھوک کی شدت سے وہ کمزور ہو چکے تھے اور کئی دنوں کے سفر نے انہیں تھکا دیا تھا، اونٹوں کی حالت زار دیکھتے ہی امیر المؤمنین گویا ہوئے: کیا تمہیں سواریوں کے بارے میں اللہ تعالی سے ڈر نہیں لگتا، کیا تمہیں اس بات کی خبر نہیں کہ ان چوپایوں کے بھی تمہارے اوپر حقوق ہیں؟ تم نے ان اونٹوں کو راستے میں کچھ آرام کے لئے کیوں نہ چھوڑ دیا؛ تاکہ یہ زمین کی نباتات کھا لیتے؟

ہم نے عرض کیا: امیر المؤمنین! عظیم فتح و کامرانی کی خوشخبری لے کر ہم تیزی کے ساتھ بھاگتے دوڑتے آپ کی خدمت میں چلے آئے ہیں؛ تاکہ آپ اور دیگر مسلمانوں کو اس خوشخبری سے خوشی ہو اور ان کا کلیجہ ٹھنڈا ہو، یہی وجہ ہے کہ ہم لوگوں نے راستے میں اپنی سواریوں کو روکنا گوارا نہیں کیا، امیر المومنین ہماری باتیں سن کر لوٹ گئے اور ہم بھی ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگے، اسی دوران میں ایک آدمی شکایت لے کر حاضر ہو گیا اور کہنے لگا! امیر المومنین ! فلاں شخص نے مجھ پر ناحق ظلم و زیادتی کی ہے، آپ اس کے خلاف میری مدد کریں۔

امیر المومین نے اپنا کوڑا بلند کیا اور اس کے سر پر دے مارا فرمانے لگے:’’تدعون

(۱) حیاة الصحابة : محمد یوسف کاندھلوی :۳۳۸/۲، موسسة الرسالة، بیروت

عمر ، حتی إذا شغل فی أمور المسلمین أتیتموہ وقلتم : أغثنی ، أغثنی "
عجب تماشا ہے کہ تم لوگ (خالی اوقات میں) عمر کے سامنے اپنا قضیہ پیش نہیں کرتے ہو، مگر جب عمر مسلمانوں کے اہم معاملات کو سلجھانے میں مصروف ہو جاتا ہے تو پھر تم آ کر کہنے لگتے ہو کہ میری مدد کرو، میری مدد کرو۔

چنانچہ وہ آدمی خود کو ملامت کرتے ہوئے واپس ہو گیا، امیر المؤمنین نے فوراً ہی اس آدمی کو واپس بلانے کا حکم دیا، جب وہ واپس آیا تو آپ نے اپنا کوڑا اس آدمی کے آگے ڈال دیا اور کہنے لگے: "اقتص" مجھ سے بدلہ لے لو، وہ کہنے لگا: نہیں، میں بدلہ نہیں لوں گا؛ بلکہ میں اسے اللہ کے لئے اور آپ کے لئے چھوڑتا ہو، امیر المؤمنین نے فرمایا: ایسا نہیں ہوگا، یا تو تم اللہ کے لئے درگزر کر دو اور اس کا بدلہ اسی سے مانگو، بصورت دیگر مجھ پر چھوڑ دو (پھر ایسی صورت میں تمہیں مجھ سے قصاص لینا پڑے گا) وہ کہنے لگا: نہیں نہیں، میں اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لئے معاف کرتا ہوں، اس کے بعد امیر المؤمنین وہاں سے چل پڑے اور گھر پہنچے، ہم لوگ بھی آپ کے ہمراہ تھے، آپ نے دو رکعت نماز ادا فرمائی اور خود کو مخاطب کر کے کہنے لگے:

> "ابن الخطاب! تو ایک خاکسار ومتواضع آدمی تھا تو اللہ تعالیٰ نے تجھے اعلیٰ مقام ومرتبے سے نوازا، تو گم گشتہ راہ تھا، تو اللہ تعالیٰ نے تجھے ہدایت کی روشنی سے آشنا کیا، تو ایک ذلیل انسان تھا تو اللہ تعالیٰ نے تجھے عزت واکرام بخشا اور پھر لوگوں پر حکمراں بنایا، مگر جب ایک آدمی اپنے اوپر ظلم کرنے والے کے خلاف تجھ سے تعاون طلب کرنے کے لئے حاضر ہوا تو تو نے اس کی پٹائی کر دی، ذرا بتا کہ کل قیامت کے روز تو اپنے پروردگار کو کیا جواب دے گا؟" احنف بن قیس کا بیان ہے: امیر المؤمنین نے یہ کہہ کر اپنے اوپر اس طرح ملامت کی کہ مجھے یقین ہو گیا کہ آپ پوری دنیا والوں میں اس وقت سب سے بہتر ہیں" (۱)

---

(۱) قصص العرب :۳۰/۱۳-۱۴

☆ مظلوم کی بددعا سے بچو

جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ اہل کوفہ نے عمر رضی اللہ عنہ سے سعد رضی اللہ تعالی عنہ کی شکایت کی تو عمر رضی اللہ عنہ نے سعد کو معزول کر دیا، اور عمار رضی اللہ عنہ کو ان لوگوں کا حاکم بنایا ان لوگوں نے (سعد کی بہت سی) شکایتیں کیں، یہاں تک کہ بیان کیا کہ وہ نماز اچھی طرح نہیں پڑھتے، تو عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو بلا بھیجا اور کہا: کہ اے اسحاق ! یہ لوگ کہتے ہیں کہ تم نماز اچھی طرح نہیں پڑھتے، انہوں نے کہا سنو ! اللہ کی قسم ! ان کے ساتھ میں نے ویسی نماز ادا کی ہے جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز ہوتی تھی، چنانچہ پہلی دو رکعتوں میں زیادہ دیر لگاتا تھا اور اخیر کی دو رکعت میں تخفیف کرتا تھا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: اے ابو اسحاق! تم سے یہی امید تھی، پھر عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص یا چند شخصوں کو سعد رضی اللہ عنہ کے ہمراہ کوفہ بھیجا، تا کہ وہ کوفہ والوں سے سعد رضی اللہ عنہ کی بابت پوچھیں) (چنانچہ وہ گئے) اور انہوں نے کوئی مسجد نہیں چھوڑی کہ جس میں سعد رضی اللہ عنہ کی کیفیت نہ پوچھی ہو اور سب لوگ ان کی عمدہ تعریف کرتے رہے یہاں تک کہ بنی عبس کی مسجد میں گئے تو ان میں سے ایک شخص کھڑا ہو گیا، اس کو اسامہ بن قتادہ کہتے تھے کنیت اس کی ابو سعدہ تھی اس نے کہا کہ سنو! جب تم نے ہمیں قسم دلائی تو مجبور ہو کر میں کہتا ہوں کہ سعد رضی اللہ عنہ لشکر کے ہمراہ جہاد کو خود نہ جاتے تھے اور غنیمت کی تقسیم برابر نہ کرتے تھے سعد (یہ سن کر) کہنے لگے کہ دیکھ میں تین بددعائیں تجھ کو دیتا ہوں اے اللہ اگر یہ تیر بندہ جھوٹا ہو نمود و نمائش کے لئے اس وقت کھڑا ہوا ہو تو اس کی عمر بڑھا دے اور اس کو فقر میں مبتلا کر، اور اس کو فتنوں میں مبتلا کر دے، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اس کے بعد جب اس سے (اس کا حال) پوچھا جاتا تھا تو کہتا ایک بڑی عمر والا بوڑھا ہوں، فتنوں میں مبتلا مجھے سعد رضی اللہ عنہ کی بددعا لگ گئی۔ عبدالملک (راوی حدیث) کہتے ہیں کہ میں نے اس کو دیکھا ہے، اس کی دونوں ابرو اس کی آنکھوں پر بڑھاپے کے سبب سے جھک پڑی ہیں، وہ راستوں میں لڑکیوں کو چھیڑتا ہے، ان پر دست درازی کرتا ہے "فأنا رأيته بعد قد سقط حاجباه عل عينيه من الكبر وأنه ليتعرض للجواری فی الطرق يغمزهن "(۱)

(۱) بخاری: باب وجوب القرائة للإمام والمأموم، حديث:۷۲۲

☆ ہرمزان ایرانیوں کے ایک لشکر کا سردار تھا، ایک مرتبہ مغلوب ہوکر اس نے جزیہ دینا بھی قبول کیا تھا؛ مگر پھر باغی ہوکر مقابلے پر آیا، آخر شکست ہوئی اور گرفتار ہوا اس حالت میں امیر المؤمنین عمر بن خطاب کی خدمت میں حاضر ہوا کہ تاج مرصع سر پر تھا، دیباج کی قبا زیب تن کیئے ہوئے تھا، کمر سے مرصع تلوار آویزاں تھی اور بیش بہا زیورات سے آراستہ تھا، امیر المؤمنین اس وقت مسجد نبوی میں تن تنہا سوئے ہوئے تھے، آپ نے اپنی پگڑی کو تکیہ بنالیا تھا، ہاتھ میں کوڑا تھا۔

ہرمزان بحیثیت قیدی امیر المومنین کی خدمت میں لایا گیا تھا، آہستہ آہستہ لوگوں کا ازدحام ہوتا گیا، لوگوں میں کانا پھوسی سے امیر المؤمنین کی آنکھیں کھل گئیں، دیکھتے ہوئے گویا ہوئے، یہ ہرمزان ہے، لوگوں نے بتایا ہاں، ہرمزان کو لانے والے وفد نے کہا: امیر المؤمنین! یہ اہواز کا حاکم ہے، آپ اس سے تبادلۂ خیال کریں، امیر المؤمنین نے فرمایا: جب تک یہ اپنے اس لباس میں رہے گا، میں اس سے تبادلۂ خیال نہیں کرسکتا، چنانچہ ہرمزان نے اپنے جسم سے زرق و برق لباس اتارا اور معمولی لباس میں آ گیا، امیر المؤمنین نے پوچھا: ''بار بار تیری بدعہدی کا تیرے پاس کیا عذر ہے'' ہرمزان گویا ہوا: مجھے خوف ہے کہ کہیں آپ میری معذرت سنے بغیر مجھے قتل کردیں، فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ڈرومت، تمہاری معذرت ضرور سنی جائے گی، پھر ہرمزان نے پانی مانگا، پانی آیا تو اس نے پیالہ ہاتھ میں لے کر کہا: میں ڈرتا ہوں کہیں آپ مجھے پانی پینے کی حالت میں ہی قتل نہ کردیں۔

امیر المؤمنین نے فرمایا: تم خوف نہ کھاؤ، جب تک پانی نہ پی لوگے، تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا، ہرمزان نے یہ سنتے ہی پیالہ ہاتھ سے چھوڑ دیا اور اس کا پانی گرادیا اور کہا: اس شرط کے مطابق اب آپ مجھے قتل نہیں کرسکتے؛ کیوں کہ آپ نے مجھے امان دے دی ہے، عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اس کی اس چالاکی اور فریب دہی پر بہت غصہ آیا؛ لیکن حضرت انس رضی اللہ عنہ درمیان میں بول اٹھے اور کہا: امیر المؤمنین! یہ سچ کہتا ہے؛ اور دوسرے لوگوں نے بھی اس کی تائید کی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہرمزان

تو نے مجھے دھوکا دیا؛ لیکن میں تجھے دھوکا نہ دوں گا، اسلام نے اس کی تعلیم نہیں دی، ایفائے عہد اور حسن سلوک کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہرمزان مسلمان ہوگیا، امیر المؤمنین نے دو ہزار سالانہ اس کی تنخواہ مقرر کر دی اور وہ مدینہ منورہ میں رہنے لگا۔(۱)

☆عمر بن عبد العزیزؒ کی نگاہ میں مظلوم کی قدر:

خلیفہ عمر بن عبد العزیزؒ حمص کے بازار میں گھوم رہے تھے، اتنے میں ایک آدمی ان کے پاس آیا جو دھاری دار چادر زیب تن کئے ہوئے تھا، اس نے عرض کیا: اے امیر المؤمنین! آپ کا حکم ہے کہ جو کوئی مظلوم ہو وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو؟ عمر بن عبد العزیزؒ نے کہا: ہاں، وہ شخص بولا: پھر آپ کی خدمت میں دور دراز کے علاقے سے چل کر ایک مظلوم حاضر ہوا ہے، عمر بن عبد العزیزؒ نے پوچھا: تیرا خاندان کہاں ہے؟ وہ بولا: ابین (یمن کا صوبہ) سے بھی دور۔ عمر بن عبد العزیزؒ نے فرمایا: اللہ کی قسم! تیرا خاندان عمر کے خاندان سے بہت دور ہے، یہ کہہ کر اپنی سواری سے فوراً اتر گئے اور پوچھا: تیرے اوپر کیسا ظلم ڈھایا گیا ہے؟ پردیسی نے کہا: میری غلہ اگانے والی زمین پر ایک آدمی نے ناجائز قبضہ جما لیا ہے اور مجھے اس سے یکسر بے دخل کر دیا ہے۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے اس کا قضیہ سن کر عروہ بن محمد کو لکھا کہ وہ اس مظلوم کی داستان اور شہادت سنے اور جب اس کا حق ثابت ہو جائے تو اسے واپس دلا دے، یہ خط لکھ کر اپنی مہر لگا دی، جب پردیسی نے واپسی کے لئے اٹھنا چاہا تو عمر بن عبد العزیز نے اس سے کہا: ٹھہر جاؤ، تم دور دراز علاقے سے حاضر ہوئے ہو، راستے میں تمہارا کتنا زاد سفر خرچ ہوا ہے، یا سواری پر تمہاری کتنی لاگت آئی ہے اور کتنے کپڑے بدلنے پڑے ہیں؟ ان سب کا حساب لگایا گیا تو لاگت پندرہ دینار پہنچی، چنانچہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے اسے یہ رقم دے کر روانہ کیا۔(۲)

☆رشوت کا اثر وکردار:

عباسی خلیفہ مہدی کے زمانے میں عافیہ بن یزید بغداد میں بحیثیت قاضی مقرر تھے،

---

(۱) سنہرے فیصلے: ۲۳۸ (۲) سنہرے فیصلے، عبد المالک مجاہد: ۴۹، مکتبہ دار السلام

ایک دن ظہر کے وقت اچانک قاضی صاحب خلیفہ مہدی کی خدمت میں پہنچ گئے اور اندر آنے کی اجازت طلب کی، خلیفہ کی اجازت سے گھر کے اندر داخل ہوئے اور سلام کے بعد عرض کیا: خلیفۃ المسلمین! وہ صندوق منگوائیں جس میں منصب قضا پر بحالی کے سلسلے میں میرا معاہدہ ہے، کیونکہ اب میں اس منصب سے مستعفی ہونا چاہتا ہوں، آپ سے گذارش ہے کہ آپ میرا استعفی منظور کرلیں۔

قاضی عافیہ بن یزید کی گفتگو سے خلیفہ مہدی کو گمان ہوا کہ شاید حکومت کے کسی ذمہ دار نے قاضی کے فیصلے کو نظر انداز کیا ہے، چنانچہ پوچھ بیٹھا: کیا کسی نے آپ کا فیصلہ ماننے سے انکار کر دیا ہے جو آپ منصبِ قضاء سے مستعفی ہونا چاہتے ہیں؟ انہوں نے کہا: اس قسم کی کوئی بات نہیں، خلیفہ نے کہا: ''پھر آپ کے منصب قضاء سے سبکدوشی کیوں چاہتے ہیں؟ قاضی صاحب کہنے لگ: امیر المؤمنین! بات دراصل یہ ہے کہ ایک ماہ قبل دو آدمیوں نے میرے پاس مقدمہ دائر کیا تھا، مقدمے کی نوعیت بڑی ہی پیچیدہ تھی، ہر دو فریق کے پاس واضح ثبوت اور شہادت موجود تھی، فیصلہ سنانے میں دیر لگ سکتی تھی؛ کیوں کہ دونوں فریقوں کے دلائل پر غور وفکر اور نتیجے تک پہنچنے کے لئے خاصا وقت درکار تھا، چنانچہ میں نے مقدمہ سننے کے بعد اس امید میں فریقین کو واپس بھیج دیا کہ وہ باہم مصالحت کرلیں گے اور یوں ان کا مقدمہ حل ہو جائے گا، اس مدت میں دونوں فریقوں میں سے ایک کو کسی طرح معلوم ہو گیا کہ مجھے پکی ہوئی تازہ کھجوریں زیادہ مرغوب ہیں، چنانچہ اس نے بہت ہی عمدہ کھجوریں اکٹھی کیں اور میرے دربان کو بھاری رقم رشوت دے کر کھجوریں مجھ تک پہنچانے کو کہا، میں نے اتنی عمدہ کھجوریں کبھی نہیں دیکھی تھیں؛ لیکن جب دربان نے کھجور کا طبق میری خدمت میں حاضر کیا تو میں نے اسے کو ڈانٹ ڈپٹ کر طبق واپس کروا دیا، دوسرے دن جب دونوں فریق عدالت میں حاضر ہوئے تو وہ دونوں میری نگاہ میں یکساں نظر آرہے تھے۔"فھذا یا أمیر المؤمنین! ولم اقبل، فکیف یکون حالي لو قبلت "امیر المؤمنین! ہدیہ قبول نہ کرنے کے باوجود میری یہ حالت ہوگئی (کہ عدم مساوات کا تیر میری نگاہ میں چبھ گیا) پھر اگر میں نے ہدیہ قبول

کرلیا ہوں تو کیا ہوتا؟ (لامحالہ مجھے ناحق فیصلہ کرنا پڑتا)۔

امیر المؤمنین! حیلے بہانے سے شیطان میرا دین اور میری عاقبت برباد کرسکتا تھا؛ کیونکہ ہر انسان کے ساتھ شیطان لگا ہوا ہے اور لوگ اس کے پھندے میں پھنس کر تباہ وبرباد ہورہے ہیں ؛ لہٰذا اے امیر المؤمنین! آپ مجھے اس ذمہ داری سے سبکدوش کردیں، اللہ تعالی آپ کو اس کا بدلہ دے گا، مجھ سے اس سلسلے میں درگذر کریں، اللہ تعالی آپ کی مغفرت کرے گا۔(۱)

☆حجاج کے سامنے دوٹوک جواب

حجاج بن یوسف ثقفی نے ابن فجائۃ کے بھائی کو گرفتار کروایا اور کہا کہ: میں تجھے ضرور قتل کروں گا، قیدی نے عرض کیا: آخر سبب کیا ہے؟

حجاج نے کہا: تیرے بھائی قطر نے میرے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کیا تھا، قیدی نے جواب دیا، میرے پاس امیر المؤمنین کی جانب سے لکھا ہوا ورق ہے کہ میرے بھائی کی غلطی کی سزا مجھے نہیں دی جائی گی، حجاج بن یوسف بولا: لاؤ مجھے دو۔

قیدی نے کہا: میرے پاس امیر المؤمنین کے خط کے علاوہ آسمانی خط بھی ہے، پھر کہنے گا: میرے ساتھ اللہ تعالی کا یہ فرمان ہے ’’وَلَاتَـزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرِي أُخْرٰی ‘‘(۱) کوئی آدمی دوسرے کے گناہوں کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

حجاج اس کے دندان شکن جواب سے تعجب میں پڑ گیا اور اس کی راہ چھوڑ دی۔(۳)

☆عدل ہی ملک ہے:

خلیفہ منصور عباسی کے زمانے میں کسی حاکم نے ایک آدمی کی جاگیر پر ناجائز قبضہ کر لیا، وہ آدمی خلیفہ کے دربار میں شکایت لے کر گیا اور عرض کیا: اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے اے امیر المؤمنین! میں اپنی حاجت بیان کروں یا کوئی مثال دوں؟ خلیفہ نے کہا: حاجت سے پہلے کوئی مثال ہی بیان کرو۔ وہ آدمی گویا ہوا:

---

(۱) قصص العرب :۳/۷۵ (۲) الانعام : ۱۶۴

(۳) سنہرے فیصلے، عبدالمالک مجاہد:۱۲۹

بچے کو جب کسی ناپسندیدہ بات کا سامنا ہوتا ہے تو ماں سے بڑھ کر کوئی دوسرا اس کا مددگار نہیں ہوتا، جب کچھ ہوش مند ہوتا ہے تو اپنے باپ سے شکایت کرتا ہے؛ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ ماں سے زیادہ اس کا باپ اس کا مددگار ہوسکتا ہے، پھر جب جوان ہوجاتا ہے تو اپنی شکایت حاکم کے پاس لے جاتا ہے؛ کیوں کہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ باپ کے مقابلے میں حاکم زیادہ طاقت ور ہے، پھر جب اس کی عقل میں اضافہ ہوتا ہے تو اپنا مسئلہ سلطان کے دربار میں پیش کرتا ہے؛ کیوں کہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان سب لوگوں سے زیادہ طاقت ور ہے؛ لیکن جب اسے بادشاہ کے دربار میں بھی انصاف نہیں ملتا تو پھر اللہ تعالیٰ کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔

مجھے بھی ایک مصیبت آپڑی ہے اور شکایت لے کر آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں، مجھے معلوم ہے کہ آپ سے زیادہ طاقت ور اس روئے زمین پر کوئی نہیں، اگر آپ نے میرے ساتھ انصاف کردیا تو ٹھیک ورنہ میں انصاف کے لئے اللہ تعالیٰ کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا، خلیفہ منصور نے کہا: ہم تمہارے ساتھ انصاف ہی کریں گے، اس نے بتایا کہ آپ کے فلاں حاکم نے میری زمین پر ناجائز قبضہ کرلیا ہے، خلیفہ نے اپنے حاکم کو جاگیر واپس کرنے کا حکم دیا اور اس کو لکھا کہ اس آدمی کے لئے اسبابِ راحت مہیا کرو اور اس کی معیشت کو تشفی بخش بناؤ۔(۱)

☆ حاکم وقت گواہی مسترد

قسطنطنیہ کی سلطنت عثمانیہ کا دار الحکومت، آج کا استنبول ہے، جہاں عدالت لگی ہوئی ہے، قاضی شمس الدین محمد حمزہ عدالت کی کرسی پر براجمان ہیں، مقدمہ پیش ہوا، قاضی نے گواہان کی فہرست دیکھی، اس کے اندر حاکم وقت سلطان بایزید کا نام بھی شامل ہے، سامنے دیکھا تو وہ گواہوں کے کٹھرے میں کھڑا ہے۔

اچانک قاضی نے فیصلہ سنایا، سلطان بایزید کی گواہی کو مسترد کیا جاتا ہے؛ کیونکہ گواہ قابل اعتبار نہیں، عدالت میں سناٹا چھا گیا، حاکم وقت کی گواہی ناقابل قبول، لوگ

(۱) سنہرے فیصلے:۱۶۱

حیران وششدر رہ گئے۔سلطان بایزید نے آگے بڑھ کر قاضی کو مخاطب کیا، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ مجھے گواہی کے قابل کیوں نہیں سمجھا گیا؟ قاضی نے حاکم کی حیثیت اور ہیبت کونظرانداز کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا، ”گواہ باجماعت نماز ادانہیں کرتا؛اس لئے اس کی گواہی نا قابل قبول ہے“ قاضی نے حاکم وقت کی گواہی کو مسترد کرکے اسلام کے عدالتی نظام کے وقار کو مزید جلا بخشی اور ثابت کردیا کہ کرسی عدالت پر بیٹھ کر چھوٹے اور بڑے میں تمیز نہیں کی جاسکتی۔

حاکم نے فیصلہ سنا اور اس کے سامنے گردن جھکادی، اپنی کمزوری کا اعتراف کیا، حکم دیا کہ فی الفور میرے محل کے سامنے ایک خوبصورت مسجد بنائی جائے۔اس مسجد کی اگلی صف اپنے لئے مخصوص کی اور اس کے بعد نماز باجماعت سے غفلت کا کبھی مرتکب نہیں ہوا۔

☆غصے میں فیصلہ نہ کریں

موسیٰ بن اسحاق نیشاپور اور اہواز میں قاضی رہے، یہ بہت فصیح اللسان اور متبحر عالم تھے؛ مگر انہیں کبھی مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا گیا، ایک مرتبہ ایک خاتون ان کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہنے لگی۔”قاضی صاحب! آپ کے لئے دو آدمیوں کے درمیان غصے کی حالت میں فیصلہ کرنا جائز نہیں۔قاضی صاحب نے پوچھا: کیوں؟ خاتون نے عرض کیا؛ کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے” لا یقضی القاضی بین اثنین وھو غصبان “قاضی غصے کی حالت میں دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ نہ کرے، یہ سن کر قاضی موسیٰ بن اسحاق مسکرانے لگے۔(۱)

☆ایک چوکیدار کی فرض شناشی

ابوالعباس سفاح کا ولی عہد اس کا بھائی ابوجعفر منصور تھا، جب وہ طلبِ علم کے لئے ادھرادھر پھرا کرتا تھا تو ایک دن ایک منزل پر اترا جہاں ہر آدمی سے دو درہم محصول لیا جاتا تھا، چوکیدار نے کہا: جب تک آپ محصول ادا نہ کریں گے، یہاں قیام پذیر نہیں ہوسکتے، منصور نے کہا: میں بنوہاشم میں سے ہوں اور ابوالعباس کا بھائی ہوں، محصول سے

(۱) کتاب الأذکیاء :۲۴۵

در گذر کرو، اس نے کہا: حکمِ حاکم سے مجبور ہوں، منصور نے کہا: رسول اللہ ﷺ کے چچا کے بیٹوں میں سے ہوں، چوکیدار نے کہا: جو آئین ہے اس کے خلاف کس طرح عمل کر سکتا ہوں؟ منصور نے کہا: میں قرآن مجید جانتا ہوں، عالم، فقیہ اور ماہر فرائض ہوں، دو درہم کیا میں ہزار ہزار درہم کا ایک نکتہ بیان کروں گا، چوکیدار نے کہا: یہ سب صحیح ہے؛ لیکن آئین سلطنت میں کسی کے ساتھ رواداری نہیں ہے، اس لئے مجھے اس معاملے میں معذور سمجھو۔

ایک ادنی چوکیدار اپنے فرائض کی بجا آوری میں اس شخص کا جو بنو ہاشم میں سے ہے، عالم اور فقہیہ ہے اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد خلیفہ بننے والا ہے، کوئی لحاظ نہیں کرتا۔(۱)

☆ سلطان محمود کا بے مثال انصاف:

سلطان محمود ہندوستان کا ایک نامور بادشاہ گذرا ہے، اس کا ایک بھانجا تھا، اس کا ایک شادی شدہ عورت سے ناجائز تعلق تھا، اس کے خاوند نے بہت داد فریاد کی؛ لیکن کسی نے نہ سنی، قاضی، وزیر اور امیر کوئی بھی شہزادے کے مقابلے میں اس غریب کی نہ سنتا تھا، آخر وہ شخص جرأت و ہمت کر کے خود سلطان تک پہنچا اور نہایت دلیری سے اپنے دکھ درد کی تمام داستان بیان کی، سلطان نے اس کو اطمینان دلایا اور کہا: میں تمہارا انصاف کروں گا؛ مگر اس راز سے کسی کو آگاہ نہ کرو اور اگر وہ پھر تمہارے مکان پر آئے تو سیدھے میرے پاس پہنچو۔

بادشاہ نے دربانوں کو بھی تاکید کر دی کہ جب یہ شخص آئے تو فوراً مجھے خبر کر دو، خواہ میں کسی بھی حال میں ہوں، غرض جب شہزادہ حسب عادت گیا اور اس شخص کو اس کے مکان سے باہر نکال کر اس کی بیوی کے پاس جا بیٹھا تو اس نے سلطان کو خبر کر دی، سلطان خود آیا اور سارا ماجرا اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اپنے بھانجے کا سر تلوار کے ایک ہی وار سے الگ کر دیا اور تھوڑے وقفے کے بعد پانی مانگا اور دو نفل ادا کئے۔(۲)

---

(۱) سنہرے فیصلے ۲۰۵

(۲) انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم: ۱/۹۷-۸۰، سنہرے فیصلے: ۲۴۲

☆بادشاہ کا بہنوئی قید خانے میں:

سیف الدین نامی ایک عرب امیر ہندوستان کے ایک بادشاہ کے پاس آیا، اس کی نہ صرف مہمان نوازی اور خاطر داری کی ؛ بلکہ کچھ عرصے کے بعد بادشاہ نے اپنی بہن فیروزہ کی شادی اس غریب الدیار امیر کے ساتھ کردی، شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی اور بادشاہ نے اسے جاگیر میں گجرات اور کھمبایت (جوناگڈھ رن کچھ وغیرہ) کے علاقے دیئے؛ لیکن اس بدّو نے اس نعمت عظمی کی قدر نہ کی، بیس دن کے بعد جب محل شاہی میں جانے لگا تو بلا اطلاع اندر جانے کا قصد کیا کہ میں بادشاہ کا بہنوئی ہوں، میرے لئے ادب اور اطلاع کوئی معنی نہیں رکھتے، دربان نے منع کیا تو دربان کے سر کے بال پکڑ کر باہر گھسیٹا، امیر نے دربان کو زور سے لاٹھی رسید کی حتی کہ خون نکل آیا، دربان اسی عالم میں بادشاہ کے پاس آیا اور سارا واقعہ بیان کیا، بادشاہ تھوڑی دیر تک عالم سکوت میں رہا اور کہا یہ جرم ایسا سنگین ہے کہ بادشاہ بھی معاف نہیں کرسکتا، قاضی کے پاس جاؤ اور اپنا مقدمہ پیش کرو، قاضی کمال الدین شہر کے رئیس القضاۃ تھے، ان کے پاس مقدمہ گیا، انہوں نے ساری کیفیت سنی اور چونکہ امیر سیف الدین کو اپنے فعل سے انکار نہ تھا، اس لئے اسے رات بھر قید میں رکھا، شہزادی فیروزہ جو امیر کی بیوی اور بادشاہ کی بہن تھی، بھائی کے خوف سے قید خانے میں بچھونا اور کھانا تک نہ بھیجا، دوسرے دن دوپہر کو قاضی نے اس کی رہائی کا حکم دیا۔(۱)

☆بادشاہ کے سامنے ایک بیوہ کی بے باکی:

سلطان ملک شاہ سلجوقی ایک مرتبہ اصفہان کے جنگل میں شکار کھیل رہا تھا، کسی گاؤں میں قیام ہوا، وہاں ایک غریب بیوہ کی گائے تھی جس کے دودھ سے اس کے تین بچوں کی پرورش ہوتی تھی، سلطان کے لشکریوں نے اس گائے کو ذبح کرکے خوب کباب اڑائے، غریب بڑھیا کو خبر ہوئی تو وہ بدحواس ہوگئی، لشکریوں کے اس نامناسب فعل پر کوئی روک ٹوک کرنے والا نہ تھا، ان کے آگے کوئی لاوارث بیوہ کی فریاد سننے کو تیار نہ تھا، ساری

(۱) تاریخ دہلی: ۲/۱۷۱، سنہرے فیصلے: ۲/۱۷۱

رات اس نے پریشانی میں کاٹی۔

صبح ہوئی، دل میں خیال آیا کہ کوئی نہیں سنتا تو نہ سے، کیا بادشاہ بھی نہ سنے گا جس کو اللہ نے غریبوں کو ظالموں سے نجات دینے کے لئے اتنی بڑی سلطنت دی ہے؟ بادشاہ تک پہنچنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی، معلوم ہوا کہ بادشاہ فلاں راستے سے شکار کو نکلے گا، چنانچہ اصفہان کے مشہور نہر کے پل پر جا کر کھڑی ہوگئی، جب سلطان پل پر آیا تو بڑھیا نے ہمت اور جرأت سے کام لے کر کہا:

اے الپ ارسلان کے بیٹے! میرا انصاف اس نہر کے پل پر کرے گا یا پل صراط پر؟ جو جگہ پسند ہو انتخاب کرلے، بادشاہ کے ہمراہی یہ بے باکی دیکھ کر حیرت زدہ ہوگئے، بادشاہ گھوڑے سے اتر پڑا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس عجیب وغریب اور حیرت انگیز سوال کا اس پر خاص اثر ہوا ہے، بڑھیا سے کہا: پل صراط کی طاقت نہیں ہے، میں اسی جگہ فیصلہ کرنا چاہتا ہوں، کہو کیا کہتی ہے، بڑھیا نے اپنا سارا قصہ بیان کیا، بادشاہ نے لشکریوں کی اس ظالمانہ حرکت پر افسوس کا اظہار کیا اور ایک گائے کے عوض اس کو ستر گائیں دلائیں اور مالا مال کر دیا اور جب اس بڑھیا نے کہا: تمہارے عدل وانصاف سے میں خوش ہوں اور میرا اللہ خوش ہے، تب وہ گھوڑے پر سوار ہوا۔(۱)

☆ بادشاہ کو کوئی گواہ نہیں مل سکا

قاضی ابو حازم (یہ بغداد کے قاضی تھے، ۳۱۶ھ میں وفات ہوئی) کو ایک مرتبہ خلیفہ معتضد باللہ (۲۷۹ھ-۲۸۹ھ) نے پیغام بھیجا کہ فلاں شخص کی طرف جس پر کئی لوگوں نے دعوی کر کے اپنا اپنا مال لے لیا ہے، میرا بھی کچھ مال نکلتا ہے، مجھے بھی مدعی سمجھئے اور میرے دعوے پر غور کر کے میرا حصہ بھی مجھے دلوائیے۔

قاضی نے جواب میں کہلا بھیجا کہ قضا کی ذمہ داری میری گردن پر ڈال کر اب آپ یہ فرماتے ہیں کہ بغیر گواہوں کے آپ کے دعوے کو مان لیں، یہ کس طرح ہوسکتا ہے؟ آپ گواہ پیش کیجئے؟

(۱) سنہرے فیصلے: ۲۶۳

خلیفہ نے کہلا بھیجا کہ فلاں اور فلاں میرے دو معزز گواہ ہیں، قاضی نے جواب دیا: وہ گواہ آپ کے نزدیک معزز ہوں گے؛ تاہم جب تک میں یہ نہ دیکھ لوں کہ بموجب احکام شرع وہ شہادت کے قابل ہیں، آپ کے دعوے کو نہیں مان لیتا، نہ ان کی شہادت قبول کر سکتا ہوں، خطیب بغدادی، ابن عساکر نے ابوالحسین الخصیبی سے اس سلسلے میں جو الفاظ نقل کئے ہیں وہ یہ ہیں: "فإن زُكيّا قبلتُ شهادتهما وإلا أمضيت ما قد ثبت عندي" وہ دونوں گواہ آکر میرے پاس شہادت دیں، میں ان کی تفتیش کروں گا، اگر وہ شہادت کے قابل ہوئے تو میں ان کی شہادت قبول کروں گا بصورت دیگر میں ثابت شدہ مقدمہ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔

خلیفہ کے گواہوں نے جب سنا کہ عدالت میں ہم پر خوب جرح ہونے والی ہے تو انہوں نے شہادت دینے سے انکار کر دیا اور قاضی ابو حازم نے خلیفہ کے مقدمے کو خارج کر دیا اور خلیفہ کو کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔(۱)

☆ جھوٹا مقدمہ

مروان بن حکم کے دور خلافت میں اروی بنت اویس نامی خاتون نے حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ پر مقدمہ دائر کیا، حضرت سعید رضی اللہ عنہ عشرہ مبشرہ میں سے تھے، مقدمہ یہ تھا کہ انہوں نے اروی کی زمین کے ایک ٹکڑے پر ناجائز قبضہ کر لیا ہے، مقدمہ مرواو کے پاس گیا، اس نے نہایت عزت واحترام کے ساتھ حضرت سعید رضی اللہ عنہ کو بلوایا، یہ اس وقت خاصے بوڑھے ہو چکے تھے، مقدمہ پیش ہوا تو انہوں نے کہا کہ: میں اس کی زمین پر کیسے قبضہ کر سکتا ہوں جب کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنا ہے کہ۔

مروان کہنے لگا: اے صحابی رسول رضی اللہ عنہ! آپ بتایئے کہ آپ نے کیا سنا ہے؟ کہنے لگ:: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "من أخذ شبرا من الأرض ظلما يُطوقه يوم القيامة من سبع أرضين"، جس شخص نے کسی کی بالشت برابر زمین بھی ظلم سے قبضہ کی تو قیامت کے دن ساتوں زمینوں کو طوق بنا کر اس کے گلے میں ڈال دیا جائے گا۔

(۱) تاریخ الخلفاء، جلال الدین السیوطی :۳۲۳، مکتبۃ السعادۃ، مصر

مروان نے کہا: اس حدیث کے سننے کے بعد کسی دلیل، گواہ یا حجت کی کوئی ضرورت نہیں، مقدمہ خارج کر دیا اور فیصلہ دیا کہ سعید پر ناجائز مقدمہ بنایا گیا ہے، جس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ سعید رضی اللہ عنہ صحابی رسول تھے، ان کی عمر کے اس حصے میں اہانت ہوئی تھی اور انہیں عدالت میں طلب کیا گیا تھا، ہاتھوں کو آسمانوں کی طرف اٹھا کر فرمایا: "اللھم إن کانت کاذبة فعم بصرھا واقتلھا فی أرضھا" اے اللہ! اگر یہ عورت جھوٹی ہے تو اس کو اندھی کر دے اور اس کو اسی کی زمین میں ہلاک کر دے، چنانچہ مرنے سے پہلے وہ عورت اندھی ہوگئی، ایک دن اپنی زمین میں پھر رہی تھی کہ اچانک ایک گڑھے میں گر کر مرگئی۔(۱)

رعایا کی مصلحت کے لئے بیٹے کی قربانی!

عبداللہ کے بعد ۹۱۲ء میں اس کا پوتا عبدالرحمٰن سوم ہسپانیہ کا حکمران ہوا، خلیفہ عبدالرحمٰن کے دو بیٹے تھے، الحکم اور عبداللہ، دونوں قابل اور ممتاز تھے؛ لیکن بادشاہ نے الحکم کو اپنا ولی عہد قرار دیا۔

ابن عبدالدار، عبداللہ کا ایک اولوالعزم رفیق تھا، اس کو خلیفہ سے اس امر کی شکایت تھی کہ اس نے اسے قاضی القضاۃ کا عہدہ نہیں دیا تھا، عبدالدار نے عبداللہ کو بہکایا اور اسے بغاوت پر آمادہ کیا، چنانچہ ایک نحس ساعت میں خلیفہ اور الحکم دونوں کو قتل کرنے کی خوفناک سازش کی گئی، عبدالرحمٰن کو بھی خبر ہوگئی، اس نے ایک معتبر سردار کو کافی فوج کے ساتھ روانہ کیا، شہزادہ اپنے رفیق عبدالدار کے ساتھ گرفتار کرلیا گیا، جب خلیفہ کے سامنے پیش ہوا تو اس سے پوچھا:

کیا اس وجہ سے آزردہ ہو کہ تم خلیفہ نہیں ہو؟ شہزادے نے کوئی جواب نہ دیا؛ لیکن اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، بادشاہ کے حکم سے دونوں الگ الگ کمروں میں بند کر دیئے گئے، عبدالدار اسی رات خودکشی کر کے مرگیا۔

ادھر شہزادہ عبداللہ بن عبدالرحمٰن کے بارے میں اس کے اپنے باپ نے فیصلہ دیا

---

(۱) سنہرے فیصلے: ۲۸۶

کہ اسے قتل کر دیا جائے، جب عبداللہ کے قتل کا فیصلہ ہوا تو اس کے بھائی الحکم نے جو ولی عہد تھا اور اپنے بھائی سے بڑی محبت رکھتا تھا، رحم کی سفارش کی، بادشاہ نے سفارش نامنظور کی اور اپنا تاریخی فیصلہ کچھ اس طرح سنایا: تمہاری سفارش اور التجا بجا ہے، میں بھی یہی چاہتا ہوں اور اس کی موت کو ٹھنڈے دل سے دیکھنا گوارہ نہیں کرتا؛ لیکن میں خلیفہ ہوں، مجھے آئندہ کا خیال بھی رہنا چاہئے، اس کے دل کی خلش کبھی نہ جائے گی، میرے بعد تم دونوں ہمیشہ لڑتے رہو گے، تم دونوں کا انجام تو جو ہو سو ہو؛ لیکن رعایا تباہ و برباد ہو جائے گی، کتنی مائیں اپنے بچوں کو روئیں گی، کتنی عورتیں بیوہ ہوں گی اور کتنے بچے یتیم ہو جائیں گے، ملک میں قحط سالی اور فصلوں کی تباہی دائمی بدامنی پیدا کر دے گی، جب ان باتوں کی طرف میرا خیال جاتا ہے تو کانپ اٹھتا ہوں، اس لئے ہزارہا لوگوں کو بے خانماں، ہزاروں عورتوں کو بیوہ اور ہزاروں بچوں کو یتیم کرنے کے بجائے بہتر ہے ایک ہی شخص کا جو بانیٔ فساد ہے، خاتمہ کر دیا جائے۔

میں اپنے اس نوجوان فرزند کو بہت روؤں گا اور جب تک زندگی ہے روتا رہوں گا؛ لیکن اے الحکم! نہ تمہارے آنسو، نہ میرا رونا اور نہ میرے تمام خاندان کی سفارشیں میرے اس بدقسمت بیٹے کو اس صریح جرم کی سزایابی سے بچا سکتی ہیں۔ چنانچہ عبداللہ اسی شب کو قتل کر دیا گیا اور دوسرے دن اپنے خاندانی قبرستان میں دفن ہوا، یہ واقعہ ۹۴۹ء کا ہے۔(۱)

☆ ایک بیوہ کی آزادانہ فریاد:

دولت عباسیہ کا تاجدار مامون الرشید جس نے نوشیرواں کے عدل اور حاتم کی سخاوت کی یاد تازہ کر دی تھی سلطنت بغداد پر جلوہ افروز ہے، شہزادہ عباس، مامون الرشید کا بڑا لڑکا طائفۃ النمل کے قریب شکار میں مصروف تھا کہ اس کی نظر ایک حسین وجمیل، خوبرو عورت پر پڑی جو ایک چشمے سے پانی کا گھڑا بھر رہی تھی۔ اس نے اس عورت سے مخاطب ہو کر کہا: تو کون ہے اور کس خاندان سے تعلق رکھتی ہے، کیا ایسے غیر آباد مقامات پر بھی جہاں پہاڑ اور جنگلوں کے سوا کچھ نہیں ہے، حسن جنم لے سکتا ہے؟ شہزادہ کی بات پر غیور

---

(۱) سنہرے فیصلے: ۳۰۰

عورت کے تیور بدل گئے، اس کا چہرہ غصہ سے تمتما گیا، چنانچہ اس نے سپاہیوں سے کہا کہ اس عورت کا حسب نسب معلوم کر کے اس کو میری جانب سے پیغام نکاح دو، چنانچہ سپاہی حکم کی تعمیل میں عورت کے حسب ونسب کا پتہ کر آئے کہ عورت خاندان برامکہ سے تعلق رکھتی ہے، نام مغیرہ بنت ازار ہے، وہ دو بچوں کی ماں اور حسین بن موسیٰ کی بیوہ ہے، اس کے عزیز واقارب میں سے اب کوئی زندہ نہیں ہے، صرف دو معصوم بچے ہیں، نکاح کا پیغام اس عورت کے لئے قیامت سے کم نہ تھا، وہ آپے سے باہر ہوگئی، کہنے لگی: ہارون ہماری جانیں تباہ کر چکا ہے، اب مامون ہماری عزت کے درپے ہے، لیکن عباس یاد رکھے کہ اس کی شہزادگی کو اس ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی کی دہلیز پر دونوں ہاتھوں سے مسل دوں گی۔ چنانچہ عباس نے اس عورت کو دو گھنٹے کی مہلت دے کر اس کو گھر سے نکل جانے کو کہا، مغیرہ یہ پیغام سن کر دروازے پر آئی اور قاصد سے کہا: عباس اس وقت کو بھول جائے جب میرے دادا جعفر کا سرا کے دادا ہارون کے سامنے رکھا گیا اور اس بے گناہ قتل نے آلِ برامکہ کو دو، دو دانوں کو محتاج کر دیا؛ لیکن برمکی بیبیاں عباسی مظالم کو جس تحمل سے برداشت کرتی آئی ہیں، تاریخ اس کو فراموش نہیں کر سکتی، اتنا کہہ کر مغیرہ ایک سفید چادر سر پر ڈال کر دونوں بچوں کو ساتھ لے کر باہر چلی گئی۔

ایک طویل مدت کے بعد یہ مغیرہ جس پر کہ ضعیفی کے آثار نمایاں ہو چکے تھے مامون کے دربار میں حاضر ہوئی اور کہا کہ ایک بیوہ کا مکان صرف اس لئے کہ وہ اپنی عصمت کی محافظ تھی، سلطنت عباسیہ کو مبارک ہو؛ لیکن مامون الرشید! ایک دن اس بادشاہ کو بھی منہ دکھانا ہے جس کی سلطنت کبھی فنا نہ ہوگی، ایک ظالم کے خلاف تیرے پاس فریاد لائی ہوں، انصاف کر اور داد دے، مامون الرشید نے عورت سے کہا: اس ظالم کا نام بتا کہ وہ کون ہے؟ عورت نے ہنس کر کہا: شہزادہ عباس جو تخت شاہی پر آپ کے برابر بیٹھا ہے، مامون کا چہرہ اتنا سنتے ہی غصے سے سرخ ہو گیا، اس نے چوبدار کو حکم دیا کہ عباس کو اس عورت کے برابر کھڑا کر دے؛ تاکہ مدعی اور مدعا علیہ میں کوئی امتیاز نہ رہے، شہزادہ عباس خاموش تھا اور ہر سوال کے جواب میں رک رک کر ایک آدھ بات کہہ دیتا، مغیرہ دھڑلے سے اپنی داستان سنائے

جارہی تھی، اس نے کہا: ’’عباس! یہ صحیح ہے کہ تو مامون الرشید کا لڑکا اور سلطنت کا مالک ہے؛ لیکن یہ ہاتھ منتظر تھے اس وقت کے کہ اگر تو اپنی دھن میں آگے بڑھ کر میرے قریب پہنچتا تو تیری گردن مروڑ کر رکھ دیتے، آلِ برامکہ کی دولت عباسیوں نے پامال کردی؛ مگر ہماری عصمت وہ دولت ہے کہ ہم عباسیوں کو اس پر قربان کردیں گے‘‘۔

وزرائے سلطنت مغیرہ کی جرأت پر متعجب ہوئے اور کہا: یہ بے باکی آدابِ شاہی کے خلاف ہے، ادب سے گفتگو کرو، مامون نے کہا: اس کو مت روکو، یہ حق رکھتی ہے کہ جو کچھ اس کے منہ میں آئے کہے، یہ صرف اس کی صداقت ہے جس نے اس کی زبان کو تیز اور اس کے حوصلے بلند کردیا ہے اور عباس کی کمزوری ہے جس نے اس کو گونگا کردیا ہے۔

اسی وقت پانچ تھیلیاں اشرفیوں سے بھری ہوئی اہل کاروں سے لے کر مامون الرشید نے مفیدہ کے قدموں میں ڈال دیں اور نہ صرف اس کا مکان واپس کیا؛ بلکہ ایک عالی شان محل ’’قصر عباس‘‘ مغیرہ کو عطا فرما کر درخواست کی کہ وہ شہزادے کا قصور معاف کردے۔(۱)

(۱) سنہرے فیصلے: ۲۱۰
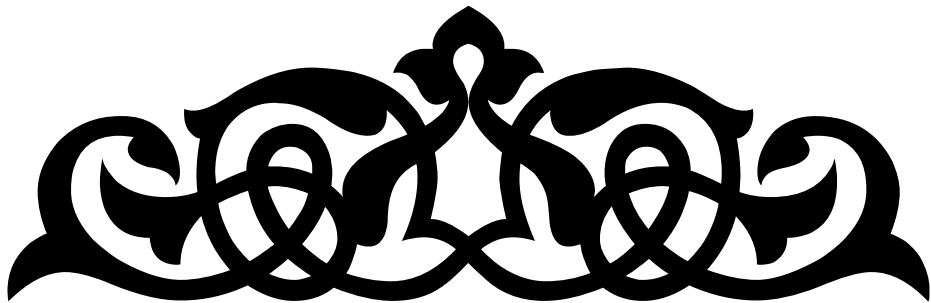
علم فلکیات میں مسلمانوں کے کارنامے

۱۔ ابواسحاق ابراہیم بن جندب: ۱۵۷ھ/۷۷۶ء

ابراہیم بن جندب اجرامِ فلکی کے مشاہدے میں مہارت رکھتا تھا، اس نے فلکیات (Astronomy) میں تحقیقات کیں، علمِ نجوم میں بھی ماہر تھا اور ایک صناع بھی تھا، چنانچہ اجرامِ فلکی کے مشاہدے کے لئے اس نے اپنے ذہن و دماغ سے ایک آلہ ''اصطرلاب'' ایجاد کیا، اس کے ذریعہ فاصلہ کی پیمائش بھی کی جاسکتی تھی۔

یہ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا، بغداد میں تعلیم حاصل کی، آٹھویں صدی عیسوی میں سلطنتِ عباسیہ کے قیام کے بعد علمِ ہیئت کی تحقیق ومطالعہ کا آغاز کیا، خلیفہ منصور اور خلیفہ ہارون رشید نے علوم وفنون کی طرف پوری توجہ کی۔

علمی خدمات اور کارنامے

ابراہیم بن جندب نے علمِ ہیئت کے مطالعہ کے ذریعے اجرامِ فلکی کا مشاہدہ کیا، جلدی ہی وہ فلکیات (Astronomy) میں مشاہدے کے ذریعے نئ نئ تحقیقات کرنے لگا۔

وہ دنیا کا پہلا عالی دماغ نجومی (astrologer) تھا، ماہر صناع میکانک (mechanice) ہونے کے سبب اس نے چاند تاروں اور اجرامِ فلکی کے صحیح مشاہدے کے لئے ایک نیا آلہ ایجاد کیا۔ اس انوکھے آلہ کو ''اصطرلاب'' کا نام دیا گیا۔

یہ حقیقت ہے کہ دوربیں کا موجد ابراہیم بن جندب تھا، جس کے جدت پسند دماغ نے مشاہدات فلکی کی ضرورت کے پیشِ نظر ''اصطرلاب'' ایجاد کیا، جو مدتوں آبزوویٹروں میں رائج رہی، گیارہویں صدی عیسوی میں ہسپانیہ کا نامور سائنس داں ابواسحاق بن یحی

نقاش الزرقانی نے اس ''اصطرلاب'' کو مزید ترقی دی، اس نئی ایجاد کا نام صحیفۂ زرقانیہ رکھا جو بعد میں (sphacia) کے نام سے یورپ کے آبزورویٹروں میں مدتوں استعمال ہوتی رہی، آج اہلِ مغرب گلیلو (اٹلی ۱۵۶۴ء-۱۶۴۲ء) کو دوربین کا موجد کہتے ہیں، جس نے اصطرلاب کو ترقی دے کر نئی شکل دی۔

''اصطرلاب'' ایک قسم کی دوربین (telescope) تھی، اس دوربین کے ذریعہ بآسانی چاندتاروں کا مشاہدہ کیا جاسکتا تھا اوران کے فاصلے کی پیمائش کی جاسکتی تھی۔

اصطرلاب کی بناوٹ اس طرح تھی کہ اس کی دو نلکیاں تھیں، ایک نلکی اپنی جگہ پر نصب یعنی فٹ رہتی تھی اور دوسری نلکی اوپر کی جانب جاسکتی تھی اور دائیں بائیں حرکت کر سکتی تھی، یہ نلکیاں ایک اونچے (stand) یعنی تپائی پر لگادی گئی تھیں، عجائباتِ فلک کے مشاہدے کے لئے یہ سیدھی سادی دوربین تھی۔ ا)

حقیقت یہ ہے کہ اس دوربین کا موجد ابراہیم بن جندب تھا، اس لئے جدت پسند دماغ نے ضرورت سے مجبور ہوکر ایک نئی چیز بنائی اوراس سے فائدہ اٹھایا۔

گلیلیو (اٹلی ۱۵۶۴ء-۱۶۴۲ء) جس کو دوربین کا موجد کہا جاتا ہے، اس نے اس تصور کو لیا اور اصطرلاب کو ترقی دے کر ایک ایسا آلہ بنایا جس میں دیگر سہولتیں پیدا کر دی تھیں۔(۲)

۲۔ عباس بن سعید الجوہری: ۲۲۹ھ/۸۴۷ء

عباس بن سعید الجوہری مامون الرشید کا غلام تھا، مامون اس کو بہت چاہتا تھا اوراپنے پاس رکھتا تھا، الجوہری نے علمِ ہیئت میں مہارت پیدا کر لی تھی، اس لئے اپنے مالک کو ایک رصد گاہ تعمیر کرنے پر آمادہ کیا، مامون نے اس کی خواہش کے مطابق دو رصدگاہیں تعمیر کرادیں جس کے منتظم یحیٰ منصور تھے۔

مامون نے عباس کو آزاد کر دیا تھا، مگر اس نے اپنے آپ کو مامون سے علاحدہ کرنا پسند نہیں کیا اور پوری زندگی شاہی محل میں گذاردی، اور یہ مامون کے مقربین میں سے تھا۔

---

(۱) مسلمان سائنسداں اوران کے خدمات: ۱۷۱ (۲) ۱۰۰ عظیم مسلم سائنسداں: ۲۴

اس نے ہی رصدگاہ کے لئے آلات کی صنعت پر توجہ کی اور اس نے آلات تیار کئے اور آلاتِ رصدیہ کی صنعت میں کمال پیدا کیا۔

مامون الرشید کے حکم سے دو رصدگاہیں ایک بغداد میں ''شماسیہ'' کے مقام پر، دوسرے ملک شام میں ''دمشق'' کے قریب ''قاسیون'' میں تعمیر ہوئیں، دونوں رصدگاہوں کے لئے آلات رصدیہ کو لقب کرنا اور ان کی دیکھ بھال الجوہری کے ذمہ تھا، الجوہری تعمیرات کا نگراں بھی تھا۔(۱)

۳۔ علی بن عیسی اصطرلابی ۲۲۴ھ-۸۶۴ء

علمِ ہیئت کا ماہر اور ہونہار صناع تھا، زمین سے اجرامِ فلکی یعنی چاند، تاروں اور سورج کے درمیان کا فاصلہ کتنا ہوگا، اس کی پیمائش کا طریقہ ایجاد کیا، اور آلۂ سدس (sextant) تیار کیا جس سے کم سے کم فاصلہ معلوم کیا جاسکتا ہے، یہ کمپاس کی شکل کا دائرہ نما ایک آلہ ہے اور آج بھی زیرِ استعمال ہے اسے ورنیئر اسکیل (Vernier scale) کہتے ہیں، اہلِ یورپ نے سولہویں صدی میں یہ آلہ تیار کیا، ۸۶۴ء میں وفات پائی۔

علمی خدمات اور کارنامے

علی بن عیسی اصطرلابی علمِ ہندسہ (جامیٹری) سے خصوصی لگاؤ رکھتا تھا، اس نے مشاہدے اور تجربہ کے بعد یہ معلوم کرنا چاہا کہ ستاروں کے درمیان کتنا فاصلہ ہوگا اور ان کے اجرامِ فلکی کا زمین سے کتنا فاصلہ ہوگا۔

چنانچہ اس نے بڑی دماغی کاوش کے بعد سدس (sex tant) ایجاد کیا، سدس کمپاس ہی کی شکل کا دائرہ نما آلہ ہوتا ہے، اس پر زاویے اور درجے بنے ہوئے ہوتے ہیں، اس میں درجو، سے نیچے منٹوں تک زاویئے کی پیمائش کی جاسکتی ہے، یہ بہت نازک کام ہوتا ہے۔ یہ آلہ اصطرلاب میں نصب ہوتا ہے، چوں کہ اصطرلاب کی صنعت میں کافی ماہر تھا، اس لئے اصطرلابی کے لقب سے مشہور ہوا۔

اجرامِ فلکی کی تحقیق کرنے والا دوربین سے دیکھتا ہے اور سدس سے فاصلہ معلوم

(۱) معجم علماء العرب والمسلمین: ۱۴۴

کرتا ہے، موجودہ زمانے میں یہ کام ورنیئر اسکیل (Vernier scale) سے لیا جاتا ہے، ورنیئر سے کم سے کم فاصلہ معلوم کر سکتے ہیں، اوراس کی پیمائش کر سکتے ہیں، ورنیز کو ایک فرانسیسی انجنیئر اصطرلابی کے صدیوں کے بعد یعنی سولہویں صدی میں ایجاد کیا تھا۔(۱)

۴۔جابر بن سنان حرانی ۲۶۱ھ/۹۲۵ء

جابر بن سنان حرانی مشاہدۂ افلاک سے بڑی دلچسپی رکھتا تھا، وہ ایک اچھا صناع بھی تھا، مشاہدۂ افلاک کے سلسلے میں اس نے آلاتِ رصدیہ تیار کیے، اس نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا جس کے ذریعہ مشاہدہ کے وقت فاصلہ معلوم کیا جاسکتا تھا، یہ آلہ کروی اصطرلاب کے نام سے موسوم ہے(Spherical Astolaber)

جابر بن سنان حران کا باشندہ تھا، اپنے وطن میں تعلیم پائی اور مطالعہ میں مصروف ہو گیا، آلات رصدیہ سے اسے لگاؤ تھا، وہ بغداد آ گیا اور پوری زندگی یہیں گذاری، یہاں اس کے خاندان نے کافی علمی کام کیے اور شہرت حاصل کی۔

علمی خدمات اور کارنامے

جابر ایک ہوشیار صناع اور آلاتِ رصدیہ کا ماہر تھا،علمِ ہیئت پر اس نے کافی کام کیے، مشاہدہ افلاک میں جو دقتیں پیش آتی تھیں، جابر نے ان کے حل کی تلاش میں رہتا تھا، آخر بڑی کدو کاوش اور تجربے کے بعد ایک آلہ ایجاد کیا جس کے ذریعہ فاصلہ کی صحیح صحیح پیمائش کی جاسکے، اس مفید آلہ کا نام اصطرلاب (Spherical Astrolober) رکھا، کروی اصطرلاب میں یہ کمالِ صناعی تھی کہ زاویئے کی پیمائش منٹوں میں کی جاسکتی تھی۔

۵۔ابوعبیداللہ محمد بن جابر البنانی ۳۰۵ھ- ۹۲۹ء

محمد بن جابر البنانی علم ہیئت کا ماہر تھا، اس عظیم ہیئت داں نے زمین کی گردش اور سورج سے متعلق تحقیق کی، اس نے بہت سی نئی نئی باتیں دریافت کیں۔

جابر البنانی بھی حران کا باشندہ تھا، ابتدائی تعلیم اپنے والد سے پائی اور پھر علم وفن کی

---

(۱) معجم علماء العرب والمسلمین :۸۱،د:محمد فارس

کتابوں کے ذریعہ مشاہدے میں مصروف ہوگیا، آخر میں وہ حران سے نکل کر بغداد کے قریب آباد ہوگیا۔

جابر نہایت ذہین تھا، ساتھ ہی محنتی اور مستقل مزاج تھا، ذہین اور محنتی جابر نے سائنس میں بڑی لگن سے کام کر کے اس فن میں کافی اضافہ کیا اور وہ بہت جلد بغداد میں اچھا ریاضی داں اور سائنسداں کی حیثیت سے مشہور ہوگیا۔

علمی خدمات اور کارنامے

جابر البنانی نے اپنی تحقیقات کا مرکز سورج اور زمین، نیز چاند اور تاروں کو بنایا، اس نے زمین کی گردش اور سورج کی رفتار سے متعلق تحقیق کی، جابر نے انحرافِ دائرۃ البروج (Inclination Of Ecliptic) کی صحیح صحیح پیمائش کی یعنی سورج کی گذرگاہ کا جھکاؤ 33,1/2 درجے نہیں ہے؛ بلکہ ۳۲ درجے اور ۳۵ منٹ ہے۔

جابر نے ثابت کیا کہ سورج کی گردش زمین کے جس مدار (Orbit) پر گھومتی ہے، وہ دائرہ کی طرح گول نہیں؛ بلکہ بیضوی شکل کا ہے، جس کے دو مرکز ہیں، سورج ان میں سے ایک مرکز پر ساکن ہے، اس وجہ سے زمین کی گردش کے دوران ایک مقام ایسا آتا ہے جہاں سورج زمین سے سب سے زیادہ فاصلہ پر آجاتا ہے۔

جابر نے علمِ ہیئت سے متعلق نقشے (Tables) تیار کئے اور ان نقشوں کے مطابق زیچ تیار کی (Astronomical Table) اسے زیچ البتّانی بھی کہتے ہیں۔

جابر علمِ ریاضی کا بھی ماہر تھا، اس نے علمِ ریاضی میں نئی نئی دریافتیں کیں، علم المثلث یعنی ٹرگنومیٹری میں اس کی دریافتیں نہایت صحیح تھیں۔

جابر نے زاویوں کے جیوب (Sinces) کا صحیح نقشہ بنایا اور دیگر نسبتوں کے ساتھ اس کے تعلق کے بارے میں بعض اہم مسافتیں دریافت کیں، اس نے زاویوں کے ظل التمام (Contangents) کے نقشے سب سے پہلے تیار کئے اور ان کو رواج دیا۔

دنیا میں تین ریاضی داں سب سے بڑے سمجھے گئے ہیں، ان میں الخوارزمی اور البنانی بھی ہے۔

جابر نے علمِ ہیئت پر اپنے تجربات اور مشاہدات کی بنیاد پر زیچ البنانی مرتب کی تھی، یہ زیچ یورپ اور جرمنی میں بار بار شائع ہوئی، زیچ البنانی کا سب سے بڑا پہلے ترجمہ ۱۱۱۳ء میں شائع ہوا تھا۔(۱)

۶۔ ابوالحسن علی بن عبدالرحمٰن یونس صوفی ۳۹۵ھ - ۱۰۰۹ء

ابن یونس صوفی عالی دماغ محقق تھا،اس کی تعلیم اور اساتذہ کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہوسکا،لیکن یہ ضرور ہے کہ اس نے تحقیق مطالعہ اور مشاہدے کے ذریعے بہت سے علمی کام انجام دئے،اس دانشور نے المعز،عزیز اور حاکم تین سلاطین کا دورِ حکومت دیکھا،اور ہر ایک کی قدردانی اور حوصلہ افزائی سے وہ مستفید ہوا۔

سائنس اکاڈیمی کے تحت قاہرہ میں ایک بلند پایہ رصدگاہ بھی قائم کی گئی تھی،اس رصدگاہ کے انتظامات نہایت باقاعدہ تھے اور ماہرین کی جماعت یہاں مطالعہ میں ہمہ وقت مصروف رہتی تھی۔

عالی دماغ ابن یونس صوفی علم ہیئت کا زبردست ماہر تھا،اس نے مطالعہ افلاک میں بڑی ہی دلچسپی لی اور اس کی بعض حیرت انگیز دریافتیں صحیح تھیں۔وہ آج بھی صحیح تسلیم کی جاتی ہیں،اور آج کے سائنسدانوں نے اسے تحسین وآفرین کہا۔

علمی خدمات اور کارنامے

ابن یونس صوفی نے مشاہدات فلکی سے جو حیرت انگیز نئی دریافتیں کیں،ان میں سے انحراف دائرۃ البروج (Inclination of the Ecliptic) کا اہم مسئلہ ہے اس نے اپنی تحقیق اور مشاہدے سے انحراف دائرہ البروج کی قیمت ۲۳ درج ۳۵ منٹ نکالی، جو آج کے دور میں دریافت شدہ قیمت کے بالکل مطابق ہے۔

ابن یونس صوفی نے اپنی تحقیق سے دوسری بات جو دریافت کی وہ یہ تھی کہ اوج شمس (Suns longitude) کا طول فلکی (longitude) (۸۶) درج اور (۱۰) منٹ قرار دیا،موجودہ زمانے کی مصدقہ قیمت بھی اسی قدر ہے۔

---

(۱) موسوعة علماء العرب والمسلمين :۸۹

تیسری اہم دریافت اس کی استقبال اعتدالین (Prectssion of Equinozts) کی صحیح صحیح قیمت معلوم کرنا ہے،اس نے استقبال اعتدالین کی صحیح صحیح قیمت (۲ء۵۱) سکنڈ (ثانیہ) سالانہ دریافت کی، استقبال اعتدالین کا مسئلہ تو کہیں زیادہ نازک ہے۔

لیکن ابن یونس صوفی کی مہارت تامہ نے اس مشکل ترین مسئلہ کو بھی حل کرلیا،موجودہ زمانے کی دریافت شدہ قیمت اس سے معمولی زیادہ ہے،یعنی (۷ء ۵۳) (ثانیہ) یہ کوئی فرق نہیں۔

استقبال اعتدالین کی صحیح صحیح دریافت سے زمین کے محور کی حرکت کا پتہ چلتا ہے۔(۱)

۷۔احمد بن محمد سجستانی ۴۳۳ھ-۱۰۲۴ء

علم ہیئت کا ماہر، گردش زمین (Rotation of earth) کا نظریہ پیش کرنے والا دنیا کا پہلا عظیم سائنسداں اس کے نظریے کے ذریعے اس باکمال سائنس داں نے بہت سے مسائل کو حل کردیا، اور قدیم نظام ہیئت کو بدل دیا،علم ریاضی میں قطع مخروطی (conicsection) کے ذریعے ہندسوں تثلیث کا موجد اور باکمال ریاضی داں۔وطن سجستان، ولادت ۹۵۱ء وفات ۱۰۲۴ء عمر ۷۳ سال۔

علمی خدمات اور کارنامے

گردش زمانے کا نظریہ: سجستانی سے پہلے اکثر مسلم سائنسداں زمین کو ساکن اور اجرامِ فلکی مثلاً چاند، سورج اور ستاروں کو متحرک مانتے تھے، لیکن یہ نظریہ محدود زمانے تک قائم رہا۔

مغربی سائنس دانوں میں کوپرنکس (coperoicec) جو پولینڈ کا باشندہ تھا اور ۱۴۷۳ء - ۱۵۴۳ء میں گذرا ہے، کہا جاتا ہے کہ گردش زمین کا نظریہ سب سے پہلے اسی نے قائم کیا اور آج بھی لاعلمی کی بنا پر لوگ اسی مغربی سائنس داں کو مانتے ہیں۔

(۱) موسوعة علماء العرب والمسلمين: ٦٢

لیکن گردش زمین کا نظریہ کوئی نیا نہیں مسلم سائنس دانوں نے بھی اس پر بحث کی ہے، اوراس کو پرنکس کے سراس کا سہرا باندھنا تو قطعی غلط اور سراسر ناانصافی ہے۔

قطع مخروطی کی ایجاد

علم ریاضی میں بھی احمد سجستانی ایک بلند پایہ محقق اوراسکا در تھا، اسے علم ریاضی پر عبور تھا، علم ریاضی میں اس کا ایک خاص کارنامہ ہے، جس نے اس کی شہرت کو چار چاند لگادیئے وہ یہ ہے کہ ریاضی وسیع ترفن میں علم ہندسہ کی ایک شاخ جسے قطع مخروطی کہتے ہیں (conic section) کے طریقے کو دریافت کیا۔

قدیم ترین زمانے میں ریاضی داں کسی زاویے کی تقسیم باآسانی کرلیتے تھے، چار حصوں میں بھی تقسیم کرسکتے تھے، زاویے کو جیومنٹری کے عام طریقوں سے تین حصوں میں تقسیم کرنا وہ مشکل نہیں ناممکن سمجھتے تھے، اوراس میں ان کو بھی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

مخروط اس جسم کو کہتے ہیں، جو نیچے سے زیادہ اور چورس ہومگر اوپر جاتے ہوئے اس کی گولائی کم ہوجاتی ہے، اور بتدریج چھوٹی ہوجاتی ہے، جیسے گاجر کی شکل ہوتی ہے۔

احمد سجستانی کا کمال یہ ہے کہ اس نے اس اہم مسئلہ کو حل کر کے جسے لوگ ناممکن سمجھتے تھے اسے ممکن بنادیا، اس نے اپنے خاص نظریے ''قطعات مخروطی'' کے ذریعے اس کا حل ڈھونڈ نکالا، اور زاویئے کی ہندسوی تثلیث یعنی جیومنٹری کے ذریعے اس کو تین مساوی حصوں میں تقسیم کرنے میں قطعات مخروطی کے ذریعے وہ کامیاب ہوگیا۔

۸۔ابوریحان محمد بن احمد بیرونی

محمد بن احمد البیرونی ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتا تھا، وہ خوارزم شہر سے باہر کے ایک دیہات کا رہنے والا تھا، اس لئے البیرونی کے نام سے مشہور ہوا۔

البیرونی کی ابتدائی تعلیم دستور کے مطابق ہوئی لیکن ناداری کی وجہ سے وہ ہمیشہ پریشان رہتا تھا، اللہ تعالیٰ نے اسے شوق اور حوصلہ بہت دیا تھا، اس لئے وہ علم کے حصول کی طرف ہمیشہ راغب رہا اور باوجود ہزار مشکلات اور مصائب کے کبھی مایوس نہ ہوا، وہ

شب وروز علمی مشاغل اور تحقیق وجستجو میں مصروف رہا۔

پھر اسکی علمی قابلیت اور استعداد کا چرچا اب عوام میں ہونے لگا، پھر وہ بادشاہوں کے درباروں سے متعلق ہوگیا، اس طرح اس کی غربت اور افلاسی کے دن جاتے رہے۔

ابوریحان علوم وفنون پر مجتہدانہ نظر رکھنے والا، علم ہیئت کا ماہر، فلسفی، باکمال نجومی اور سماجیات کا ماہر، عظیم تاریخ داں اور جغرافیہ داں (Geographer) زمین کے متعلق گہری تحقیق کرنے والا دھاتوں کی کثافت اجافی معلوم کرنے والا، اوران کے صحیح صحیح فرق کو معلوم کرنے والا، علم ریاضی کا ماہر، ریاضی کے مسئلوں کا نیا حل دریافت کرنے والا، تنہا زمین کے محیط کی صحیح صحیح تحقیق کرنے والا، ماہر اراضیات (geologlist) آثار قدیمہ کا پہلا ماہر (pre-historic)

خوارزم کے قریب ایک دیہات میں ۹۷۲ء میں اسکی ولادت ہوئی اور وفات ۱۰۴۹ء میں غزنی میں بعمر ۷۷ سال ہوئی۔

علمی خدمات اور کارنامے

عالی دماغ البیرونی پہلا غیر ہندوستانی ہے جس نے سنسکرت زبان سیکھی اور ہندؤں کے پرانوں اور مذہبی کتابوں مثلاً بھگوت، گیتا، رامائن، مہابھارت اور منوشاستر وغیرہ کا خود مطالعہ کر کے ان کے اقتباسات عربی زبان میں ڈھال کر اپنی کتابوں میں حوالے دیئے اور اپنی تصانیف کے ذریعے اہل ہند کے لٹریچر کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔

البیرونی شب وروز علمی اور تحقیقی کاموں میں مصروف رہتا تھا، تصنیف وتالیف اس کا دلچسپ اور پسندیدہ مشغلہ تھا، اس نے مختلف موضوعات پر جو علمی اور تحقیقی کتابیں لکھی ہیں، ان کی تعداد ڈیڑھ سو سے زیادہ ہے اور صفحات کی تعداد کا اندازہ ہزار سے اوپر ہے۔

البیرونی نے علم ہیئت اور ریاضی ہر ایک بہترین کتاب لکھی جس کا نام تفہیم ہے، سدس علمی کتاب میں سوال وجواب، علم ہیئت اور ریاضی کو سمجھایا گیا۔

قانون مسعودی میں البیرونی نے علم ریاضی کے بعض اہم ترین مسئلے حل کئے ہیں، ایک جگہ اس نے ٹرگنومیٹری سے بحث کی ہے۔

ٹرگنومیٹری (trigonomentry) علم مثلث کے مسئلہ کو اس طرح بتا تا ہے کہ ایک خاص نصف قطر کے دائرے کے اندر اگر ایک مساوی کی ضلاع مثلث، یا ایک مربع یا مخمس (pentagon) یعنی پانچ اضلاع، یا ایک مسدس (hexagon) شش پہلی یا ایک ثمن (gon) ہیئت پہلی یا ایک معشر اس کونے والی شکل کی اضلاع بنائی جائے تو ان میں سے ہر ایک کا ضلع دائرہ کے نصف قطر کی مقدار میں کیوں کر نکالا جاسکتا ہے، البیرونی نے مثالیں دے کر ان کو حل کیا ہے۔

ایک جگہ البیرونی نظریہ کی وضاحت کی ہے جس کے تحت اس نے زاویئے کے ان چھوٹے سے چھوٹے فرقوں سے جیپ کی قیمتیں نکالی ہیں ،اس کا یہ نظریہ عوامل (fuction) آج کے زمانے میں جس طرح لکھا جاتا ہے، اس کا یہ سلسلہ لامتناہی ہے، مگر البیرونی نے اسے صرف تین درجہ تک لکھا ہے۔

علم ریاضی کی تاریخ اس کلیہ کو نیوٹن (انگلستان ۱۶۴۲ھ) اور اس کے چند ہم عصر مغربی ممالک کے ریاضی دانوں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جو سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں گذرے ہیں؛ لیکن درحقیقت مسلم دور کے اس نامور سائنسداں اور علم ریاضی کے ماہر البیرونی نے آج تک سات صدیاں قبل نہ صرف اس کلیہ کو دریافت کیا تھا؛ بلکہ اس نے جدولین مرتب کر کے ان سے عملی کام بھی لیا تھا، البیرونی نے علمِ ریاضی میں کئی کلئے نئے دریافت کئے تھے، جو آج بھی تعلیم کئے جاتے ہیں۔

عرض البلد اور طول البلد کی دریافت

البیرونی نے قانونِ مسعودی میں دنیا کے مختلف شہروں کے درمیان طول البلد (longituaes) کا فرق دریافت کرنے کے اصول وقواعد بتائے ہیں، ان قاعدوں میں کروی ٹرگنومیٹری (spherical trigonomentry) کے بعض مسائل کا اطلاق کیا گیا ہے، یہ نہایت مشکل مسئلے ہیں جو ریاضی کے ایک طالب علم کے نقطۂ نظر سے خاصے پیچیدہ ہیں۔

البیرونی نے دنیا کے مشہور شہروں کے درمیان اپنی تحقیقات کے مطابق جو طول

البلد کا فرق معلوم کیا ہے، اس کی جدول یہاں پیش کیا جاتا ہے، اس نے دنیا کے شہروں کا طول البلد یہ بتایا ہے۔

لاہور :۳۴درجے،۳منٹ	جرجانیہ:۱۰درجے،۱۳منٹ
سیالکوٹ:۳۲درجے ۵۵منٹ	شیراز:۱۵درجے،۴۶منٹ
پشاور:۳۴درجے،۴۴منٹ	رے:۱۲درجے،۱۵منٹ
ملتان:۲۹درجے	بغداد:۲۴درجے،۲۰منٹ
بلخ:۳۰درجے،۲۰منٹ	رقہ :۳۰درجے،۴۱منٹ
نیشاپور:۹درجے،۲۰منٹ	اسکندریہ:۴۲،۲۶منٹ

زمین کے محیط کی پیمائش

حوصلہ مند البیرونی نے زمین کے محیط اور قطری پیمائش بھی کی تھی ، مامون الرشید کے دور میں سائنس دانوں نے زمین کے محیط کو قطب تارے کے ذریعہ معلوم کیا۔

مامون دور کے سائنسدانوں کا طریقہ بہت صاف اور سادہ تھا یعنی ایک وسیع میدان میں کسی مقام پر قطب تارے کی بلندی کا زاویہ معلوم کرلو اور پھر شمال کی طرف چلے جاؤ اور ساتھ ہی ساتھ بلندی کے اس زاویئے کی نئی پیمائش بھی لیتے جاؤ ، یہاں تک کہ ایسے مقام پر پہنچ جاؤ جہاں یہ زاویہ پورا ایک ڈگری بڑھ جائے ، اب پہلے مقام اور دوسرے مقام کے درمیان کا فاصلہ ناپو، یہ زمین کے محیط کی ایک ڈگری کی پیمائش ہوئی۔

اب اسے (۳۶۰) کے ساتھ ضرب دو تو زمین کا محیط صحیح صحیح نکل آئے گا، اس محیط کو پانی یعنی (۳ء۱۴۱۶) پر تقسیم کرنے سے زمین کا محیط پورا معلوم ہوجائے گا اور پھر اس کو اگر دو پر تقسیم کردیں تو نصف قطر معلوم ہوگا۔

البیرونی کا طریقہ جو اس نے پہلے فطری طور پر نکالا تھا اس سے مختلف تھا، اس طریقے میں پہلے زمین کا نصف قطر معلوم کیا جاتا ہے اور پھر اسے (۲ء۱) یعنی (۲x۳ء۱۴۱۲) کے ساتھ ضرب دے کر زمین کا محیط دریافت کیا جاتا ہے، البیرونی کا

طریقہ صرف وہاں استعمال کیا جاسکتا ہے جہاں وسیع میدان ہو اور اس میں ایک بلند ٹیلا ہو؛ لیکن بیرونی اپنے طریقے سے زمین کا محیط (۲۴۷۷۹) میں بتایا جو بہت حد تک صحیح ہے۔

اس نئے دور میں یعنی آج کل کی تحقیق کے مطابق زمین کا محیط (۲۴۹۷۷) میں بتایا گیا جو بہت حد تک صحیح ہے۔

اس نئے دور میں یعنی آج کل کی تحقیق کے مطابق زمین کا محیط (۲۴۸۵۸) میں ہے، اس لحاظ سے البیرونی کی پیمائش میں آج کی نسبت صرف (۴۷) میں کی کمی ہے اور مامونی کے مقابلے میں میں عہد مامون کی نسبت (۶ء) فی صد کی غلطی تھی؛ لیکن البیرونی کی پیمائش میں یہ غلطی صرف (۳ء) فیصد ثابت ہوتی، یہ غلطی اس قدیم دور کے حالات کو دیکھتے ہوئے کوئی غلطی نہیں ہے۔

البیرونی کی کتابیں اور یورپ

یورپ کے دانشوروں نے البیرونی کی قدر کی اور اس کی کتابوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

آثار الباقیہ: البیرونی کی کتاب آثار الباقیہ اصل عربی زبان ہی میں مقام لیزگ میں ۸۷۸ء میں شائع ہوئی اور پھر فوراً ہی اس کا انگریزی ترجمہ: ۱۸۷۹ء میں لندن میں شائع ہوا اور بہت پسند کیا گیا۔

کتاب الہند: البیرونی کی ''کتاب الہند'' اصل عربی زبان میں شہر لیزگ سے ۱۸۸۷ء میں شائع ہوئی اور سال بھر کے اندر ہی اس کا انگریزی ترجمہ لندن سے ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا۔

قانونِ مسعودی: اصل عربی میں دائرۃ المعارف (حیدرآباد نے شائع کیا) اس کے بعض اجزاء کا ترجمہ بھی یورپ کی زبانوں میں ہو چکا ہے؛ لیکن پوری کتاب کا مکمل ترجمہ اب تک یورپ کی زبانوں میں نہیں ہوسکا، قانونِ مسعودی میں بہت مشکل مسائل ہیں اور فنی اعتبار سے اس کا درجہ بہت بلند ہے غالباً اسی وجہ سے اس علمی کتاب کے ترجمے کی جرأت کوئی نہ کرسکا۔

۹-ابوالفتح عمر بن خیام

عالی دماغ فلسفی اور شاعر، علم فلکیات اور ہیئت کا زبردست عالم، ماہر ریاضی داں، شمسی اور قمری تاریخوں کی تحقیق کر کے ان میں مفید اصلاحات کرنے والا، دونوں قسموں کی تاریخوں میں مطابقت پیدا کرنے کا طریقہ دریافت کرنے والا، ماہر موسمیات، شمسی مہینوں کے دنوں کا تعین کر کے درست کرنے والا، لیپ سال (leap year) کا موجد اور مصنف، وطن نیشاپور (ایران) ولادت ۱۰۳۹ء، وفات: ۱۱۳۱ء، بعمر ۹۲ سال۔

عمر خیام کا خاندان معمولی حیثیت رکھتا تھا، اس کے والد ابراہیم ایک خیمہ دوز تھے، اور خیّام کے نام سے مشہور تھے، خیّام کے معنی ہیں خیمہ بنانے اور سینے والے کے، یہ لفظ عمر خیام کے نام کا بھی جزو بن کر مشہور ہو گیا۔

خراسان کا پایہ تخت نیشاپور اس قدیم زمانے میں علم وفن کا مشہور مرکز تھا، عمر خیام نے اسی شہر میں آنکھیں کھولیں، سمرقند، بخارا اور بلخ کے اہل علم ودانش کا طوطی بولتا تھا، عظیم الشان مدرسے قائم کئے تھے، ایسے دور میں نیشاپور متعدد درسگاہوں اور علماء کی مجلسوں کی آغوش میں خیام پل کر جوان ہوا، ریاضی، ہیئت اور فلسفہ کے سبق وقت کے نامور اساتذہ سے لئے، حکیم بوعلی سینا کا انتقال عمر خیام کی پیدائش سے دوسو سال قبل ہو چکا تھا، تاہم فضا میں اس کے علم وفن کی مہک تازہ تھی، اس جید عالم اور باکمال طبیب کے لائق ونامور شاگردوں کی صحبت عمر خیام کو حاصل تھی، چنانچہ اپنی تصانیف میں اکثر بوعلی سینا کے فلسفے اور علمی افکار سے متاثر ہو کر اسے اپنا استاد کہہ کر یاد کیا ہے۔

علمی خدمات اور کارنامے

مطالعہ اور محنت کا عادی عمر خیام نے علم ریاضی پر بڑی قابلیت سے اپنی پہلی کتاب ''مکعبات'' لکھی؛ لیکن نوجوان عمر خیام کی طرف کسی نے توجہ نہ کی، اربابِ اقتدار اور رؤسائے وطن کی اس ناقدری کے باعث ۱۰۶۶ء میں اس نے ترکستان کے دار السلطنت سمرقند کا رخ کیا، جہاں کے ذی علم رئیس شہر ابوطاہر نے اس جوہر نایاب کی پذیرائی کی، وہ صاحب علم وفضل تھا، علمی شغف رکھتا تھا، اس کا تعلق شاہ ترکستان کے دربار سے تھا،

ابوطاہر نے عمر خیام کو ایک جوہر قابل سمجھ کر بڑی قدر ومنزلت کی، یہ ۱۰۶۶ء کا زمانہ تھا۔

امیر ابوطاہر کو بھی علم ریاضی سے خاص دلچسپی تھی، عمر خیام نے اپنے محسن کے علمی شوق وذوق دور مطالعہ کو دیکھتے ہوئے علم ریاضی ۱۰۶۷ء میں اپنی مشہور تصنیف ''الجبر والمقابلہ'' مرتب کیا، یہ کتاب سات سال کی محنت میں مکمل ہوئی تھی، اور اس وقت اس کی عمر صرف اٹھائیس سال کی تھی۔

خیام نے اپنی مہارت کی بناء پر ''الجبر والمقابلہ'' میں کافی نئی نئی دریافتیں کیں، اس نے اس کتاب میں کئی نئے قاعدے بھی لکھے ہیں۔

۱۔ وہ کعب اور جذر جو عدد کے معادل ہو۔

۲۔ وہ کعب اور عدد جو جذر کے معادل ہو۔

۳۔ وہ عدد اور جذر جو کعب کے معادل ہو۔

۴۔ وہ کعب اور مال جو عدد کے معادل ہو۔

۵۔ وہ کعب اور عدد جو مال کے معادل ہو۔

۶۔ وہ عدد اور مال جو کعب کے معادل ہو۔

عمر کعب نے ان سب سوالات کو مقطوع مخروطی کے ذریعہ ثابت کیا ہے۔

عمر خیام کی کتاب ''الجبر والمقابلہ'' یورپ میں شائع ہو کر مشہور ہو چکی ہے، مولانا شبلی نعمانی نے اپنے مقالات میں عمر خیّام کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نادر کتاب نے اہل یورپ کے نزدیک خیام کو ریاضی داں اعظم ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

عمر خیّام کا قابل قدر کارنامہ الجبرے میں مسئلہ دورقمی (binomiol theoroiom) کی ایجاد کا اصول ہے، اس مسئلہ کو سب سے پہلے عمر خیام نے دریافت کیا ہے جو اس طرح ہے:

$$(a+b)^n = a^n + na^{n-1}b$$

+bn-+

عمر خیام کے اس الجبرے کا ۱۸۵ ء میں پیرس میں woepoke نے فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا، کتاب ''الجبر والمقابلہ'' علم ریاضی میں الجبرے کے موضوع پر چوتھی یا پانچویں کتاب ہے، اس موضوع پر سب سے پہلی تصنیف ڈھائی سو برس پہلے محمد بن موسیٰ خوارمی کی دنیا کے سامنے آچکی تھی، سمرقند میں عمر خیام کی اپنے مربی ابوطاہر کی وساطت سے بہرافروز ہوا، ترکستان کے نامور وزیر نظام الملک اہل علم ودانش کا قدرداں تھا، شاہ ترکستان اور شاہِ ایران میں دوستانہ روابط اور قرابت کا دوہرا رشتہ بھی قائم تھا، دس سال سمرقند میں گذار کر عمر خیام اپنے وطن نیشاپور لوٹا جہاں سے اس کو بے پناہ محبت تھی۔

عمر خیام کو علم طب میں بھی دستگاہ حاصل تھی اور ملک شاہ کے دربار اس کا تعارف بحیثیت طبیب ہوا، ملک شاہ کے خوردسال بیٹے کو چیچک کا مرض لاحق ہوا، شاہی طبیبوں کے علاج سے فائدہ نہ ہوا، جس سے ملک شاہ کو بہت تشویش ہوئی، ایسے میں عمر خیام کو طلب کیا گیا، شہزادہ کو اللہ نے شفادی اور عمر خیام شاہی طبیب کے عہدہ پر مامور ہوا، اس کی شہرت علم ریاضی، ہیئت اور فلسفہ وغیرہ میں بام عروج پر تھی، بحیثیت طبیب وہ بے انتہا مقبول ہوا اور اس کی شہرت عوام وخواص میں ہوئی، ملک شاہ چوں کہ علم دوست بادشاہ تھا، عالموں اور فنکاروں کی قدرومنزلت کرتا تھا۔

ملک شاہ نے عمر خیام کو اصفہان میں نوتعمیر رصدگاہ (obseryatory) کا ناظمِ اعلیٰ مقرر کیا، ایک زرکثیر آلات رصد کے لئے خرچ کیا اور سات مشہور ہیئت دانوں کو تحقیق ومشاہدات کے لئے رصدگاہ میں مامور کیا۔

شمسی سال پیمائش واصلاح

عالی دماغ حوصلہ مند عمر خیام کو اپنی صلاحیتوں سے کام لینے کا موقع ملا، اس نے نہایت احتیاط اور گہرائی سے اجرامِ فلکی کا مطالعہ اور مشاہدہ کیا، بہت سی نئی نئی دریافتیں کیں۔

علم ہیئت کے ماہرین کے اہم فرائض میں اجرام فلکی کا مشاہدہ کرنا، دن اور رات، طلوع اور غروب، شمسی سال، قمری سال اور موسم کی تحقیق کرنا شامل ہے۔

خیام نے اس رصد گاہ میں جو مشاہدات کئے اور اپنی تحقیقات سے جو نئی دریافت کیں، ان میں سے سب سے زیادہ اہم اور مشکل کام شمسی اور قمری سال کی پیمائش کرنا اور ان میں باہم مطابقت پیدا کرنا، شمسی سال سے مراد وہ پوری مدت اور وقت ہے جس میں زمین سورج کے گرد ایک پورا چکر کاٹ لیتی ہے۔

قدیم ترین زمانے کے یونانی حکماء سال کو پورے تین سو پینسٹھ (۳۶۵) دن کا مانتے تھے اور اسی سے مہینوں اور دنوں کا حساب لگاتے تھے۔

مسلم دور میں سب سے پہلے محمد بن جابر البنانی (المتوفی ۹۲۹ء) جو مشاہدہ افلاک کا ماہر تھا، اس نے شمسی سال کی تحقیق کر کے پورے ایک سال کی مقدار تین سو پینسٹھ (۳۶۵) دن، پانچ گھنٹے، چھیالیس منٹ اور چوبیس سکنڈ متعین کی تھی۔

عمر خیام نے بھی شمسی سال کی کمالِ احتیاط سے تحقیق کی اور پیمائش کے بعد پورے سال کی مقدار تین سو پینسٹھ دن، پانچ گھنٹے اور انچاس منٹ بنایا، عمر خیام کی تحقیق آج کے دور سے بہت قریب ہے اور زیادہ صحیح ہے، آج کے سائنسداں سال کی مقدار تین سو پینسٹھ دن، پانچ گھنٹے، اڑتالیس منٹ اور ۴۸ء۷ سکنڈ بتاتے ہیں۔

عمر خیام کی تحقیق جو آج سے نو برس پہلے محض علمی مہارت اور معمولی آلات کے ذریعے کی گئی تھی اور آج کے اس سائنسی دور میں جب کہ علم وفن انتہائی کمال کو پہنچ گیا ہے، دونوں کی تحقیق میں صرف (۱۱ء۳) سکنڈ کا فرق پایا جاتا ہے، یہ معمولی ترین قرب کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

سرکاری مطالبات کی وصولی اور تنخواہوں کی ادائیگی

کھیتوں میں فصلیں ہمیشہ شمسی حساب سے پکتی ہیں، اس لئے ریاست کے خزانے میں شمسی حساب سے رقمیں آتی تھیں؛ لیکن ملازمین کی تنخواہیں اور دیگر اخراجات کا بجٹ قمری حساب سے تھا اور ادائیگی ہوتی تھی۔

شمسی سال کے مقابلے میں قمری سال چھوٹا ہوتا ہے، یعنی قمری سال شمسی سال پورے ایک سال میں گیارہ دن کم ہوتا ہے اور شمسی سال اتنا ہی بڑا ہوتا ہے، اس حساب

سے بتیس شمسی برسوں میں تینتیس قمری سال آتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ بتیس برسوں میں ایک سال کا فرق پڑتا ہے۔

ہر بتیس سال میں ایک سال بڑھ جانے سے حکومت کو ایک سال کے اخراجات کا نقصان ہوتا تھا؛ کیوں کہ سرکاری اخراجات کا تعین اور ادائیگی تو قمری حساب سے ہوا کرتی تھی، جو بتیس سال میں ایک سال کے اخراجات زیادہ ادا کرنے پڑتے تھے؛ لیکن سرکاری مالیہ اور آمدنی شمسی حساب سے ہوتی تھی، اس وجہ سے حکومت کو ایک سال کے اخراجات زیادہ ادا کرنے پڑتے اور نقصان ہو جاتا تھا، اب اس کے لئے کوئی مناسب تدبیر کرنی ضروری تھی۔

عمر خیام کا کارنامہ

عمر خیام نے شمسی اور قمری سال میں اسی فرق کو اصولی طور پر یوں دور کیا کہ سب سے پہلے حکومت سے یہ اصول منوایا کہ مذہبی اور دینی امور مثلاً حج، عیدین، رمضان وغیرہ کا تعین تو قمری حساب اور ہجری تقویم سے کیا جائے اور دیگر امور سلطنت مثلاً مالیہ کی وصولی، بجٹ کے اخراجات لا تعین، بجٹ اور سرکاری ملازمین کی تنخواہوں کی ادائیگی وغیرہ شمسی حساب اور ایرانی تقویم سے کی جائے۔

شمسی تقویم میں اصلاح

سال میں پانچ دن ایسے آجاتے ہیں جو بڑھ جاتے تھے، اہل عرب ایسے سال کو ''کبیر'' (leapyer) کہتے تھے اور اہل ایران ''دزدیدہ'' (چرائے ہوئے دن) کہتے تھے، اہل یورپ میں ابھی یہ شعور پیدا نہیں ہوا تھا۔

خیام نے شمسی تقویم میں ایک بہت بڑی اصلاح کی اس نے ان زائد دنوں کو سال کے بارے مہینوں میں کھپا دیا، اس طرح کہ بعض مہینوں کو تیس دن کا اور بعض کا اکتیس دن کا بنا دیا اور ان کا کلی مجموعہ تین سو پینسٹھ (۳۶۵) دن کا ہو گیا۔

لیکن (۳۶۵) دنوں کے بعد بھی سال میں قریباً چھ گھنٹے کی زیادتی آجاتی ہے اور یہ بچ رہتا تھا، عمر خیام نے ہر چوتھے سال کے ایک مہینے میں ایک دن زیادہ کر دیا، گویا

یہ چوتھا سال (۳۶۶) دنوں کا ہو گیا۔

مزید اصلاح کے لئے ۱۳۲ ویں سال کو لیپ کا سال قرار نہ دینے کا ضابطہ بنایا، آج دنیا میں عمر خیام کا اصلاح شدہ شمسی کیلنڈر رائج ہے جو اس کے کمالِ علم کی روشن دلیل ہے۔

مزید اصلاح کے لئے ۱۳۲ سال کو لیپ کا سال قرار نہ دینے کا ضابطہ بنایا، آج دنیا میں عمر خیام کا اصلاح شدہ شمسی کیلنڈر رائج ہے جو اس کے کمالِ علم کی روشن دلیل ہے۔

عمر خیام نے اپنی بندگی کے آخری ایام فلسفے کے مطالعے اور شاعری کے مشغلے میں گذارے، وہ نہایت شوق وظریف الطبع تھا اور حافظہ بلا کا قوی تھا۔

دو جرمن دانشوروں نے جن کا نام جیکب (Jacob) اور وائڈمن عمر خیام کے سائنسی کارناموں اور اصلاحات پر ایک پراز معلومات مقالہ لکھا جو ۱۹۱۲ء میں جرمنی زبان کے رسالہ ''اسلام'' کی جلد سوم میں بقدر بیس صفحات شائع ہوا، عمر خیام مشرق سے زیادہ مغرب میں مقبول ہوا، فریڈرک روزی کے مطابق مشرق کے کسی شاعر کو اتنی مقبولیت حاصل نہ تھی، جتنی کے خیام کو فٹز جرالڈ نے عمر خیام کی ایک سو ایک رباعیوں کا انگریزی ترجمہ کیا جو اتنے مقبول ہوئے کہ بقول سید صباح الدین عبد الرحمٰن ''انجیل کی عبارت کے بعد انگریزی دان کی زبان پر یہی اشعار تھے''۔

عمر خیام نے ریاضی میں ایک تہلکہ خیز کنٹری بیوشن کی، جس کو binomial coefficients کہتے ہیں، یورپ میں اس دریافت کا نام (pascal,s triangle) رکھ دیا گیا ہے۔

مذہبی رنگ اور دینی مزاج

آخری ایام کا ذکر علامہ سید سلیمان ندوی یوں تحریر فرماتے ہیں کہ: ''مرض الموت کے بعد آخری لمحوں میں وہ بوعلی سینا کی کتاب الٰہیات شفا کا مطالعہ کر رہا تھا، جب واحد اور کثیر کی بحث پر پہنچا تو اس پر یہ اثر اہوا کہ اٹھ کھڑا ہوا، لوگوں کو بلا کر وصیت کی، پھر نماز پڑھی، اس درمیان میں کچھ کھایا نہ پیا، آخر عشاء کی نماز پڑھ کر سجدہ کیا اور یہ طوطی خوش نوا

ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا۔

عمر خیام ۱۱۳۱ء میں انتقال کیا اور نیشا پور کے قریب گورستان میں تدفین ہوئی۔

محمد خیام کو شعر وادب پر کمال حاصل تھا، مولانا شبلی رقم طراز ہیں: خیام کی رباعیاں اگر چہ سیکڑوں، ہزاروں ہیں؛ لیکن سب کا قدر مشترک صرف چند مضامین ہیں جو دنیا کی بے ثباتی، خوش دلی کی ترغیب، مسئلہ جبر، توبہ واستغفار، ان میں ایک ایک مضمون کو وہ بار بار ادا کرتا ہے، لیکن ہر دفعہ اس طرح بدل کر کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی نئی چیز ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے سامنے خیام کی رباعی پڑھی جاتی تو وہ رو پڑتے۔(۱)

۱۰۔حکیم یحیی بن منصور (۲۱۴ھ/۸۳۳ء)

حکیم یحیی بن منصور ہیئت داں اور منجم تھا اور دربار میں اسی حیثیت سے وہ باریاب ہوا، حکیم یحیی ایک پڑھے لکھے خاندان کا چشم وچراغ تھا، اس کے والد علم ہیئت کے ماہر تھے، علم منجم کا تعلق علم ہیئت سے ہے، اس لئے ہیئت داں نجومی بھی ہوتا ہے، اس دور میں عوام کو علمِ نجوم سے بڑی دلچسپی تھی، عوام چاند تاروں کے اثرات کے قائل تھے، نجومی چاند، تاروں کو دیکھ کر آئندہ پیش آنے والی باتیں بتا دیتے تھے، اس علم کو علمِ نجوم، علمِ جوتش یا انگریزی میں (astrology) کہتے ہیں۔

حکیم یحیی منصور نے علم نجوم میں کمال پیدا کیا؛ چوں کہ اپنے فن کا ماہر تھا، دربار میں خوب عزت پائی۔

علمی خدمات اور کارنامے

سائنس کی دنیا میں مامون الرشید کا یہ سب سے بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے ایک عظیم رصدگاہ (obsevatory) بغداد میں شماسہ کے مقام پر تعمیر کرائی اور دوسری رصدگاہ ملک شام میں دمشق کے قریب قاسیون کے بلند اور مسطح میدان میں تعمیر کرائی۔

اسی تعمیر میں باکمال ہیئت دانوں کی ایک جماعت مقرر تھی جو سب کی نگرانی کرتے

---

(۱) موسوعة علماء العرب : ۱۶۴

تھے، ان میں حکیم یحیی منصور بھی تھا، بغداد کی رصدگاہ دو برس میں کام کرنے لگی، ہر قسم کے آلات مثلاً اصطرلاب وغیرہ نصب تھے، ماہرین کی جماعت حکیم یحیی منصور بھی تھا۔

قاسیون (دمشق) کی رصدگاہ جب تیار ہوئی تو حکیم یحیی منصور کا تقرر صدر کی حیثیت سے وہاں ہوگیا، حکیم یحیی منصور اور ماہرین کی جماعت نے وہاں فلکیات کا مطالعہ اور مشاہدہ شروع کردیا۔

حکیم یحیی منصور نے چاند اور بعض دیگر سیاروں کے متعلق چند نئی دریافتیں کیں، ستاروں کے متعلق زیچ (Astronomical tables) سب سے پہلے تیار کی، جس کا نام زیچ مامونی رکھا، یہ زیچ فلکیات سے متعلق پہلی کتاب ہے۔

۱۱-(ابومحمود) حامد بن الخضر الخجندی (۳۹۱ھ-۱۰۰۰ء)

ابومحمود حامد بن الخضر الخجندی کے حالاتِ زندگی بہت کم دستیاب ہیں، نصیر الدین طوسی کے بیان کے مطابق اس کو خان کا لقب حاصل ہوا تھا، اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ خجندی ماوراء النہر کے دریائے سیر پر واقع قصبہ خجندہ کے خوانین میں سے تھا، کچھ مدت تک اس کو بویہ حکمراں فخر الدولہ کی سرپرستی حاصل رہی۔

علمی خدمات اور کارنامے

ابومحمود حامد بن الخجندی نے مندرجہ ذیل کتابیں لکھیں:

۱- رسالہ فی المیل وعرض البلد (طریق الشمس کا جھکاؤ اور علاقوں کے عرض البلد دریافت کرنے کے بارے میں رسالہ)۔

۲- جیومیٹری پر ایک کتاب۔

۳- فی عمل الآلۃ العامۃ (یا الآلۃ الشاملۃ) جامع آلہ کے طریقہ استعمال میں کتاب۔

نصیر الدین طوسی کے مطابق الخجندی نے قانون الہیئت (یعنی کروی مثلثوں سے متعلق مسئلہ جیب زاویہ (sine theorem) دریافت کیا، جس نے میں لاؤ (menelaus) کے قانون کی جگہ لی، دسویں صدی کے سائنس دانوں مثلاً ابوالوفاء اور ابونصر بن علی بن عراق نے بھی مسئلہ جیب زاویہ کی دریافت کا دعوی کیا تھا۔

طوسی اپنی کتاب ''شکل القطاع'' میں مسئلہ جیب زاویہ کے لئے الخجندی کے حل کا ذکر کیا ہے۔

جیومٹری میں الخجندی نے تمام ثبوت کے ساتھ یہ دریافت کیا کہ وہ مکعب مقداروں کا مجموعہ ایک مکعب مقدار نہیں ہوسکتا۔

فخر الدولہ کی زیر سرپرستی الخجندی نے قصبہ رے کے مضافات میں واقع ایک پہاڑی پر جس کا نام ''جبل طروق'' تھا، طریق الشمس (eclitic) جھکاؤ کی پیمائش کا ایک آلہ تعمیر کیا، اس آلے کو السدس الفخری کا نام دیا گیا، اس آلے کی وضاحت یوں کی جاسکتی ہے۔

۴۰ ہاتھ اونچی دیواریں خط نصف النہار کے متوازی تعمیر کی جاتی ہیں،، جنوبی دیوار کے قریب ایک محراب دار چھت میں تین انچ قطر کا ایک شگاف رکھا جاتا ہے، اس سوراخ کے ۴۰ ہاتھ تک گھڑھا کھودا جاتا ہے۔

دونوں دیواروں کے درمیان لکڑی کی بنی ہوئی قوس، جس کا زاویہ ۶۰ ڈگری اور قطر ۴۰ ہاتھ ہے رکھی جاتی ہے، یہ قوس تانبے کے پتروں سے ڈھانپی ہوتی ہے اور اس پر درجوں کے نشانات لگائے جاتے ہیں، قوس کا ہر درجہ ۶۰ منٹ میں اور ہر منٹ مزید دس حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

چوں کہ چھت کی شگاف داخل ہونے والی سورج کی شعاعیں ایک مخروطی شکل بناتی ہیں، اس لئے قاعدہ کا مرکز معلوم کرنے کے لئے ایک آلہ کی ضرورت ہوتی ہے، یہ آلہ جو ایک دائرہ پر مشتمل ہوتا ہے اور جس کے دو قطر ایک دوسرے کو زاویہ قائمہ پر قطع کرتے ہیں، مخروطی شکل کے قاعدہ پر منطبق ہوتا ہے، مخروط کی حرکت کے ساتھ ساتھ اس کو بھی حرکت دی جاتی؛ یہاں تک کہ اس کا مرکز خط نصف النہار پر آجائے، شاقوں اور ارتفاع شمس کے درمیان بننے والی قوس سورج کے ارتفاع کے جیب مستوی (cosine) کے برابر ہوتی ہے۔

ابو محمود حامد الخضر الخجندی ۱۰۰۰ء میں فوت ہوا۔

۱۲۔عباس بن فرناس (۲۷۴ھ-۸۸۷ء)

عباس ابن فرناس اپنی اختراعات اور ایجادات کی بدولت بہت بڑی شہرت حاصل کی، اہل مغرب کو مشرقی علوم سے روشناس کرایا، وہ پورے ہسپانیہ میں واحد شخص تھا جو الخلیل ابن احمد کی علم عروض سے متعلق تصنیف سمجھتا تھا۔

ابن فرناس عراق کا سفر کیا اور وہاں علمی و ادبی حلقوں اور اداروں کو دیکھا، واپسی پر وہ اپنے ساتھ فلکیات کی مشہور کتاب ''سند ہند'' بھی ہسپانیہ لے آیا۔

علمی خدمات اور کارنامے

ابن فرناس سے متعلق مشہور ہے کہ اس نے اڑنے کی کوشش کی اس نے اڑنے کے لئے ایک غلاف تیار کیا، جس میں پر اور مصنوعی پروں کے ساتھ ایک بلند چٹان سے کود پڑا؛ لیکن اس کی پرواز زیادہ کامیاب ثابت نہ ہوسکی، نیچے اترتے ہوئے وہ زخمی ہوگیا۔

عباس ابن فرناس اپنے گھر میں ایک سیارگاہ بنائی تھی جس میں چاند ستاروں اور بجلی کی گرج و چمک کا مصنوعی ماحول پیدا کیا گیا۔

عباس ابن فرناس نے ایک خاص قسم کی گھڑیال بنایا اور اسفیر یعنی کرہ فلکی کی بھی ایجاد کیا۔ بلور کوہی (rock crystal) کی دریافت بھی اسی نے کی، جن کتابوں میں اس کی اختراعات و ایجادات کا ذکر کیا گیا تھا، وہ اب اصل صورت میں دستیاب نہیں، ایک حوالہ کے مطابق ''المقبس'' کے مصنف نے ابن فرناس کے کئی تذکرے اور اشعار شامل تحریر کئے، اسی مآخذ کے مطابق اس گمشدہ کتاب یعین ''المقتبس'' کا ایک مخطوطہ حال ہی میں دریافت ہوا ہے، مشہور مؤرخین ابن سعید اور مقری کے مطابق ''وہ اندلس میں بلور کو ایجاد (دریافت) کرنے والا پہلا سائنسداں تھا، اس بیان سے بہت سی باتیں اخذ کی جاسکتی ہیں؛ لیکن اتنا ضرور ہے کہ بلور کاٹنے کا طریقہ ابن فرناس ہی نے متعارف کرایا، اس سے یقیناً بلاد شرقیہ (خصوصاً مصر) کو کوائز کی برآمد پر بہت اثر پڑا ہوگا، کیوں کہ اب یہ حقیقت سامنے آگئی تھی کہ بلور کو وہیں کاٹ کر استعمال میں لایا جاسکتا ہے

جہاں سے یہ نکالا جاتا تھا، اس دریافت کے باوجود شیشہ سازی کی صنعت پر کوئی اثر نہ پڑا۔

اس نے ہوا میں اڑنے کا تجربہ کیا، اس مقصد کے لئے پروں والی ایک مشین بنائی جس کی مدد سے ذرا سا اڑنے میں کامیاب ہوگیا، اس نے وقت معلوم کرنے کا ایک آلہ بھی بنایا جو مثقال کہلاتا ہے، عباس بن فرناس نے اپنے گھر میں کائنات کا ایک ماڈل بنایا تھا، جس کے متعلق ''المقری'' کے الفاظ ہیں:

''اس نے اپنے گھر میں ہیئت آسمانی بنائی تھی، جس میں ستارے ابر، برق، رعد معلوم ہوتے تھے، اس کے ماڈل کو آج کے دور میں (Planetarium) کہا جاتا ہے (اسلام، سائنس اور مسلمان: ۲۷۲)

اس مشہور سائنس داں عباس ابن فرناس کا انتقال ۸۸۷ء میں ہوا۔(۱)

۱۳۔(ابوالحسین) عبدالرحمٰن بن عمر الرازی (۳۷۶ھ-۹۸۶ء)

امام ابوالحسن عبدالرحمٰن بن عمر الرازی ہے؛ لیکن الصوفی کے نام سے زیادہ معروف تھے، ۲۹۱ھ/۹۰۳ء کو پیدا ہوئے، اور ۳۷۶ھ- ۳۸۶ء میں ایران میں فوت ہوئے، حالات زندگی کی تفصیلات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ ایران اور بغداد میں بویہ سلطنت کے حکمرانوں کے ساتھیوں میں تھے، خصوصا عضدالدولہ کے ساتھ اس کا تعلق نہایت ہی دوستانہ تھا، الصوفی کی چند تحریروں میں عضدالدولۃ کے علاوہ حکمران خاندان کے مزید تین بادشاہوں کے نام بھی ملتے ہیں۔

علمی خدمات اور کارنامے

ساکن ستاروں کا مشاہدہ اور ان کی تفصیلات کو بیان کرنے میں الصوفی کو بڑی شہرت حاصل تھی، اس موضوع پر اس نے اپنی تحقیقات اور مشاہدات کو اپنی کتاب ''کتاب صور الکواکب الثابتہ'' میں قلمبند کیا اور اسے عضدوالدولۃ کے نام منسوب کیا۔

---

(۱) سو عظیم مسلم سائنسداں: ۳۵۴-۳۵۵

اس کتاب میں الصوفی بطلیموس کی مرتب کردہ ستاروں کی زیج کا تنقیدی جائزہ لیتا ہے اور ساتھ ہی اپنے مشاہدات کے اختلافی یا اضافی نتائج کو شامل کیا ہے، الصوفی کی یہ کتاب بطلیموس کے مشاہدات وخیالات پر پہلا تبصرہ ہونے کے باعث اسلامی علمِ ہیئت میں صدیوں تک مستند تسلیم کی جاتی رہی، حتی کہ اس کے اثرات قرون وسطی کے مغربی سائنسی علوم پر بھی پڑے، ان دونوں مغرب میں الصوفی کو ''ایزوفی'' (azopi) کے نام سے جانا جاتا تھا۔

سائنسی نقطۂ نظر سے الصوفی کی ''كتاب صور الكواكب الثابته'' اس لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں قرون وسطی کے بیشتر ہیئت دانوں کی تحقیقات کے برعکس ستاروں کے حقیقی مشاہدات پر مبنی گراں قدر تحریریں موجود ہیں، جب کہ ازمنۂ وسطی کے اکثر فلکیات داں بطلیموس کی زیج میں درجہ خطوط طول البلد میں ہی صرف مستقل مقداروں کو جمع کرتے اور یوں بطلیموس کی ترتیب شدہ تفصیلات کو جوں کا توں دہرا دیتے تھے۔

الصوفی کی اس کتاب کا ایک اور قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ اس میں کئی صدیوں سے رائج ستاروں کے عربی ناموں کی قطعی کو بکی تطبیق دی گئی ہے، اس سے قبل یہ عربی نام صرف لسانیات کی تحریروں میں ملتے تھے؛ لیکن اس میں ستاروں کی قطعی تطبیق شامل نہ تھی، الصوفی نے فلکیات کی رو سے تطبیق قائم کرنے کی بہت کوشش کی، اگر چہ اسے ہر مرتبہ کامیابی نہ ہوتی، تطبیق کے مسئلے پر اس کی تحقیق کو بعد میں آنے والے ہیئت دانوں نے معیار بنایا؛ حتی کہ اس کا اثر جدید کو بکی اصطلاحات پر بھی پڑا۔

الصوفی کی ایک مفصل تصنیف کا نام ''کتاب العمل بالاصطرلاب'' ہے، دوسری کتابوں کے انگریزی عنوانات یہ ہیں:

introduction to the science of astrology "and" book on the use of the celestial.

بعض حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ الصوفی نے چند فلکیاتی آلات بھی ایجاد کیے

تھے، کہا جاتا ہے کہ اس کا بنایا ہوا چاندی کا ایک سماوی کرہ ۱۰۴۳ء کے لگ بھگ مصر میں محفوظ تھا۔(۱)

۱۴۔(ابوعبداللہ)محمد ابن عیسی الماہانی (۲۶۷ھ-۸۸۰ء)

الماہان کا پورا نام ابوعبداللہ محمد ابن عیسی الماہان ہے، وہ ایران کے ایک علاقہ جس کا نام ماہان ہے میں پیدا ہوئے، اسی نسبت سے وہ ماہانی کہلائے، انہوں نے زیادہ عرصہ بغداد میں گذارا، تاریخ پیدائش کا کوئی یقینی حوالہ نہیں، البتہ ۸۶۰ء کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

علمی خدمات اور کارنامے

الماہانی کی زندگی کے بارے میں ہماری معلومات کا بڑا ذریعہ وہ اقتباسات ہیں، جو الماہانی کی ایک غیر معروف تصنیف سے تعلق رکھتے ہیں، یہ اقتباسات ابن یونس کی ''جداول عالمی'' میں الماہانی ہی کی کسی نامعلوم کتاب سے لئے گئے ہیں، اس کتاب میں ابن یونس ایسے مشاہدات بیان کرتا ہے جو الماہانی نے ۸۵۳ء اور ۸۶۶ء کے درمیانی عرصے میں بیان کئے، یہ مشاہدات اجرام فلکی کا قران (دو اجرام فلکی کا ملنا) اور سورج اور چاند گرہن سے متعلق تھے، اس میں الماہانی چاند گرہن کے حوالے سے بتاتا ہے کہ اس نے اس گرہن کے شروع ہونے کا وقت اصطرلاب جیسے آلہ کی مدد سے معلوم کیا ہے اور اس کی صحت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے تین مسلسل چاند گرہنوں کے شروع ہونے کا وقت اپنے حساب سے نکالا اور پھر گرہن کے اوقات سے اس کا مقابلہ کیا تو صرف نصف گھنٹے کا فرق تھا، یعنی چاند گرہن اس کے اندازے کی نسبت آدھ گھنٹہ بعد میں شروع ہوا۔

الماہانی زیادہ تر حساب کے میدان میں تحقیق کا کام کیا، خیام کے خیال میں الماہانی ہی وہ پہلا سائنسداں ہے جس نے ارشمیدس کے ایک اہم مسئلے کا حل الجبرے کے اصولوں کے مطابق نکالنے کی کوشش کی، یہ مسئلہ ایک کمرے کو کسی مستوی کے ذریعے ایسے حصوں میں تقسیم کرنے سے متعلق تھا جن کے حکم آپس میں دی گئی نسبت کے مطابق ہوں، یہ مسئلہ

(۱) سو عظیم مسلم سائنسداں: ۱۷۳-۹۶۳

کروں اور بیلنسوں سے متعلق اس کے ایک رسالہ میں بیان کیا گیا ہے۔

الماہانی نے اقلیدس کی کتاب ''اولیات'' کی پہلی، پانچویں، دسویں اور تیرہویں فصلوں کی شرحیں بھی لکھی ہیں، ان میں سے پہلی فصل میں دیئے گئے چھبیس مسئلوں پر لکھی جانے والی شرح نہیں ملی، یہ مسئلے ایسے تھے جنہیں کسی مہمل میں تحویل کے بغیر ثابت کیا جاسکتا ہے، اسی طرح دسویں فصل جو غیر ناطق نسبتوں سے متعلق تھی، کی شرح کا ایک حصہ، تیرہویں فصل کی غیر معروف عبارتوں کی وضاحت اور تین مختلف رسالے، فصل پنجم بھی اس وقت نایاب ہے، چوں کہ فصل پنجم جو تناسب کے نظریے سے متعلق ہے، ترکیبی انداز میں لکھی گئی تھی اور اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ تناسب کا اصول کیوں کر وجود میں آیا، اس لئے عرب ریاضی داں اس کی تعریف نمبر ۵ جو بنیادی نوعیت کی ہے سے بالکل غیر مطمئن تھے؛ تاہم انہوں نے اس کی صداقت سے انکار نہیں کیا اور اسے ایک سائنسی اصول کے طور پر تسلیم کرلیا، رفتہ رفتہ انہوں نے (egibmultiple) کی اقلیدسی تعریف کو (pre-eudoxiananthyphairitic) تعریف سے بدل دیا، یہ تعریف قدروں (magnitudes) کا مقابلہ ان کے کسر مسلسل میں پھیلاؤ کے لحاظ سے کرتی تھی، الماہانی کے رسالے میں اینتھی فریٹک تصورات صاف صاف انداز میں بیان کئے ہیں، اس سلسلے میں وہ ثابت بن قرہ کا حوالہ بھی دیتا ہے، الماہانی کے خیال میں نسبت ''دو رقموں کا ایسا باہمی طریقۂ عمل ہے جس میں اقلیدس کے مشترک مقسوم علیہ اعظم کے معلوم کرنے کے طریقے سے ان کا موازنہ کیا جائے'' اس کے نقطۂ نظر سے اگر اس عمل میں سامنے آنے والی حاصل تقسیم کے دو سلسلے ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوں تو رقموں کے یہ دو جوڑے باہم متناسب ہوں گے، النیر یری نے بعد میں بعینہ یہ نظریہ پیش کیا، ان میں سے کسی بھی نظریے کا اقلیدس کی اس تعریف سے متعلق قائم نہیں ہوتا جو سب سے پہلے ابن الہیثم نے پیش کیا تھا۔(۱)

۱۴۔ نصیر الدین الطّوسی ابو جعفر (۶۷۳ھ/۱۲۷۰ء)

یہ عظیم ریاضی داں اور ماہر ہیئت گذرا ہے، نصیر الدین طوسی کی ولادت طوس ملک

(۱) موسوعة علماء العرب والمسلمين :۱۹۰

خراسان کے ایک شہر میں ہوئی، اس نے اپنے استاذ ابن یونس کمال الدین یونس سے علوم اور فلسفہ کی تکمیل کی، ایک ہمہ داں محقق اور نجومی کی حیثیت سے اس کی شہرت جلد ہی فارس تک پھیل گئی اور کوہستاں کے اسماعیلی گورنر نے ناصر الدین عبدالرحمٰن ابن علی منصور نے اس کو آخر کار اغواء کر کے الموت روانہ کردیا، جہاں ایک مدت تک اسے بدرجۂ مجبوری قیام کرنا پڑا، آخر کار ۱۲۵۶ء میں منگولوں کے فاتح ہلاکوخاں نے اسے وہاں سے آزادی دلائی، بعدازاں وہ ہلاکو کا مشیر اور وزیر اوراوقاف کا محافظ مقرر رہوا، ہلاکو کے انتقال کے بعد اس کے جانشیں اب کے زمانے میں بھی اس کا یہ اثر ورسوخ قائم رہا؛ یہاں تک کہ ۲۶/جون ۱۲۷۴ء میں اس نے بغداد میں انتقال کیا۔

علمی خدمات اور کارنامے

علم فلکیات میں نصیرالدین طوسی کی شہرت اس تحقیق کی بدولت ہے جو انہوں نے رصدگاہ مراغہ میں کی ہے، بغداد میں نویں صدی میں عباسی خلیفہ مامون الرشید کا قائم کردہ ''بیت الحکمۃ'' اور قاہرہ میں گیارہویں صدی عیسوی میں فاطمی خلیفہ الحکم فلکیاتی رصدگاہ مشرقی علوم وفنون اور فلکیاتی تحقیق کا سب سے بڑا مرکز تھا۔اس رصدگاہ میں بہترین آلات مہیا کئے گئے تھے اور اس کے لئے بغداد سے لوٹ کر ۴۰۰ کتابیں فراہم کی گئیں تھیں۔

طوسی ''ترکیوٹ'' کے موجد مانے جاتے ہیں، پندرہویں، سولہویں صدی میں یہ آلہ مغرب میں بہت زیادہ مقبول تھا۔مسلم سائنسداں نے اجرامِ فلکی کے مشاہدہ کے لئے مختلف قسم کے آلات بنائے، مراغہ کی فلکیاتی رصدگاہ میں مختلف مقاصد کے لئے چھلوں سے بنائے ہوئے مختلف قسم کے آلات بنائے، ان میں اسے ایک جس کا زیادہ استعمال ہوتا ہے پانچ چھلوں پر مشتمل تھا، جب الفانسو کاسٹیلا نے اکلس گوں بنانا چاہا تو اس وقت بہترین سمجھا گیا تو عربوں سے اس کی ضروری معلومات حاصل کیں۔

مراغہ کی فلکیاتی رصدگاہ میں جو خالص فلکیاتی تحقیق ہوتی، وہ دوعہد تک جاری رہی اور اس کے نتیجے میں ''الزج والخان'' جسے خانی تقویم بھی کہتے ہیں عالم وجود میں آئی، مشرقی ممالک اور خصوصاً چین میں وہ بہت مقبول ہوئی، نصیرالدین الطّوسی نے یہ تقویم

بارہ سال کی محنت شاقہ کے بعد۱۲۷۲ء میں مرتب کی، علوم ریاضی میں بھی نصیر الدین بیش بہا تصانیف چھوڑیں، خصوصا جیومیٹری اور علم مثلث میں اس کی تصنیف اعلی درجہ کامیاب ہوئی، انہوں نے حساب اور الجبرا میں بھی کتابیں لکھیں، جن میں ''الجبر والمقابلہ'' بہت مشہور ہے۔

علم فلکیات میں اس کی مشہور تصنیف ''کتاب تذکرۃ الناصر'' ہے جس میں فلکیات کا مکمل جائزہ لیا گیا ہے، مشرقی مغربی زبانوں میں اس کی متعدد تفسیریں اور تبصرے لکھے ہیں۔اس کے علاوہ بھی نصیر الدین نے علم فلکیات پر کئی اور کتابیں لکھی ہیں، ان میں ''زبدۃ الحی''،''کتاب التحصیل فی النجوم'' ''غروب وطلوع''،''سیارہ''،''رات دن''،''سورج اور چاند'' اور ''چاند کا حجم اور ان کے درمیان فاصلہ وغیرہ وغیرہ قسم کی بارہ کتابیں لکھی ہیں۔

نصیر الدین الطّوسی کی علم ہیئت ومعرفت کا سرچشمہ کتاب ''تذکرۃ فی علم الہیئت'' ہے، جس کا لاطینی ترجمہ (figure) کے عنوان سے چودھویں صدی میں کیا گیا، اس کتاب میں الطّوسی نے بہت سی پرانی، فرسودہ تھیوریز پر کڑی تنقید کی، نیز اس نے اپنا تیار کردہ ماڈل (planetary molder) پیش کیا، کوپرنیکس نے اپنا اس سے ملتا جلتا ماڈل پانچ سوسال بعد پیش کیا، ، الطّوسی نے مراغہ (آذر بائجان) میں ۱۲۶۲ء میں رصدگاہ تعمیر کی، جس میں علانہ سائنسی آلات کے ایک بارہ فٹ لمبا قواڈنٹ (quadrant) اور ایک (Azimuth) تھا، جسے اس نے خود تیار کیا تھا، اس نے بارہ سال کی دیدہ ریز شب وروز کی محنت کے بعد ستاروں کی (زیچ الخافی) تیار کی، جس میں ۹۹۰ ستاروں کی کیٹلاگ تھی، کتاب ''تذکرہ فی علم الہیئت'' میں اس نے چاند اور کروں کی حرکت (مرکری اور وینس) پر بطلیموس کے فرسودہ نظریات کو رد کر کے ایک جدید سسٹم تجویز کیا، جس کے مطابق کروں کے مدار بیضوی بنتے تھے، اس کو بنیاد بنا کر جوہانس کیپلر (heliocentric) نے اپنا جدید نظریہ (یعنی آفتاب کا مرکزی ہونا) پیش کیا تھا۔(۱)

(۱) اسلام، سائنس اور مسلمان: ۲۵۰

جدید محققین جیسے ایڈورڈ کینیڈی اور آٹو نیوگے برگر نے تسلیم کیا ہے کہ پرنیکس (وفات ۱۵۴۳ء) نے جدید اسٹرانوی کی جو عمارت تعمیر کی تھی وہ صرف اقلیدس کی کتاب ''عناصر'' اور جالینوس کی کتاب ''المجسطی'' کے مطالعہ سے ہی ممکن نہ ہوئی تھی، بلکہ اس میں دو تھیوریں کا بہت دخل تھا، یہ تھیوری کو پرنیکس سے تین سال قبل اسلامی مما لک میں وضع کی گئی تھی جن کا مقصد یونانی علم ہیئت کی اصلاح تھا۔ تھیوری آف نصیر الدین کا نا م tusi couple بھی ہے، جسے عالم بے بدل نصیر الدین الطّوسی نے ۱۲۴۷ء میں وضع کیا تھا، اس تھیورم کی وضاحت کے لئے انٹرنیٹ سے استفادہ کیا جا سکتا ہے، جہاں اس موضوع پر معلومات کا بیکراں ذخیرہ موجود ہے، مختصر یہ کہ یہی تھیورم کو پرنیکس نے سولھویں صدی میں اپنی شاہکار کتاب میں پیش کی اور جہاں الطّوسی نے اپنی ڈایا گراما میں ''الف'' لکھا تھا، پرنیکس نے اسے ''A'' لکھا، جہاں الطّوسی نے ''ب'' لکھا تھا اس نے ''B'' لکھا اور ہو بہو یہ ڈایا گرام پیش کیا۔

اس سلسلہ کی دوسری تھیوری کا نام الازدی ہے تھیورم al urdi ہے جو محی الدین الازدی (وفات ۱۲۶۶ء) نے ۱۲۵۰ء میں پیش کیا تھا، حیرانگی کی بات ہے کہ یہی تھیورم کو پرنیکس کی کتاب میں تین سو سال بعد نظر آتا ہے، طرفہ یہ کہ الازدی نے یہ تھیورم ایک نئے تصور کی صورت میں پیش کر کے اس کا حسابی ثبوت بھی پیش کیا، جب کہ پرنیکس نے اس کا ثبوت پیش نہیں کیا۔

مسلمان ریاضی دانوں کو اقلیدس کے پانچویں مفروضے کو دریافت کرنے کا بہت شوق تھا، اس ضمن میں نصیر الدین الطّوسی نے ایک جیومیٹرک کنسٹرکشن دریافت کیا، الطّوسی کی اس دریافت کو نیوٹن سے پہلے، برطانیہ کے عظیم ریاضی داں جان والس (۱۶۱۶-۱۷۰۳) walis نے اپنی ریسرچ میں استعمال کیا، اس کے بعد ایک اور ریاضی داں (۱۶۶۷-۱۷۳۳) sacchri نے بھی استعمال کیا، مگر کسی نے بھی اس کا کریڈٹ الطّوسی کو نہ دیا۔(۱)

(۱) اسلام، سائنس اور مسلمان: ۲۵۴، ۱۰۰ عظیم مسلم سائنسداں: ۵۰۰، موسوعۃ علماء العرب والمسلمین: ۲۰۷

۱۵۔ ویجن بن رستم الکوہی (ابوسہل القوہی) (۳۹۱ھ-۱۰۰۰ء)

ابوسہل ویجن ابن رستم طبرستان کے پہاڑی علاقہ القوہی یا کوہی میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے یہاں حاصل کی، پھر بغداد کا رخ کیا، مشہور بویہی خلیفہ عضد الدولۃ اوراس کے بعد اس کے جانشین شرف الدولۃ نے القوہی کی بہت عزت افزائی کی اور سائنسی تحقیقات کے لئے مقرر کیا۔

اس کی شہرت کی ابتداء شرف الدولۃ کے ۹۸۸ء میں اسے سات سیاروں کے مشاہدہ کے لئے دیگر سائنسدانوں کی ایک ٹیم کے ساتھ مقرر کرنا تھا، یہ رصدگاہ شاہی محل کے باغ میں تیار کی گئی اوراس میں القوہی ہی کے بنائے ہوئے آلات نصب کئے گئے، انہیں اس رصدگاہ کا افسر اعلی مقرر کیا گیا، جون ۹۸۸ء میں یہاں پہلی مرتبہ مشاہدہ کیا گیا، اس موقع پر ان کے علاوہ دیگر سائنسداں اور بھی تھے، انہوں نے نہایت درستگی کے ساتھ برج سرطان میں سورج کے داخل ہونے کا حساب لگایا، اس کے تقریبا تین ماہ کے بعد سورج کے برج میزان میں دخول کا مشاہدہ بھی کیا گیا۔

البیرونی نے بھی لکھا ہے کہ ۹۸۹ء میں شرف الدولۃ کی وفات کے ساتھ ہی رصدگاہ کی سرگرمیاں بھی ختم ہوگئیں۔

القوہی جسے عمر خیام ایک عظیم ریاضی داں قرار دیتا ہے نے زیادہ تر جومیٹری کے میدان میں خدمات انجام دی ہیں، اس نے زیادہ تر جومیٹری کے مسائل کو حل کیا ہے جنہیں دو سے زیادہ درجے کی مساواتوں میں تحویل کیا جاسکتا ہے۔

نصیر الدین الطّوسی نے ارشمیدس کی تصنیف ''کرہ اور بیلن'' کے ساتھ ایک ضمیمہ منسلک کیا ہے اوراس میں درج ذیل نوتحریر کیا ہے ''کسی دیئے گئے کرے کے برابر ایک کروی قطعہ بنانے کے لئے ارشمیدس کے بیان کردہ مسئلوں سے مشابہ لیکن ان سے کسی قدر زیادہ مشکل مسئلہ القوہی نے ایک متساوی الجوانب ہذلولی اور قطع مکانی کے تقاطع سے دو نامعلوم لمبائیاں تشکیل دیں اوران شرائط پر سختی سے بحث کی جن کے تحت اس مسئلے کو حل کیا جاسکتا''

"رسالة فی استخراج ذی المسبھع المتساوی الاضلاع فی دائرة" میں بھی اسی صحت کو پیشِ نظر رکھا لیا ہے اور اس میں بیان کیا گیا طریقہ اس طریقے کے نسبت زیادہ مکمل ہے جو ارشمیدس سے منسوب کیا جاتا ہے، القوہی کے طریقے میں زاویاتی نسبت ۴:۲:۱ کی حامل مثلث معلوم کرنے کو بنیاد بنایا گیا ہے۔

"رسالہ فی استخراج مساحت المجسم المکانی" میں بھی القوہی نے ارشمیدس کی نسبت سادہ اور واضح حل پیش کیا ہے، اس کا کہنا ہے کہ وہ اس موضوع پر صرف ثابت ابن قرہ کی تحریر سے متعارف تھا، اور تین مسئلوں میں اس نے زیادہ مختصر اور شستہ طریقہ پیش کیا ہے، ان طریقوں میں سے کسی میں بھی ایک معین کے گرد قطع مکانی کی گردش سے پیدا ہونے والے مکانی مجسموں (paraboloids) کا حساب نہیں لگایا، یہ کام سب سے پہلے ابن الہیثم نے کیا جو ثابت اور القوہی کی تحریروں سے متاثر تھا، اگر چہ القوہی کا طریقہ نامکمل تھا؛ لیکن ابن الہیثم اس سے بے حد متاثر نظر آتا ہے۔

القوہی وہ پہلا اسکالر ہے جس کے یہاں مخروطی پرکار کا بیان ملتا ہے، اس پرکار کی ایک ٹانگ کو مخروطی تراشوں کی ڈرائنگ کے لئے چھوٹا یا بڑا کیا جا سکتا ہے، اس تصنیف یعنی "رسالہ فی البرکار التام" میں اس نے پہلے اس پرکار کی مدد سے سیدھی لائنوں، دائروں اور مخروطی تراشوں کی ڈرائینگ کے طریقے بیان کئے ہیں اور پھر اس کی تھیوری پر بحث کی ہے، آخر میں اس نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اب اس کی مدد سے اصطرلاب، دھوپ گھڑیال اور اس طرح کے دوسرے آلات آسانی سے تیار کئے جا سکتے ہیں، البیرونی نے اپنے استاذ ابونصر منصور ابن عراق سے اس کی تصنیف کی نقل طلب کی تھی اور البیرونی کی ایک تحریر میں ابن الحسین القوہی کی تصنیف کا حوالہ ملا ہے، نقل حاصل کرنے کی سعی لا حاصل کے بعد ابن الحسین نے اس موضوع پر ایک کمتر تحریر قلم بند کی، القوہی عالم اسلام کا ایک مایہ ناز سائنس داں تھا۔(۱)

(۱) ۱۰۰ اعظیم مسلم سائنسداں: ۵۰۴

علم ریاضی میں مسلمانوں کے کارنامے

(۱) احمد بن عبداللہ حبش حاسب (۲۱۲ھ/۸۳۰ء)

احمد عبداللہ فن ریاضی کا ماہر تھا، وطن ایران کے کسی علاقے میں تھا مگر بغداد آ گیا، ہارون الرشید کا زمانہ تھا، ہر طرف علم وفن کے چرچے تھے، اہل علم وفضل کی قدردانیوں کے سبب ہر طرف سے صاحبانِ علم وکمال اُمڈ چلے آ رہے تھے، احمد عبداللہ حاسب نے بھی عزت کی جگہ حاصل کر لی، حاسب نے مامون الرشید کا زمانہ بھی دیکھا۔

حاسب کو علم ریاضی سے خاص دلچسپی تھی اور علمِ حساب میں تو کمال رکھتا تھا، اس لئے ''حاسب'' کے لقب مشہور ہوا یعنی حساب کرنے والا۔

علمی خدمات اور کارنامے

احمد عبداللہ حاسب فن ریاضی کا ماہر تھا اور علم ہندسہ میں اسے کمال حاصل تھا، اس فن میں اس نے کئی دریافتیں کیں، علم المثلث یعنی ٹرگنومیٹری (Trigonometry) کا محقق اور زاویئے کی چھ مشہور نشستوں میں فصل جیوب (co - tangent) کے طریقے دریافت کرنے والا گذرا ہے، اس نے قاطع (Secant) کو پہلی مرتبہ معلوم کیا اور ٹرگنومیٹری میں اسے درج کیا۔

حاسب نے علم ریاضی میں ایک بہت بڑا کام کیا کہ اس نے ٹرگنومیٹریکل نقشہ (Trigonometrical tables) بڑی تحقیق کے بعد مرتب کیا اور اسے رواج دیا، ٹرگنومیٹری ٹیبل آج بھی انجنیرنگ میں بنیادی طور پر آ رہا ہے، حاسب کا اس فن پر بڑا احسان ہے۔(۱)

---

(۱) موسوعة علماء العرب والمسلمين : ۷۴

(۲) حجاج بن یوسف مطر (۲۱۴ھ-۸۳۳ء)

حجاج بن یوسف مطر علمِ ہندسہ (جامیٹری) کا ماہر تھا، اس فن میں اس نے کمال پیدا کیا، حجاج بن یوسف دیہات کا باشندہ تھا، والدین تو کچھ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے، لیکن حجاج نے اپنے شوق اور اپنی محنت سے اچھی تعلیم حاصل کی، پھر دیہات کے تنگ دائرے سے نکل کر ۷۸۶ء میں بغداد گیا اور یہیں بس گیا۔

حجاج نے بغداد کے علمی ماحول سے پورا فائدہ اٹھایا اور بغداد کی علمی صحبتوں سے مستفید ہو کر اپنی قابلیت اور استعداد میں اچھا اضافہ کرلیا، حجاج نے ہارون الرشید اور مامون دونوں کا روشن دور دیکھا؛ مگر وہ خاموش علمی کام کرتا رہا۔

علمی خدمات اور کارنامے

حجاج ایک بلند پایہ ریاضی داں تھا، اس نے دو بنیادی کام کئے، ایک تو علمِ ہندسہ یعنی جومیٹری کا کام تھا اور دوسرا علم ہیئت سے متعلق تھا، اس نے ان دونوں علم کو نئے ڈھنگ سے فروغ دیا، جومیٹری میں اس نے نئے نئے انکشافات کئے اور اپنا ایک علمی حلقہ بنالیا، اس وقت علم ہندسہ میں اس کا کوئی ہمسر نہ تھا۔

علمِ ہندسہ میں ایک جامع کتاب ''مقدمات اقلیدس'' کے نام سے اس ریاضی داں نے مرتب کی، یہ ریاضی دانوں پر بہت بڑا احسان ہے۔

دوسرا کارنامہ اس کا علم ہیئت سے متعلق ہے، قدیم زمانے کی مشہور کتاب ''المجسطی'' کو اصلاح اور تصحیح کے ساتھ نئی ترتیب سے اس نے مرتب کیا اور اس کو نئے انداز سے فروغ دیا، اہل یورپ نے حجاج کی دونوں کتابوں سے فائدہ اٹھایا، ''مقدمات اقلیدس'' کا ترجمہ ملک ڈنمارک سے ۱۸۹۳ء میں شائع کیا گیا تھا، اس کی کتابیں بیسویں صدی تک مدارس کی زینت بنی رہیں۔حجاج نے اور بھی بہت سی کتابیں ریاضی پر لکھی ہیں۔

(۳) محمد بن موسیٰ خوارزمی ۲۳۲ھ/۸۵۰ء

محمد بن موسیٰ خوارزمی علم ریاضی کا زبردست ماہر اور الجبرے کا موجد مشہور ہے، خوارزمی ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتا تھا، وہ خوارزم (خیوا) کا باشندہ تھا؛ لیکن اپنے

علمی شوق، اعلیٰ قابلیت اور مجاہدانہ زندگی کے سبب علمی دنیا میں وہ آفتاب ومہتاب بن کر چمکا۔

وطن میں خوارزمی بالکل غیر معروف تھا، فنی کتابوں کے مطالعے میں وہ ہمہ تن مصروف رہتا تھا، علم ریاضی میں اس نے کمال پیدا کیا، یہ سچ ہے کہ جن شخصیتوں نے دنیا کے پردے پر اپنے اعلیٰ فن اور عمدہ استعداد کا مظاہرہ کرکے ایک عالم کو فائدہ پہنچایا، ان میں اول اول نام خوارزمی کا ہی نظر آتا ہے۔

بیت الحکمت کے لئے مقالہ

عالی دماغ خوارزمی اپنے وطن سے بغداد آیا، مامون الرشید کا دور تھا اور بیت الحکمت یعنی سائنس اکاڈیمی (scince academy) قیام عمل میں آچکا تھا، قابل ترین حکماء علمی تحقیق اور ریسرچ میں مصروف تھے۔

حوصلہ مند خوارزمی بغداد کی علمی محفلوں سے متاثر ہوا، اس نے سائنس اکاڈیمی کے ممبر بن جانے کے لئے کوششیں شروع کردیں، اس کے جدت پسند دماغ نے ایک نیا طریقہ نکالا، خوارزمی نے علمِ ریاضی پر ایک گہرا مقالہ شب وروز کی دیدہ ریزی سے تیار کیا اور اس ریاضی کے مقالہ کو مرتب کرکے سائنس اکاڈیمی میں بھیج دیا، خوارزمی کا یہ طریقہ آج بھی یونیورسٹیوں میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔

خوارزمی کا مقالہ سائنس اکاڈیمی میں پیش ہوا اور پسند کیا گیا، خوارزمی کو بلایا گیا اور اس علمی مجلس میں اس سے سوالات کئے گئے اور پھر اسے سائنس اکاڈیمی کا ممبر چن لیا گیا، یہی طریقہ یونیورسٹیوں میں آج بھی رائج ہے ۔

علمی خدمات اور کارنامے

محمد بن موسی خوارزمی فن ریاضی میں بہت قابل تھا، دربار میں اس کی قابلیت کا سکہ رواں تھا، مامون الرشید نے خوارزمی سے فن ریاضی پر ایک کتاب لکھنے کی فرمائش کی، خوارزمی نے پوری تحقیق کے بعد دو کتابیں مرتب کیں، ایک ''علم الحساب'' یہ کتاب علمِ ہندسہ میں ہے، اس میں ریاضی کے نئے نئے نکتے بیان کئے گئے ہیں

اور بہت سے نئے نئے فائدے اور اصول بتائے ہیں، مامون نے بہت پسند کیا اور انعام واکرام سے نوازا۔

دوسری کتاب ''الجبر والمقابلہ'' ہے، یہ اہم کتاب اپنے فن میں بے مثل ہے اورالجبرے پر بنیادی کتاب سمجھی جاتی ہے، سچ تو یہ ہے کہ خوارزمی الجبرے کا موجد ہے۔(۱)

مولانا شبلی نعمانی فرماتے ہیں کہ

> ''علم جبر ومقابلہ'' پر اسلام اول جو کتاب لکھی گئی ہے، وہ اسی عہد کے ایک مشہور عالم محمد بن موسی خوارزمی نے مامون کی فرمائش پر لکھی، یہ تصنیف آج بھی موجود ہے اور اس قدر جامع ومرتب ہے کہ علماء اسلام نے جبر ومقابلہ میں سینکڑوں کتابیں نادر تصنیف کیں؛ لیکن اصل مسائل میں اس سے زیادہ ترقی نہ کر سکے''

خوارزمی نے جو اصول او رقاعدے دریافت کئے، آج بھی اسکولوں کی اعلیٰ جماعتوں اور کالجوں میں وہی قاعدے پڑھائے جاتے ہیں۔

خوارزمی کی پہلی کتاب ''حساب'' یہ بھی اپنے فن کی واحد کتاب ہے، یورپ کے دانشوروں نے علم ہندسہ کی حقیقت اور اہمیت کو اس کتاب کے ذریعہ سمجھا۔

چودھویں صدی تک یورپ میں بالکل جہالت تھی،خوارزمی نویں صدی کا دانشور ہے،اس کی کتاب چودھویں صدی میں یورپ پہنچی تو اہل یورپ کی آنکھیں کھل گئیں۔

یورپ میں اس جہالت کے دور میں رومن ہندسے رائج تھے جو بالکل ناممکن اور غلط اصولوں پر قائم تھے، یورپ کے دانش وروں نے خوارزمی کی کتابیں دیکھ کر اپنی خرابیوں کو سمجھا اور اپنے حساب کتاب کے اصولوں کو یکسر بدل دیا،اہل یورپ نے عربی ہندسوں کو فورا قبول کرلیا، یہ ہندسے ''عربک فیگر'' کہے جاتے ہیں (arabic figure) رومن ہندسے اور عربک فیگر کا مقابلہ کر لیجئے، ایک سو ساٹھ لکھنا ہے اوراڑتیس لکھنا ہے۔

---

(۱) علماء العرب والمسلمين :۱۲۹

عربی طریقہ	رومن طریقہ
۱۶۰	clx
۳۸	xxxvlll

دونوں قسم کے ہندسے کے فرق کو آپ دیکھ لیجئے، رومن طریقے سے جمع کرنا، تفریق اور ضرب کرنا کتنا مشکل ہوگا؛ بلکہ ناممکن؛ لیکن عربی طریقہ فطری ہے اور آسان تر ہے۔

خوارزمی کی کتابیں بہت پہلے یورپ پہنچ چکی تھیں اور ان کا ترجمہ بھی لاطینی زبان میں اس وقت ہوگیا تھا، یہ چودھویں صدی کے بعد کا زمانہ تھا، پھر اس کا انگریزی اور دوسری زبانوں میں ترجمہ شائع ہوا، انگریزی اور دوسری زبانوں میں ترجمہ شائع ہوا، انگریزی کا ترجمہ روزن (rozen) نے لندن سے ۱۸۳۱ء میں پہلی بار بڑے اہتمام سے چھپایا، ۸۵۰ء میں وفات پائی۔

(۴) ابوالوفاء محمد بن احمد بوزجانی ۳۹۸ھ/۱۰۱۱ء

محمد بن احمد بوزجانی تعلیم یافتہ خاندان کا ممبر تھا، اس نے ابتدائی تعلیم اپنے ماموں سے حاصل کی، علم کے فطری شوق نے اسے اور آگے بڑھایا اور اعلیٰ تعلیم کے لئے ۹۶۰ء میں وہ بغداد گیا، یہاں نصاب کے مطابق اعلیٰ تعلیم ختم کی اور پھر مطالعہ اور تحقیق میں مصروف ہوگیا۔

بوزجانی کو علمِ ریاضی اور علم ہیئت دونوں سے کمالِ دلچسپی تھی، اپنے شوق سے اس نے اپنی علمی استعداد میں کافی اضافہ کیا اور ایک اچھا سائنسداں بن گیا۔

بویہ خاندان کا حکمراں عضد الدولۃ بڑا علم دوست تھا، اس کی قدر شناسی اور حوصلہ افزائی کے باعث احمد بوزجانی دنیاوی تفکرات سے آزاد ہوکر اپنے علمی مشاغل میں ہمہ تن مصروف رہا اور آرام سے زندگی بھی گذاری۔

علمی خدمات اور کارنامے

ابوالوفاء بوزجانی بڑا عالی دماغ تھا، اس کا شمار اس دور کے عظیم ریاضی دانوں میں ہوتا ہے، اس نے الجبرا اور جیومیٹری میں دائرے کے اندر مختلف ضلعوں کی منتظم کثیر

الاضلاع بنانے کے مسائل قدیم زمانے میں ریاضی دانوں میں مقبول اور مشہور تھے، ان کثیر الأضلاع میں سے چھ ضلعوں کی شکلیں، آٹھ ضلعوں کی شکلیں، پانچ ضلعوں کی شکلیں اور دس ضلعوں کی شکلیں تو بنائی جا سکتی ہیں اور رائج ہیں۔

لیکن سات ضلعوں کی شکلیں جس کو علم ریاض میں منتظم سبع (regular hedtagon) کہتے ہیں، ہر ضلع کے دونوں نقاط مرکز پر ۳۶۰/۷ یعنی ۵۱۳/۷ درجے کا زاویہ بناتے ہیں، جس کا پرکار سے بنانا ناممکن ہے، اس لئے جیومیٹری کے ماہرین کی جملہ کوششوں کے باوجود دائرے کے اندر ایک منتظم السبع بنانے کا مسئلہ ناقابل حل سمجھا جاتا تھا۔

ابوالوفاء بوزجانی کی ذہانت نے نہ صرف اس مسئلہ کا حل دریافت کرلیا؛ بلکہ جتنا یہ مسئلہ پیچیدہ اور مشکل سمجھا جاتا تھا، اس قدر اس کا حل صاف اور سادہ بتادیا، حقیقت یہ ہے کہ یہ بوزجانی کی ریاضی دانی میں مہارت کا کمال تھا۔

سورج کی کشش اور نئی دریافتیں

بوزجانی علم ہیئت کا بھی ماہر تھا، اس علم میں اس نے چند خاص دریافتیں کیں، اس نے ثابت کیا کہ سورج میں کشش ہے اور چاند گردش کرتا ہے۔

اس نظریئے کے تحت اس نے یہ قابل دریافت کیا کہ زمین کے گرد چاند کی گردش میں سورج کی کشش کے اثر سے خلل پڑجاتا ہے اور اس وجہ سے دونوں اطراف میں زیادہ سے زیادہ ایک ڈگری پندرہ منٹ کا فرق ہوجاتا ہے، اسے علمِ ہیئت کی اصطلاح میں (Evectiont) یعنی چاند کا گھٹنا کہتے ہیں۔

اس اختلالِ قمر کے بارے میں بوزجانی نے دنیا میں پہلی بار اپنا یہ نازک نظریہ پیش کیا، یہ اس کی اہم دریافت تھی، اس نظریئے کی تصدیق سولہویں صدی میں مشہور ہیئت داں ٹیکو برائی نے کی اور اسے اہمیت دی، لیکن اہل مغرب اس دریافت کا سہرا ٹائیکو برا کے سر باندھتے ہیں اور یہ قطعی غلط اور دھوکہ ہے، آج سے چھ سو سال قبل ابو الوفاء بوزجانی اس نظریئے کو پوری تفصیل کے ساتھ ثبوت اور دلائل کے ساتھ بیان کرچکا

تھا۔

تیسرا کارنامہ

بوزجانی کا تیسرا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے زاویوں کے جیب (sine) معلوم کرنے کا ایک نیا کلیہ دریافت کیا اور اس کی مدد سے ایک درجے سے لے کر ۹۰ درجے کے تمام زاویوں کے جیوب کی صحیح صحیح قیمتیں آٹھ درجے اعشاریہ تک نکالیں، اس سے پہلے ان کی قیمتیں اتنے درجہ اعشاریہ تک نہیں نکالی جاسکتی تھیں، یہ بھی اس کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔(۱)

(۵) ابوالحسن علی احمد نسوی ۴۴۰ھ-۱۰۳۰ء

علی بن احمد مقام ''نسا'' میں پیدا ہوا اور اسی نسبت سے نسوی مشہور ہوا، ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی اور پھر ''رے'' چلا گیا، ''رے'' اس عہد میں علمی مرکز بن چکا تھا، نسوی نے اپنی عمر کا پورا حصہ اسی بارونق شہر کی محفلوں اور مجلسوں میں گذار دیا۔

یہ عہد بویہ خاندان کے مشہور بادشاہ فخر الدولۃ (۱۰۱۲ء) کا تھا، فخر الدولۃ علم دوست بادشاہ اور اہل علم کا قدرداں تھا۔

احمد نسوی کو علم ریاضی سے خاص دلچسپی تھی، اس فن میں اس نے کمال پیدا کیا، سچ تو یہ ہے کہ وہ علمِ ریاضی کا زبردست ماہر اور امام تھا، وطن ''نسا'' (خراسان) صحیح صحیح ولادت اور وفات نہ معلوم ہوسکی، اندازاً ۱۰۳۰ء کا عہد ہوگا۔

علمی خدمات اور کارنامے

جذر اور جذر المکعب کے طریقے کا موجد

علمِ حساب میں نسوی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے جذر المکعب کے طریقے کا موجد کے وہ خاص طریقے معلوم کئے جواب تک کسی کو معلوم نہ تھے، جذر اور جذر المکعب نکالنے کے طریقے موجودہ دور میں بھی رائج ہیں اور آج بھی نسوی کا دریافت شدہ طریقے ہی مستند اور بہتر مانا جاتا ہے۔

---

(۱) موسوعة علماء العرب والمسلمين :۹۹

حسابِ ستین کی ایجاد اور اعشاریہ

نسوی کی دوسری قابلِ ذکر تحقیق حساب ستین ہے، حساب ستین اور حساب اعشاریہ میں مطابقت پیدا کیا، یہ اس کی ذہانت کا کمال ہے کہ حساب ستین ایجاد کر کے کئی مسائل حل کر دیئے۔

آج کل سائنس داں نسوی کے اصول پر چھوٹے چھوٹے پیمانوں کی تقسیم در تقسیم عموماً دس دس کی نسبت سے کرتے ہیں، جس کو ''اعشاریہ'' کہتے ہیں، نسوی نے یہ دونوں طریقے دریافت کر کے علم ریاضی میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔

وقت کی تقسیم اور اس کا پیمانہ

آج کل وقت کو خاص اہمیت حاصل ہے، وقت کی تقسیم اور اس کے لئے پیمانے کی دریافت نے آج سائنس کو کس قدر ترقی دی ہے، یہ سب احمد نسوی کا احسان ہے۔

احمد نسوی کے زرخیز دماغ نے وقت کی تقسیم در تقسیم کے لئے ایک طریقہ نکالا اور یہ طریقہ حساب ستین کا تھا، یہ وقت کی پیمائش کا معیاری طریقہ تھا، اس طریقے میں یہ خوبی بھی تھی کہ اس نے قدیم اور جدید دونوں میں مطابقت پیدا کر دی۔

مثلاً: احمد نسوی وقت کی ایک ساعت (گھنٹہ) یا زاویئے کے ایک درجہ کو ساٹھ پر تقسیم کر دیتا ہے، ساٹھ ویں حصہ کو وہ ''دقیقہ'' کہتا ہے؛ کیوں کہ ساٹھ سے تقسیم کے بعد بچا ہوا یہ حصہ خفیف اور کم رہ جاتا ہے، یعنی تھوڑا چھوٹا، دقیقہ کے لفظی معنی بھی خفیف یا تھوڑا باریک شئ کے ہیں، گویا یہ چھوٹے چھوٹے حصے ہیں جو مل کر ساعت بن جاتے ہیں۔

نسوی اس دقیقہ کو بھی دوبارہ تقسیم کرتا اور ٹکڑے بناتا ہے اور اس دقیقہ کی دوبارہ تقسیم ہوتی ہے تو چوں کہ یہ تقسیم دوسری بار عمل میں آتی ہے اور دوسرے کو عربی میں ثانیہ کہتے ہیں، اس لئے دوسری بار کی تقسیم کے حاصل کا نام ثانیہ رکھا گیا اور اس طرح ساعت کی دقیقہ اور ثانیہ دو قسمیں ہو گئیں تو گویا یہی وقت کا پیمانہ بنا۔

ازمنۂ وسطی میں مسلم سائنسداں کی یہ کتابیں جب یورپ پہنچیں اور وہاں کے حکماء اور دانشوروں نے مسلمانوں کے پورے علمی خزانے سے فائدہ اٹھانے کی کامیاب کوشش

کی اور تمام علمی کتابوں کے ترجمے کر لئے ؛ لیکن اس ترجمے میں انہوں نے عربی اصطلاحات کو قائم رکھا، انہوں نے اصطلاحات کے لئے الگ لفظ نہیں نکالا ؛ بلکہ اس سے فائدہ اٹھایا۔

دقیقہ کے لئے منٹ (minute) کا لفظ وضع کیا گیا، انگریزی میں منٹ کے معنی بھی چھوٹا، خفیف یا باریک کے ہیں، یہ پہلی تقسیم تھی۔

دوسری تقسیم یعنی ''ثانیہ'' کے لئے انگریزی میں سکنڈ (second) کا لفظ بنایا گیا، یہ لفظ یعنی عدد سکنڈ، ثانی یا ثانیہ کا مرادف ہے۔

مسلم سائنسدانوں کا یہ عظیم کارنامہ ہے کہ انہوں نے وقت کی پیمائش کا طریقہ ایجاد کیا اور وہ بھی اس قدر سادہ اور آسان، ساٹھ سے تقسیم کے ذریعے سکنڈ اور منٹ کی اکائیاں وجود میں آئیں، جو وقت اور زاویئے کی پیمائش میں پوری نئی اور پرانی دنیا میں رائج ہیں۔

دنیا کے آج ایسے لوگ بہت کم ہوں گے جو یہ جانتے ہوں کہ گھڑی کے ڈائل پر جو ہندسے لکھے ہیں اور منٹ (دقیقہ) اور سکنڈ (ثانیہ) ہر تقسیم میں وہ اسی مسلم سائنسداں احمد نسوی کے ذہانت کا کرشمہ ہیں۔

احمد نسوی علم ریاضی کا زبردست ماہر اور امام تھا، اس کی مشہور تصنیف ''عملی حساب'' ہے جسے اس نے بڑی دیدہ ریزی اور قابلیت سے مرتب کر کے پہلے فارسی زبان میں لکھا، پھر عربی میں اسے منتقل کر دیا۔(۱)

(۶) الکاشی غیاث الدین جمشید مسعود الکاشی (۸۳۲ھ-۱۴۲۹ء)

ان کا اصل نام غیاث الدین جمشید مسعود الکاشی ہے۔

علمی خدمات اور کارنامے

الکاشی کی عربی، فارسی تصانیف کی تاریخی ترتیب پوری طرح معلوم نہ ہوسکی ؛ البتہ وہ بعض کتابوں کی تکمیل کی تاریخ اور جگہ خود بیان کرتے ہیں، مثلا اجرام فلکی کے سائز اور ان

(۱) موسوعة علماء العرب والمسلمين:۲۰۸

کے مابین فاصلوں کے موضوع پر اس نے کتاب ''سلم السماء'' ایران کے شہر کاشان میں ۱۴۰۷ء کو مکمل کی، انہوں نے اس کتاب کو ایک وزیر کمال الدین محمود کے نام سے معنون کیا تھا۔

اس نے سلطان سکندر کے لئے ایک کتاب مختصر علم درہیئت لکھی۔

الکاشی کی سب سے زیادہ معروف کتاب ''مفتاح الحساب'' جو ۱۴۲۷ء میں لکھی گئی تھی، یہ ابتدائی ریاضی کی حقیقی انسائیکلو پیڈیا ہے جو طلبہ کے وسیع دائرے کے لئے لکھی گئی ہے، اس میں حساب دانوں، زمین کا سروے کرنے والوں، ماہرین تعمیرات، منشیوں اور تاجروں کی ضروریات کو ملحوظ رکھا گیا ہے، اپنے محتویات کے تنوع، مختلف مسائل جس میں جیومیٹری کے مسائل بھی شامل ہیں کے حل میں حساب اور الجبرا کے اطلاق اور بیان کی خوبی وصفائی میں ضخیم کتاب ازمنہ وسطی کے لٹریچر میں بہترین کتاب ہے، صدیوں تک یہ کتاب نصاب تعلیم میں شامل رہی۔

الکاشی کی تعریف کے مطابق علم حساب سے متعلق مقداروں کی مدد سے معلوم مقداروں تک رسائی حاصل کرنے کا نام قواعد کا علم ہے، ''مفتاح السعادۃ'' ایک تمہید کے بعد پانچ حصوں میں منقسم ہے، صحیح اعداد کا حساب، کسور کا حساب، فلکیاتی حساب، مستوری اشکال واجسام کی پیمائش اور الجبرا کی مدد سے مسائل کا حل (خطی ودودرجی مساوات) اور غلط مفروضوں کا اصول کتاب میں بہت سے دلچسپ سوال اور احتیاط سے جس کی کئی مثالیں بھی ہیں۔

''مفتاح الحساب'' کے حصہ اول میں الکاشی نے صحیح اعداد کا جذر نکالنے کا عام قاعدہ بیان کیا ہے، الکاشی نے حسابی قواعد کو ہندسوں کے بجائے الفاظ میں بیان کیا ہے اور اس کا الجبرا بیانیہ قسم کا ہے، اس سلسلہ میں اس نے کسی بھی ثنائی عدد (binomial) کو کسی قدرتی قوت (power) تک بڑھانے کا عام کلیہ اور ثنائی تعاملات کو مسلسل معلوم کرنے کا جمعی قاعدہ بیان کیا ہے، اس نے نام نہاد مثلث پاسکل (poscal,s triangle) کی قیمت ۹ کے لئے بتائی ہے۔

کتاب کے دوسرے اور تیسرے حصہ میں اعشاری کسور (decimal fractions) کا نظریہ قابل ذکر ہے، اس کو پہلے الکاشی نے اپنے ''رسالہ المحیطیة''

میں استعمال کیا تھا، یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ کسی عربی ریاضیاتی تصنیف میں اعشاری کسور لائی گئی ہو، وہ تو دسویں صدی کے وسط میں الاقلیدسی کی تصنیف ''کتاب الفصول فی الحساب الہندی'' میں بھی موجود ہیں اوران کوکبھی کبھی چینی سائنس داں بھی استعمال کرتے رہے، فرق یہ ہے کہ الکاشی نے اعشاریہ کسور کو باقاعدہ رائج کیا جس میں کسور کا ایک ایسا نظام وضع کردیا جائے نظام شتین (sexagesimal) میں ہے کہ؛ تاکہ جس طرح صحیح اعداد کا عمل ہے، اسی طرح کسور کا بھی رائج ہوسکے، الکاشی نے اس کو عام طور پر اعداد کی بنیاد پر اٹھایا، اس لئے یہ نظام تو لوگوں کا جانا پہچانا تھا، کتاب میں متعین اعشاری کسور کا عمل تفصیل سے بیان ہوا ہے،لیکن الکاشی دورانیت (periodicity) کا تذکرہ نہیں کرتا۔

اعشاری کسور کو ظاہر کرنے کے لئے کبھی تو وہ صحیح اعداد سے ان کو ایک عمودی لکیر سے جدا کرتا ہے یا ان کو ہندسوں کے اوپر لکھتا ہے؛ لیکن عام طور پر وہ کم سے کم قوت کا ذکر کرتا ہے، جس کی مدد سے وہ تمام دوسری قوتیں معلوم کرتا ہے، پندرہویں صدی کے نصف آخر اور سولہویں صدی میں الکاشی کی اعشاری کسور ترکی کی، ایک حد تک رائج رہیں، اس کا ذریعہ شاید علی قوشجی بنا جس نے سمرقند میں الکاشی کے ساتھ کام کیا تھا، اورالغ بیگ کے قتل اور بازنطینی سلطنت کے زوال کے بعد وہ قسطنطنیہ میں مقیم ہوگیا، یہ کسور کہیں ایک گمنام مصنف کے بازنینی مجموعہ رسائل میں استعمال ہوئی ہیں، جس کا تعلق پندرہویں صدی سے ہے اور جس کو ۱۵۶۲ء میں وی آنا لایا گیا، اس بات کا امکان بھی موجود ہے کہ یورپ میں اعشاریہ کسور کے رواج میں الکاشی کے خیالات کا کچھ اثر رہا ہو۔

کتاب کے پانچویں حصے میں الکاشی سرسری طور پر اس بات کا ذکر کرتا ہے کہ چار درجی مساواتوں کے لئے مقدار نامعلوم دریافت کرنے کا طریقہ اس نے دریافت کرلیا ہے، اس کو اس نے ستر ایسے مسائل میں استعمال کیا ہے جن کو قدماء یا اس کے معاصرین ہاتھ نہیں لگا سکتے تھے، اس نے اس ارادہ کا اظہار بھی کیا ہے کہ وہ اس موضوع پر ایک الگ کتاب مرتب کرے؛ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تحقیق کو پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکا، الکاشی کی تھیوری مکعب مساواتوں کی اس ہندسی تھیوری کے مماثل رہی ہوگی جو اس سے پہلے ابو

الجود محمد بن لیث مرتب کر چکا تھا، یہ تھیوری کچھ یوں تھی کہ چار درجی مساواتوں کے جذور کی اشکال بنائی جاتیں، اس کے بعد مناسب مخروطی جوڑوں کے خطوط تقطیع کے سروں کے محددات (coordinates) دریافت کئے جاتے۔

الکاشی غیاث الدین جمشید کی وفات ۱۹ رمضان المبارک ۸۳۲ء بمطابق ۲۲ جون ۱۴۲۹ء کو ہوئی۔

(۷) احمد بن یوسف بن ابراہیم (۳۰۰ھ/۹۱۲ء)

احمد بن یوسف بن ابراہیم بن الدایہ المصری کو علم ریاضی کا ایک ماہر سمجھا جاتا ہے اور وہ اپنی عمر کے آخری حصہ میں شہرت کی بلندیوں پر تھا۔

ان کے والد یوسف بن ابراہیم جنہیں ''الحاسب'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، عرب کے مشہور اور باثر علماء میں سے تھے، بغداد ان کا آبائی شہر تھا؛ لیکن ۸۴۰ء میں بغداد کو خیرباد کہہ کر دمشق چلے گئے اور چند سال کے بعد مصر چلے گئے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے، یہی وجہ ہے کہ بغداد میں پیدا ہونے کے باوجود ''المصری'' مشہور ہوئے۔

علمی خدمات اور کارنامے

احمد کی جو تصانیف ملتی ہیں، ان میں نسبت اور تناسب پر ایک رسالہ ہے، مماثل قوسین پر ایک کتاب بطلیموس کی ایک شرح اور اصطرلاب پر ایک تحریر شامل ہے، ان تمام کتابوں کے مخطوطات محفوظ ہیں۔

احمد کی اہم ترین تصنیف اس کا وہ رسالہ ہے جو نسبت اور تناسب کے موضوع پر لکھا گیا ہے، اس کا عربی سے لاطینی میں ترجمہ جرار القرمونی (Gerard of Cremona) نے کیا، بعد میں اس کی بہت سے نقلیں تیار کی گئیں، موجودہ دور میں لاطینی ترجمے کے مسودہ کے نقول انگلستان، اسپین، آسٹریلیا اور اٹلی کے کم از کم گیارہ کتب خانوں میں موجود ہیں اور یورپ کے اتنے کتب خانوں میں اس کی موجودگی قرون وسطی میں اس کی شہرت اور مقبولیت کا منہ بولتا ثبوت ہے، یہ تصنیف بنیادی طور پر اقلیدس کی پانچویں فصل کی شرح ہے اور اس میں اضافے بھی کئے گئے ہیں، نسبت اور تناسب سے متعلق اقلیدس کی بیان

کردہ تعریفوں کو احمد نے تفصیلی اور منطقی استدلال کے ذریعہ حل کیا اور یوں ان کے دائرہ کو وسعت دی۔

احمد بن یوسف کی ریاضیاتی خدمات بھی قابل قدر ہیں، خاص طور پر اس نے جس طرح تناسبی مقداروں کی مختلف صورتوں کے حل اور انہیں کمال احتیاط سے مرتب کیا ہے، وہ اس کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھے گا، حقیقت تو یہ ہے کہ احمد کو منقسم شکل کی ان ۱۸ صورتوں کے حوالے ہی سے یاد رکھا جائے گا۔

اس کی تاریخ وفات بھی تاریخ پیدائش کی طرح پردۂ خفا میں ہے؛ لیکن غالب گمان یہ ہے کہ اس کی تاریخ وفات ۹۱۲ء ہے۔(۱)

(۷) ابوالعباس الفضل بن حاتم النیریری (۳۱۰ھ/۹۲۲ء)

النیریری کا آبائی وطن نیریرہے، جو فارس میں شیرز کے جنوب مشرق میں ایک چھوٹا سے قصبہ ہے، زندگی کا ایک حصہ اس نے بغداد میں گذارا جہاں غالبا وہ عباسی خلیفہ المعتضد کی خدمت میں رہا اور اس کے لئے اس نے موسمیاتی مظاہر پر ایک کتاب ''رسالۃ فی احداث الجو'' لکھی جو زمانہ کی دستبرد سے محفوظ رہی، اس کے علاوہ اس نے اجسام کے مابین فاصلے معلوم کرنے کے آلات پر بھی ایک کتاب لکھی جو دستیاب ہے۔

دسویں صدی کا ماہر کتاب کتابیات ابن الندیم النیریری کو ایک ممتاز ہیئت داں قرار دیتا ہے، ابن القفطی کا یہ بیان ہے کہ وہ ہندسہ اور علم ہیئت میں سربرآوردہ حیثیت کا مالک تھا، مصری ہیئت داں ابن یونس کو اگرچہ النیریری کے فلکیات کے بارے میں خیالات پر اعتراض ہے، تاہم وہ ایک کامل مہندس کے طور پر اس کو احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

علمی خدمات اور کارنامے

ابن الندیم اور ابن القطفی نے النیریری کی طرف آٹھ کتابیں منسوب کی ہیں، النیریری کی زیادہ شہرت اقلیدس کی کتاب ''عناصر'' کی شارح کی حیثیت سے ہے، کتاب ''عناصر'' پر اپنی شرح میں النیریری نے نسبت اور تناسب کا وہی تصور دیا ہے جو

(۱) سو عظیم مسلم سائنسداں: ۱۱۱

اس سے قبل الماہانی نے قائم کیا تھا۔النیر یری کی تصنیف ''رسالۃ فی سمت القبلۃ'' سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ظل زاویہ کی نسبت سے بھی واقف تھا، اور اس کو استعمال بھی کرتا تھا، اس میدان میں کسی اور کا بالخصوص حبش کا اس پر سبقت لے جانا معلوم نہیں۔

النیر یری کی غیر مطبوعہ تصنیف ''اقلیدس کے معروف اصول موضوعہ کا اثبات''

(on the domonstration of the well know postulate bibliotheque nationale arabe 2467,89r-90r of uclid)

(پیرس) (مخطوطہ قومی کتب خانہ، پیرس) کامل طور پر اغانیس پر مبنی ہے، اس میں النیر یری کا استدلال کچھ یوں ہے کہ چوں کہ برابری فطری طور پر نابرابری اولی ہے؛ لہٰذا وہ خطوط مستقیم جو آپس میں فاصلہ برابر رکھتے ہیں، ان خطوط سے اولیٰ ہیں جو فاصلہ برابر نہیں رکھتے، پس اول الذکر مؤخر الذکر خطوط کی پیمائش کا معیار ہے، اس استدلال سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ ابتدائی اصول یہ ہے کہ مساوی فاصلہ پر واقع خطوط کو خواہ کتنا ہی بڑھایا جائے وہ ایک دوسرے کو قطع کریں گے، اس کے ثبوت کے لئے اس نے چار مقدمات قائم کئے، ان میں سے پہلے تین یوں ہیں۔

۱- مساوی فاصلہ پر واقع دو خطوط مستقیم کے درمیان کم سے کم فاصلہ کا خط دونوں خطوط پر عمود ہوگا۔

۲- اگر ایک خط مستقیم دو خطوط کو ملاتا ہوا کھینچا جائے اور وہ دونوں پر عمود ہو تو دونوں خطوط مساوی فاصلہ پر واقع ہوں گے۔

۳- دو مساوی الفاصلہ خطوط کو ملانے والے خط کی ایک جانب واقع اندرونی زاویئے دو قائمہ زاویوں کے برابر ہوں گے۔

یہ تینوں النیر یری نے جو اصول المعتقد کے لئے تحریر کردہ رسالہ جو اس وقت تک موجود ہے؛ لیکن غیر مطبوعہ ہے میں لکھے ہیں، وہ ان کی اولیت کا دعوی کرتا ہے، اس رسالہ کا نام یوں ہے'' ان آلات کا علم جن کی مدد سے ہم ان اشیاء کے فاصلے معلوم کر سکتے ہیں جو ہوا میں بلند یا زمین پر قائم ہوں، نیز ہم کنوؤں اور وادیوں کی گہرائی اور دریاؤں کی

چوڑائی بھی معلوم کر سکتے ہیں، البیرونی کا بیان ہے کہ اس کے علم میں النیر یری واحد شخص ہے کہ جس نے المجسطی کی شرح میں زمانہ کی تاریخ معلوم کرنے کا طریقہ تجویز کیا جس کے معلوم اجزاء مختلف انواع ہوں جن کا تعلق کسی ایک ہی جنس سے نہ ہو، مثال کے طور پر کوئی ایسا دن ہے جس کی تاریخ یونانی، عربی یا فارسی مہینہ میں معلوم ہوتی ہے؛ لیکن اس مہینہ کا نام معلوم نہیں؛ البتہ آپ کسی اور مہینہ کا نام جانتے ہیں جو اس نامعلوم مہینہ سے مطابقت رکھتا ہے، اس طرح آپ ایک سنہ جانتے ہیں جس سے ان دو مہینوں کا تعلق نہیں ہے یا ایک ایسا سنہ جانتے ہیں جس کے مطلوبہ مہینہ کا نام معلوم نہیں۔

النیر یری نے کروی اصطرلاب کی ساخت اور اس کے استعمال پر اپنی کتاب ''فی الاصطرلاب'' کے چار مقالوں میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس موضوع پر عربی زبان میں سب سے زیادہ کامل تحریر سمجھا جاتا ہے۔

ابوالعباس الفضل بن حاتم النیر یری نے بغداد میں ۹۲۲ء کو وفات پائی اور بغداد میں ہی مدفون ہوئے۔(۱)

(۸) حسن بن موسی شاکر

فن تعمیر اور ریاضی میں کمالِ مہارت رکھتا تھا، مامون الرشید المتوکل کے عہد میں گذرا ہے، چونکہ یہ اچھا سیول انجینیئر تھا، شاہِ وقت نے ایک نہر کی کھدائی کا کام اس کے سپرد کیا، یہ نہر زراعت اور پیداوار بڑھانے کے لئے استعمال کی جانے والی تھی؛ چنانچہ حسن نے ہی اس کام کو انجام دیا۔

حسن نہایت ذہین، فطین، فہیم اور حاضر جواب تھا، اس کے کئی ایک واقعات مشہور ہیں۔

ایک دفعہ مامون الرشید کے دربار میں تمام اہل علم و فضل کا مجمع تھا، ان میں حسن بھی موجود تھا، مامون الرشید کو علم اقلیدس سے خاصی دلچسپی تھی، علم ہندسہ پر بحث ہو رہی تھی، مامون الرشید کے اشارے پر خالد بن عبدالملک نے جو علم ریاضی کا ماہر تھا حسن سے کچھ سوالات کئے اور حسن کا امتحان لینا چاہا۔

---

(۱) موسوعة علماء العرب والمسلمین :۱۲۰

حسن محنتی، حوصلہ منداور حاضر دماغ تھا، اب تک اگر چہ اس نے اقلیدس کی کل چھ شکلیں پڑھی تھیں، لیکن محنت اور ذہانت کی وجہ سے اس میں سوالات حل کرنے کا ملکہ پیدا ہوگیا تھا، چنانچہ حسن نے سوالات کے جواب میں بڑی اچھی تقریر کی اور نہایت عمدگی کے ساتھ جواب دیا۔

پھر حسن سے نئے نئے اور مشکل سوالات علمِ ہندسہ سے متعلق پوچھے گئے تو اس نے ان کے جوابات صحیح صحیح دے دیئے، حسن نے اس انداز سے جوابات دیئے تھے کہ اہل دربار حیرت میں رہ گئے اور خود مامون کو بھی حسن کی قابلیت اور صلاحیت پر تعجب ہوا۔

اب حسن اور خالد المز وری میں علمی بحث چھڑ گئی، اس بحث نے طول پکڑا، حسن نئے نئے اعتراضات کرتا تھا، خالد المز وری جھلا گئے، حسن کا یہ طریقہ سوسائٹی کے آداب کے خلاف تھا کہ کسی بزرگ سے بحث کی جائے؛ لیکن مامون لطف اٹھاتا رہا۔

خالد المز وری نے ہارون الرشید سے کہا: دیکھئے حسن مجھ سے بحث کررہا ہے، حالانکہ اس نے صرف چھ شکلیں پڑھی ہیں۔ مامون الرشید نے حسن کی طرف دیکھا اور خاموش ہوگیا۔ حسن پھر بحث کرنے لگا، خالد غصہ سے بھر گیا، حسن نے کہا: آپ نے سب کچھ پڑھ لیا؛ مگر آپ کا علم حاضر نہیں، آپ نئے نئے نکتے پیدا نہیں کرسکتے۔ مامون الرشید نے اب کہا: حسن تم نے ابھی چھ شکلیں پڑھی ہیں، تمہاری تعلیم ابھی نامکمل ہے، حسن اب خاموش ہوگیا اور بحث ختم ہوگئی۔

علمی خدمات اور کارنامے

حسن علمِ ہندسہ (جیومیٹری) میں بڑی مہارت رکھتا تھا، اسے علم فلسفہ اور ہیئت سے بھی خاصی دلچسپی تھی، اس نے کئی ایک انکشافات کئے؛ لیکن علم ہندسہ میں حسن کا خاص کارنامہ یہ ہے جو اس نے مسائل کو حل کرنے کے لئے نئے نئے طریقے اور نئی نئی دریافتیں کیں۔

اور ایک خاص قاعدہ معلوم کرلیا جیسے بیضوی اصول (ellipse) کہتے ہیں۔

(۹) (ابوکامل) شجاع بن اسلم (۳۱۸۹ھ-۹۳۰ء)

ابوکامل شجاع الدین بن اسلم بن محمد بن شجاع کو ''الحاسب المصری'' (مصر کا حساب داں) بھی کہا جاتا ہے، قدیم مسلمان جبر دانوں الخوارزمی کے بعد اسلام کے عظیم ماہرین الجبراء میں ایک نمایاں شخصیت کے مالک ہیں۔

ابن ندیم نے ''الفہرست'' میں اسے دوسرے نامور ریاضی دانوں میں شمار کیا ہے، ان ریاضی دانوں نے عملی عربی اعشاریہ عمومی حساب اور عملی جیومیٹری پر کام کیا، عبدالرحمٰن ابن خلدون کے مطابق ابوکامل نے الخوارزمی کی طرز پر الجبراء تحریر کیا، حاجی خلیفہ نے ابو کامل سے ایک ایسی تحریر منسوب کی ہے جو وراثتی مسائل کے جبری حل سے متعلق ہے۔

علمی خدمات اور کارنامے

ابوکامل کی چودہ تصنیفات اس وقت قلمی صورت میں موجود ہیں، ان میں ایک ''کتاب الطرائف فی الحساب'' بھی ہے، جو جرمن مستشرق زوتر (suter) کے خیال میں اس کتاب کا موضوع غیر معین مساواتوں کا تکمیلی حل ہے، ابوکامل سے بہت پہلے (تقریباً پہلی صدی عیسوی میں) ڈیوفانٹوس (dio phantus) نے ان مساواتوں کی تکمیل کے لئے علتی توضیحات پیش کیں، ابوکامل کے حل ایک ترتیب وار اور سلسلے وار طریقہ کار کے تحت نکالے گئے ہیں۔

ابوکامل کی ''کتاب الخمس والمعشرہ'' الجبرہ اور جیومیٹری دونوں کے حوالے سے دلچسپی کی حامل ہے، اس میں الجبرا کے ذریعے جیومیٹری کے مسائل کا حل پیش کیا گیا ہے، نفس مضمون پر جبریہ رنگ غالب ہے، جس میں چار درجی مساواتوں اور غیر ناطقی سروں والے مخلوط دورخی جملوں کے حل سے بحث کی گئی ہے۔

ایک اور کتاب جو ''کتاب الطرائف فی الحساب'' سے بالکل علاحدہ اور مختلف ہے، غیر معین مساواتوں پر ابوکامل کی بہترین تحقیقات پر مشتمل ہے، اس میں مساواتوں کے حل کو صرف ہندسوں تک ہی محدود رکھا گیا ہے؛ بلکہ بیشتر حل ناطقی شکل میں دیئے گئے ہیں۔

حسابی لحاظ سے چار دلچسپ سوالات جدید ترقیم (notation) میں نیچے درج کیئے جارہے، یہ بات غور طلب ہے کہ ابوکامل نے اپنے سوالات کو لفظوں میں بیان کیا اور اس کے اس مسودے میں حساب سے متعلق جو علامات استعمال ہوتیں وہ صرف ہندسوں پر مشتمل تھیں۔

x2/8x-30 = y2 (1)

x + x2 = y2 (2)

x - x2 = z2

20 + x = y2 (3)

50 - (10-x) = y2

10 + x2 = y2 (4)

10 - x2 = z2

''کتاب فی الجبر والمقابلۃ'' میں دیئے گئے اکثر مسائل الخوارزمی پہلے ہی حل کر چکا تھا، ابوکامل کے تجویز کردہ طریقے کے مطابق xz کا جواب نکالا جاتا ہے، اقلیدس نے مساوات x2 + q = px کو حل کرنے کے لئے x کو p/2 سے چھوٹا فرض کیا تھا، جب کہ ابوکامل نے اسی مساوات کو x کے p/2 سے چھوٹا فرض کیا تھا، جب کہ ابوکامل نے اسی مساوات کو x کے p/2 سے بڑا ہونے کی صورت میں بھی حل کیا۔

ابوکامل پہلا ریاضی سائنسداں ہے جس نے x2 سے بڑی قوتوں کو آسانی سے استعمال کیا، اس نے x (''مربع ، مربع مربع مربع مربع'' (x (''مکعب مکعب'') x (''مربع مربع جذر'') اور x3 (''مکعب'') نیز x2 (''مربع'') کی قوتیں استعمال کیں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ابوکامل کے تجویز کردہ تسمیہ نظام کے مطابق قوت نماؤں کو جمع کیا جاتا تھا، جب کہ اس کے مقابلے میں ہندوستانی نظام تسمیہ میں x6 کو ''مربع مکعب'' کہا جاتا ہے۔

اہل بابل نے الخوارزمی کی طرح جیومیٹری کے جبریہ پہلو پر زیادہ توجہ دی، تاہم

ابو کامل نے نہ صرف الخوارزمی کے طریقے پر زیادہ انحصار کیا؛ بلکہ اقلیدس اور اسکندریہ کے ریاضی داں ہیرو سے بھی استفادہ کیا، نتیجۃً وہ ایک پیچیدہ الجبرے کو مفصل جیومیٹری کے ساتھ یکجا کرنے میں کامیاب ہوگیا، درحقیقت ابو کامل کی تحریریں الخوارزمی کی نسبت زیادہ خالی جب کہ اقلیدس کی نسبت زیادہ علمی ہیں، اس طرح ابو کامل نے مساواتوں کے تکمیلی حل سے متعلق یونانی نظریئے اور قدیم عراقی روایت کو عمل میں لاکر الجبرا کو ایک نئی جہت عطا کی۔

ابوشجاع بن اسلم ۹۳۰ء میں فوت ہوا۔(۱)

(۱۰) (حکیم ابومحمد) العدلی القاینی (۹۷۷ھ/۹۸۷ء)

حکیم ابومحمد العدلی القاینی کی ابتدائی زندگی کے حالات کا کچھ علم نہ ہوسکا، القاینی کو فلکیات سے بڑی دلچسپی تھی ؛لیکن وہ انجنیر نگ کا ماہر تھا؛لیکن وہ علم مساحت میں وہ کمال رکھتا تھا جو ریاضی کی ایک شاخ ہے۔

القاینی کے دور میں محمد بن جابر البنانی دولت علم اور دولت دنیا دونوں سے مالا مال تھا، البنانی نے القاینی کی صلاحیتوں کو سمجھ لیا اور اسے اپنی جماعت میں شامل کرلیا، القاینی نے رصدگاہ کی تعمیر میں کئی نئے نئے آلات ایجاد کئے اور رصدگاہ میں اسے نصب کیا، علم مساحت پر اس کی کتاب مشہور ہے، یہ کتاب علمِ مساحت پر دنیا کی پہلی کتاب شمار کی جاتی ہے، القاینی کا نام اس وجہ سے ریاضی دانوں میں فہرست میں تیسرے نمبر پر آتا ہے۔

جس رصدگاہ میں القاینی تھا، اس عظیم رصدگاہ کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ بغداد میں مامون الرشید کی شاہی رصدگاہ کے بعد اپنی عمدہ کارکردگی میں اس رصدگاہ کو شہرت حاصل تھی۔

حکیم القاینی نے اس رصدگاہ میں عمدہ قسم کے آلات نصب کئے تھے، اس نے اپنے علم اور تجربوں کے ذریعے اجرام فلکی کے باہمی فاصلوں کو صحیح صحیح معلوم کیا، اس نے بعض غلطیوں کی اصلاح کی، القاینی نے اپنے علم اور مہارت کی بناء پر ایک مکمل تاریخ بھی تیار کی۔

(۱) ۱۰۰ عظیم مسلم سائنسداں: ۲۷۰

(۱۱) ابراہیم بن سنان (۳۳۵ھ/۹۴۶ء)

ابراہیم بن سنان ابن ثابت ابن قرہ نے بغداد کے ایک مشہور گھرانے میں آنکھیں کھولیں، مشہور ریاضی داں ثابت بن قرہ اس کا دادا تھا، اس کا باپ سنان ابن ثابت بھی ایک ماہر ریاضی داں تھا اور اسے طب اور فلکیات میں ملکہ حاصل تھا، ابن سنان ۹۰۸ء کو پیدا ہوا، ابن سنان بھی اپنے خاندانی روایت کو بخوبی آگے بڑھایا اور ریاضی اور فلکیات کے مضامین کو نئی جہت دی۔

علمی خدمات اور کارنامے

جواں سالی کی موت کے باوجود ابن سنان نے سائنسی تحقیقات کا ایک قابل قدر ذخیرہ چھوڑا ہے اور اس کی اہمیت کو مشرق و مغرب کے تقریباً تمام سائنس داں مؤرخین نے سراہا ہے، اس کی سائنسی تحقیقات کا دائرہ بہت وسیع نظر آتا ہے، جس میں دائروں کے تماس، سورج کی ظاہری حرکات، شمسی ساعتوں، اصطرلاب اور دوسرے فلکیاتی آلات جیسے موضوعات شامل ہیں، اس نے سایوں کا بصریاتی حوالے سے تجزیہ کیا ہے اور جیومیٹری سے بحیثیت مجموعی بحث کی ہے۔ قطع مکانی کا مسئلہ حل کرتے ہوئے ابن سنان نے اپنے دادا کی پیروی کی ہے، ثابت بن قرہ اس مسئلے کو پہلے ہی ارشمیدس سے مختلف انداز میں حل کر چکا تھا، اس کا طریقہ ہوسکتا ہے کہ اعداد کے میزان کے مترادف ہو، اس کا نقطۂ نظر اس اعتبار سے ارشمیدس سے زیادہ ہمہ گیر تھا کہ اس کے طریقے میں تکمیل (integration) کے وقفوں کو مساوی ذیلی وقفوں میں تقسیم نہیں کیا گیا تھا، ثابت کا ثبوت طویل تھا اور اس میں بیس دعاوی شامل تھے، ایک اور مسلم ریاضی دان الماہانی اس سے مختصر حل پیش کر چکا تھا؛ لیکن ابن سنان اسے نا قابل قبول گردانتا تھا جیسا کہ اس نے لکھا ہے کہ الماہانی کی تحقیق کو اس وقت تک میرے دادا کی تحقیق سے بہتر حیثیت حاصل رہے گی جب تک کہ ہمارے خاندان کا کوئی فرد (ابن قرہ) اس سے بازی نہیں لے جاتا، اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نے نسبتاً زیادہ مختصر انداز میں ثبوت دریافت کرنے کی کوشش کی، ایک ایسا ثبوت جو مہمل میں تحویل پر انحصار کرتا ہو، ابن سنان نے اپنے ثبوت کی بنا جس دعوے پر رکھی

اور جس دعوے کو وہ قبل ازیں ثابت کر چکا تھا، وہ یہ تھا کہ مربوط تحویل کے تحت رقبات کی تناسبیت غیر تغیر پذیر ہوتی ہے۔

یہ عظیم خاندانی سائنسداں بہت کم عمر پا کر ۳۸ سال کی عمر میں ۹۴۶ء کو بغداد میں فوت ہو گیا؛ لیکن اتنی تھوڑی عمر پانے کے باوجود اس کے علمی کارنامے بڑی بڑی عمریں رکھنے والے سائنسدانوں پر بھاری ہیں۔
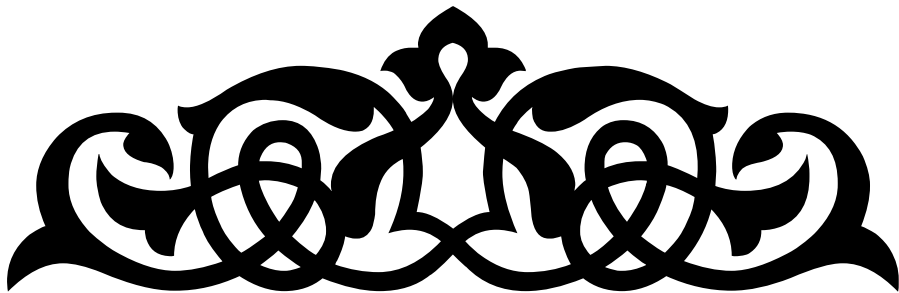
انجینئرنگ میں مسلمانوں کے کارنامے

(۱) احمد بن موسیٰ شاکر (۲۴۰ھ/۸۵۸ء)

مسلم دور میں میکانک گذرا ہے عربی میں اس فن کو ''علم الحیل'' کہتے ہیں، احمد بن موسیٰ نے اس فن میں ایک کتاب بھی لکھی۔

علم ہیئت اور ریاضی اس زمانے میں بہت مشہور ہوئیں، کیمیا پر بھی کام ہوا، لیکن میکانیات پر اس وقت تک کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی تھی، قدیم سائنس داں ارشمیدس کے سوا اور کوئی یونانی دور میں نہ تھا، احمد بن موسیٰ نے اس فن میں حیرت انگیز ایجادات کیں۔

احمد نے گرچہ فلسفہ وحکمت کی تعلیم حاصل کی؛ لیکن صنعت وحرفت سے بہت دلچسپی تھی، اس نے صناعی کے فن میں کمال پیدا کیا۔

علمی خدمات اور کارنامے

احمد جدت پسند تھا اور اس کا ذہن ودماغ صناعی کی طرف راغب تھا، مطالعے اور تجربے کے بعد وہ میکانک انجینئر بنا اور یہ دنیا کا پہلا میکانک انجینئر تھا۔

ہارون الرشید نے جو گھڑی تحفے میں شاہِ فرانس کو بھیجی تھی، اس گھڑی کے صناعوں کا ذکر کہیں تاریخ میں محفوظ نہیں رہا، کہا جاتا ہے کہ یہ گھڑی احمد کی ایجاد ہے۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ احمد نے نازک نازک مشینیں ایجاد کیں، وہ ایک اچھا سیول انجینئر بھی تھا اور علم ریاضی کا بھی ماہر تھا۔

احمد نے میکانیات (علم الحیل) پر ایک اچھی کتاب لکھی، اس فن میں یہ دنیا کی پہلی کتاب مشہور ہے۔

مؤرخ ابن خلکان لکھتا ہے کہ: ''علم الحیل'' احمد بن موسیٰ شاکر کی ایک عجیب کتاب ہے جو نادر باتوں پر مشتمل ہے، یہ ایک جلد ہے، میں نے اس کو بہترین مفید کتاب پایا ہے۔

(۲) ابوطیب سند بن علی ۲۲۴ھ/۸۶۴ء

سند بن علی باکمال ریاضی داں، اچھا سول انجینئر اور دھاتوں کا بڑا ماہر تھا، سند بن علی بغداد میں پیدا ہوا اور یہیں تعلیم پائی، اس علمی ماحول میں اس نے ترقی کی اور بلند ترین درجہ حاصل کیا، وہ نہایت سنجیدہ، متین اور علم نواز تھا۔

علمی خدمات اور کارنامے

خلیفہ متوکل کا عہد تھا، اسے زراعت سے دلچسپی تھی، اس نے ایک نہر کی تیاری کا حکم دیا، نہر کا کام جب تکمیل کو پہنچا تو معلوم ہوا کہ اس میں کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں، خلیفہ متوکل سخت ناراض ہوا اور کہا کہ: اگر غلطی نکلی تو ذمہ دار انجینئروں کو اس جرم کی سزا میں اس نہر کے کنارے پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا اور ان کی جائیداد ضبط کر لی جائے گی۔

خلیفہ نے ابوطیب سند بن علی کو مامور کیا کہ تحقیقات کریں، سند بن علی معاملہ کی اہمیت کو سمجھتا تھا اور جانتا تھا کہ اس کی سزا نہایت سخت دی جائے گی، تحقیقات کے بعد اس نے اپنی رپورٹ اس طرح مرتب کی کہ غلطی ظاہر نہ ہونے پائی اور انجنیئروں کی جان بچی۔

سند بن علی دھاتوں کا ماہر بھی تھا (metalur) اس نے بہت سے قیمتی دھاتوں پر تجربہ کئے اور ان کا صحیح وزن معلوم کرنے کا طریقہ دریافت کیا، اس نے دھاتوں میں کثافتِ اضافی (Specific gravity) کی تحقیق کی، جس سے کھرے اور کھوٹے کا صحیح صحیح پتہ چلایا جاسکتا تھا، کثافتِ اضافی کے نظریئے نے دھاتوں کی صنعت میں انقلاب پیدا کر دیا، وہ آلات رصدیہ کا بھی ماہر تھا، سند بن علی ''بیت الحکمۃ'' کا ممبر بھی تھا اور سائنس کے عناصر اربعہ میں وہ بھی شامل تھا۔

(۳) ابوحاتم مظفر اسفرازی

علم طبعیات کی شاخ علم میکانیات (mechanics) اور ماسکونیات کا باکمال ہنرمند، علم ریاضی کا ماہر، دھاتوں کی قدر پہچاننے والا (metalurgist) قیمتی دھاتوں کا صحیح صحیح وزن معلوم کرنے کا طریقہ دریافت کرنے والا، ایک ایسی نازک ترازو کا موجد جس سے سون اور دیگر قیمتی دھاتوں میں ملاوٹ کا صحیح پتہ چل جائے، ملاوٹ کا چارٹ

تیار کرنے والا، باکمال دانشور، وزن کی ابتدائی اکائی اوقیہ (اونس) اور درہم (اڈرام) قیمتی دھاتوں اور اشیاء کے استعمال کا موجد، وطن، ولادت اور وفات کی صحیح تاریخیں معلوم نہ ہوسکیں۔

اندازا ۱۰۶۷ء میں وفات ہوئی۔

علمی خدمات اور کارنامے

ابوحاتم مظفر اسفرازی علم ریاضی اور ہیئت کا ماہر تھا اور اس نے کئی نئی دریافتیں کیں علم ہیئت اور ریاضی کے ماہر عمر خیام نے ملک شاہ سلجوقی کے عہد میں ایک اچھی رصدگاہ اصفہان میں قائم کرائی تھی، اس رصدگاہ کی نگرانی اور کام کے لئے بہت سے سائنسدانوں اور ماہر انجینیئر وں کی جماعت مقرر کی تھی، ان میں ایک مظفر اسفرازی بھی تھا، یہ علم ہیئت کا ماہر اور اچھا صناع تھا، اس میں اور بھی بہت سی کئی خوبیاں تھیں۔

ہر رصدگاہ (observatory) میں آلاتِ رصدیہ کو بہت اہمیت حاصل ہے، کیوں کہ آسمان کے عجائبات کا مشاہدہ کرنا آسان نہیں ہے، اس کام کے لئے آلات کا صحیح ہونا بھی بہت ضروری ہے۔

ملک سلجوقی کی مذکورہ رصدگاہ اپنی عمدہ کارکردگی کے لحاظ سے مشہور ہے، اس رصدگاہ میں آلاتِ رصدیہ کا انچارج ابوحاتم اسفرازی تھا، وہ ایک جدت پسند اور ماہر انجینیئر تھا۔

اسفرازی علم طبعیات (physics) سے خاص دلچسپی رکھتا تھا، وہ علم طبعیات کی وہ دو مشہور شاخوں میکانیات (mechanics) اور ماسکونیات (hyorostatics) میں دست گاہ کامل رکھتا تھا۔

ایک نازک ترازو کی ایجاد

اسفرازی ایک اچھا صناع تھا، اس کے جدت پسند دماغ نے ایک انوکھے ڈھنگ کی ترازو ایجاد کی، اس نازک ترازو کی خوبی یہ تھی کہ اس کے ذریعہ سونا اور چاندی بنی ہوئی اشیاء اور زیورات میں ملاوٹ کا صحیح صحیح اندازہ چل سکتا تھا، یعنی سونا خالص ہے یا اس میں کچھ ملاوٹ ہے، اگر ملاوٹ ہے تو دوسری دھات کس قدر ہے۔

اسفرازی کی یہ ایجاد کردہ ترازو کثافتِ اضافی (Specific gravity) کے اصول پر مبنی تھی

سونا اور چاندی نیز دیگر دھاتوں کا صحیح صحیح وزن معلوم کرنے کے لئے مسلم ماہرین ایک خاص اصول سے کام لیتے تھے، مثلا سونے کی کثافت اضافی (۱۹ء۳) ہوتی ہے، اور باقی دھاتیں اس سے ہلکی ہوتی ہیں، اب سونے میں اگر چاندی یا تانبا جو کھوٹ کے طور پر ملا دیتے ہیں، یہ دھاتیں سونے سے ہلکی ہوتی ہیں، پس ملی ہوئی دھات کے سبب سونے کی بنی ہوئی اس چیز کی کثافتِ اضافی (۱۹ء۳) نہیں ہوسکتی؛ بلکہ کم ہوجاتی ہے اور اندازہ ہوجاتا ہے کہ اس سونے میں کتنی ملاوٹ ہے۔

اور اگر ملاوٹی دھات کی نوعیت معلوم کرلی گئی تو یہ بھی پتہ چل سکتا ہے کہ اس شے میں اس قدر سونا ہے اور اتنی ملاوٹی دھات ہے۔

کثافت اضافی معلوم کرنے کا طریقہ

کثافتِ اضافی معلوم کرنے کے لئے دو تجربے کرنا ضروری ہے، ایک تجربہ تو یہ ہے کہ اس شئے کا عام وزن صحیح صحیح معلوم کیا جائے اور دوسرے یہ کہ اس شئے کا وزن پانی کے اندر صحت کے ساتھ دریافت کیا جائے اور پھر پانی میں اس کے وزن کی ٹھیک ٹھیک کمی نکالی جائے، اسفرازی نے اس سلسلہ میں جو طریقہ اختیار کیا تھا مثالوں کے ذریعہ اس کی تشریح کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

فرض کیجئے کہ سونے کے ایک زیور کا عام وزن (۸۰) اوقیہ ہے اور پانی میں اس کا وزن (۷۵) اوقیہ ہے، یعنی پانی میں اس کے وزن کی کمی بقدر (۵) اوقیہ ہوجاتی ہے۔

اب اس زیور میں خالص سونے کے ساتھ کچھ حصہ چاندی بھی بطور کھوٹ کے ملی ہے، یہاں یہ معلوم کرنا ہے کہ اس زیور میں کتنے اوقیہ خالص سونا اور کتنی چاندی ہے۔

سونے کی کثافتِ اضافی (۱۹.۳) اور چاندی کی کثافتِ اضافی (۱۰.۵) پہلے سے معلوم ہے، اس لئے اس مثال کے ذریعہ علم ریاضی کے اس سوال کو بآسانی حل کیا جاسکتا ہے۔

مظفر اسفرازی کی ترازو ایک قسم کی ماسکونی ترازو تھی، جس کے ذریعہ دی ہوئی شئے کا عام وزن پھر پانی میں اس کا صحیح وزن معلوم کیا جاسکتا تھا اور دونوں حاصل تفریق سے پانی میں اس کے وزن کی کمی نکالی جاسکتی تھی۔

دھاتوں میں ملاوٹ کا چارٹ

اسفرازی کے زرخیز دماغ نے بہت سی نئی نئی باتیں پیدا کیں، اس نے سینکڑوں تجربے کر کے سونے میں چاندی کی ملاوٹ کے بہت سارے چارٹ تیار کیے، یہ اس کی مہارت کا کمال تھا، اس چارٹ میں چار خانے تھے۔

پہلا خانہ: اس شئے کا وزن

دوسرا خانہ: پانی میں اس کے وزن کی کمی

تیسرا خانہ: سونے کی مقدار کا وزن

چوتھا خانہ: سونے کی مقدار کا وزن

اس نے سونے میں ملاوٹ اور چاندی میں ملاوٹ ، کے سلسلے میں سینکڑوں دھاتوں سے متعلق چارٹ بڑی محنت سے تیار کیا تھا، ان چارٹوں کا تیار کرنا نہایت مشکل اور صبر آزما کام تھا، اس کام میں اسفرازی نے اپنی عمر کے کئی سال صرف کیے تھے۔

انوکھی ترازو کی ایجاد اور چارٹ نے صنعتی اور کاروباری دنیا میں بہت سہولتیں پیدا کردی تھیں۔

اونس، ڈرام

مسلم دور میں تاجروں اور دانشور مختلف اشیاء کو وزن کرنے کے لئے ان دو اکائیوں کا استعمال کرتے تھے، درہم اور اوقیہ۔

چھوٹی چھوٹی اور قیمتی دھاتوں کا وزن کرنا ہوتا تو یہی دو معیار مانے جاتے تھے، اس کا رواج مسلم دور سے آج تک اس سائنسی زمانے میں بھی جاری ہے۔

جب یہ علمی خزانے اسلامی ممالک سے یورپ کی طرف منتقل ہونے لگے تو یہ وزن بھی وہاں پہنچے، چونکہ یہ نہایت مناسب اور موزوں تھے؛ اس لئے ان کو دانشوران یورپ

نے بجنسہ باقی رکھا، کوئی فرق نہیں کیا اور آج بھی ان کا چلن ویسا ہی ہے۔

اوقیہ = اونس بن گیا درہم =ڈرام بن گیا

اس نئے دور میں آج بھی ہسپتالوں میں اونس اور ڈرام کا استعمال ادویہ کو تولنے کے لئے نہایت کثرت سے ہوتا ہے کہ ان کے بغیر کام نہیں چل سکتا، لیکن یہ ہمارے ڈاکٹر اور تاجر شاید ہی جانتے ہوں کہ ان کے روزانہ کے استعمال میں آنے والا یہ وزن اونس اور ڈرام کیا ہے اور کس دور کی یادگار ہے

(۴) (ابوعباس) احمد بن محمد کثیر فرغانی (۲۴۳ھ-۸۵۷ء)

زمین کے محیط کی پیمائش کرنے والوں کی جماعت کا ممبر تھا، طغیانی ناپنے کا آلہ ایجاد کیا، دھوپ کی گھڑی پیش کی، اس نے دھوپ گھڑی (sun dial) ایجاد کی۔

علم ہیئت میں بھی کمال رکھتا تھا، جوامع العلوم کتاب مرتب کی، اس کتاب کے ترجمے ہو چکے ہیں۔

احمد کثیر فرغانی علم ہیئت کا ماہر، کامیاب سول انجینئر اور اچھا صناع تھا۔

احمد کثیر شہر فرغانہ (ترکستان) میں پیدا ہوا، ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بغداد آگیا، تعلیم مکمل کی اور مطالعہ میں مصروف ہوگیا، یہاں کے علمی ماحول میں اس کے جوہر کھلے، اس نے بہت اچھی استعداد پیدا کرلی، مامون الرشید کا زمانہ تھا۔

علمی خدمات اور کارنامے

بغداد علم وفن کا مرکز بن گیا تھا، ہر علم وفن کے قابل ترین لوگ وہاں موجود تھے۔

مامون الرشید علمی ذہن ودماغ رکھتا تھا، اس کے ذہن میں آیا کہ زمین کے محیط کی صحیح صحیح پیمائش کی جائے، چنانچہ اس نے انجینئر وں کی ایک جماعت مقرر کی، اس جماعت نے غور وفکر کے بعد کچھ اصول اور قاعدے بنائے اور طریقۂ کار متعین کئے، ماہرین کی اس جماعت کا صدر احمد کثیر فرغانی تھا، شہر کوفہ کے شمال میں ایک وسیع میدان اس کام کے لئے موزوں سمجھا گیا، اس میدان کو دشت بخار کہتے تھے، اس میدان میں دو مقامات رقہ اور تدر کو منتخب کیا گیا، جملہ آلات اور سامان وہاں مہیا کر دیا گیا۔

زمین کے محیط یعنی گھیر کی صحیح پیمائش کے لئے طریق کار طئے کیا گیا کہ پہلے اصطرلاب اور سدس (sextants) اور دیگر آلات کی مدد کی سے قطب تارے کی بلندی زاویئے کے ذریعے معلوم کی جائے، پھر ایک مقررہ فاصلے تک آگے بڑھ کر قطب تارے کی بلندی کی پیائش کی جائے اور اب دونوں کے فرق کو معلوم کرلیا جائے، اس طرح زمین کے محیط کی پیائش معلوم ہوجائے۔

ماہرین نے پیائش شروع کی اور حساب کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ زمین کا گھیر میل ہے، مامون الرشید بہت خوش ہوا، بیت الحکمۃ کے ممبروں میں فرغانی بھی تھا، اسے بھی کام کا کافی موقع ملا۔

موجودہ زمانے میں جب کہ ہر طرح کی سہولتیں ہیں، نئے نئے آلات ہیں، زمین کے محیط یعنی گھیر کو میل مانا جاتا ہے، مسلم دور کی پیائش اور آج اس نئے دور کی پیائش میں بقدر (151) کا فرق ہے، یعنی کل غلطی صرف (6ء) فیصد پائی جاتی ہے، یہ غلطی کوئی غلطی نہیں ہے۔

فرغانی کو صناعی میں بھی کمال حاصل تھا، اس نے کئی اہم چیزیں ایجاد کیں، طغیانی ناپنے کا آلہ: اس آلہ کے ذریعے دریا کے پانی کا صحیح اندازہ ہوجاتا تھا اور معلوم ہوجاتا تھا کہ سیلاب آنے والا ہے یا نہیں، یہ آلہ دریا میں نصب کردیا جاتا تھا۔

دھوپ کی گھڑی

دوسری چیز جو بہت ضروری تھی، وہ دھوپ کی گھڑی (sun dial) تھی، جس سے دن میں وقت کا صحیح اندازہ ہوجاتا تھا۔

فرغانی نے کئی کتابیں مرتب کیں، مشہور کتاب اس کی ''جوامع علم النجوم'' ہے، اس کتاب کا پہلا لاطینی ترجمہ بارہویں صدی عیسوی میں شائع ہوا، پھر دوسرا ترجمہ جرمنی میں ۱۵۳۷ء میں چھپا اور تیسرا ترجمہ فرانس کے دانشوروں نے ۱۵۴۶ء میں شائع کیا۔(۱)

---

(۱) ۱۰۰ عظیم مسلم سائنسداں: ۱۰۴

عظیم مسلمان فلاسفر

(۱) (ابو یوسف) یعقوب بن اسحاق کندی (۲۵۴ھ-۸۶۸ء)

ابو یوسف یعقوب بن اسحاق الکندی، فلسفی، شاہانِ عرب کا سپوت اور خاندانِ کندی کا نونہال تھا اور اس کا باپ اسحاق بن صباح تینوں خلفائے عباسیہ مہدی، ہادی اور رشید کے زمانے میں کوفہ کا امیر رہا، سلیمان بن حسان کا بیان ہے کہ: مسلمانوں میں کندی کے سوائے کوئی فلسفہ نہ تھا، اس کی مراد شاید یہ ہوگی کہ یہ فلاسفۂ اسلام میں پہلا فلسفی تھا۔

کندی نے اپنی تالیفات میں بالکل ارسطو کا انداز اختیار کیا ہے، اکثر فلسفے کی کتابوں کی شرح لکھی ہے، مشکل مقامات کی توضیح و تلخیص کی ہے، پیچیدہ گتھیوں کو سلجھایا ہے جس سے اس کی ترجمے کی اعلیٰ استعداد کا پتہ چلتا ہے۔

کندی کی اکثر و بیشتر تالیفات فلسفے میں ہیں اور ارسطو کے فلسفے کا شارح ہونے کی حیثیت سے عربوں میں کندی ہی کو شرفِ تقدم حاصل ہے، اس کی یہ شرحیں ان کتابوں میں جو ہم کو دستیاب ہوئیں، منجملہ ان کے ایک کتاب "فی قصد ارسطالیس فی العقلات" ہے اور دوسری ارسطو کی تصنیفات کی ترتیب ہے جس میں اس نے ارسطو کی کتابوں کی تعداد ان کی ترتیب اور ان کے اغراض اور ان چیزوں سے بحث کی ہے جو فلسفے کے حصول کے لئے ضروری ہیں۔

کندی کی وصیتیں

طبیب کو چاہئے کہ وہ خدا تعالیٰ سے ڈرتا رہے، اور مریض کی جان کو خطرے میں نہ ڈالے، کیوں کہ اس کا کوئی بدل ممکن نہیں، جس طرح تم یہ کہنا پسند کرتے ہو کہ خدائے تعالیٰ مریض کی صحت و عافیت کا سبب ہے، اسی طرح سمجھ لو کہ اس کی موت کا سبب بھی وہی ہے۔

اس کا ایک قول یہ بھی ہے ''عاقل ہمیشہ اپنی علمیت کو محدود سمجھتا ہے، اسے تواضع اختیار کرتا ہے اور جاہل خود کو تمام علوم کا مخزن سمجھتا ہے، اس وجہ سے لوگ اس سے نفرت کرتے ہیں۔

قول ''لا''، یعنی ''نہیں'' بلاؤں کو پھیر دیتا ہے اور قول ''نعم''، یعنی ''ہاں'' نعمتوں کو زائل کر دیتا ہے، گانا سننا گویا سرسلہ کی بیماری ہے، کیوں کہ انسان اس کی وجہ سے آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور بے دریغ پیسہ صرف کرتا ہے اور چند روز میں مفلس اور قلاش ہو کر انتہائی رنج و مصیبت میں جان دیتا ہے۔

ایک ملا سے مقابلہ

یعقوب ایک فلسفی تھا، اس کے فلسفیانہ نظریات تھے، تنگ نظر ملّا ایسے لوگوں کو بے دین سمجھتے ہیں، ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا، شہر بلخ کے ایک ملا کو سخت غصہ آیا، اس نے کندی کے فلسفیانہ نظریات اور خیالات کو دین و مذہب کے خلاف سمجھا، وہ بلخ سے اپنی پارٹی کے ساتھ بغداد آیا اور یعقوب کے خلاف سخت تقریریں کرنے لگا۔

بلخی ملا نے یعقوب کے ناک میں دم کر دیا اور ان کی جان کے لالے پڑ گئے؛ لیکن سنجیدہ اور فراخ دل یعقوب نے دربار میں ذرا شکایت نہ کی؛ بلکہ عاقلانہ طریقہ اختیار کیا یعنی اس بلخی ملا کو اپنے یہاں دعوت دی اور عزت سے بلایا۔

یعقوب کندی نے بلخی ملا کی خوب قدر و منزلت کی، بڑے اہتمام سے اپنے ساتھ کھانا کھلایا اور پھر اسے سمجھایا کہ دین و مذہب اور سائنس و فلسفہ میں کوئی جھگڑا نہیں، نہ تضاد ہے، دین و مذہب ایک خدائی نظام زندگی ہے، وہ پاکیزہ زندگی گذارنے کی تعلیم دیتا ہے اور فلسفہ اور سائنس تو انسان کی عقلی دوڑ ہے، انوکھے خیالات و نظریات ہیں، قرآن پاک بھی عقل سے کام لینے اور تفکر و تدبر پر زور دیتا ہے، لہٰذا ہمیں عجائبات عالم پر غور کرنا اور عقل سے کام لینا چاہئے، ہم قدرت کے اسرار کو کہاں تک سمجھ سکتے ہیں، سوچنا چاہئے۔

اس کے علاوہ یہ ماہر علم طب اور نجوم بھی تھا۔

(۲)حکیم ابونصر محمد بن فارابی (۲۳۸ھ/۹۵۰ء)

حکیم ابونصر محمد بن فارابی فلسفی، ریاضی داں اور ہر علم وفن میں کامل دست گاہ رکھنے والا دانشور تھا، دنیا نے صرف چار اعلیٰ ترین دماغ رکھنے والے اور جامع شخصیتیں پیدا کی ہیں، ان میں ایک فارابی تھا، ابونصر فارابی عالی دماغ سائنس داں اور عظیم مفکر تھا، دنیا نے اسے معلم ثانی کا خطاب دیا، وہ کائنات کا محقق اور تہذیب ومعاشرت اور علمِ اخلاق کا نکتہ داں تھا۔

فارابی اپنے ذاتی شوق اور محنت سے علم وفن کا گہرا مطالعہ کیا اور کمال پیدا کیا، اس نے کبھی عیش وآزادی کی زندگی نہ گذاری، ہمیشہ محنت کا عادی رہا، ترکی لباس کا وہ پابند رہا، سر پر ایک لمبی ٹوپی رہتی تھی، اپنی یہ وضع کبھی نہ بدلی۔

علمی خدمات اور کارنامے

فارابی کا فلسفہ اخلاق

فارابی علمِ اخلاق اور معاشرت پر بڑے اچھے انداز میں بحث کرتا ہے، حکماء میں فارابی پہلا شخص ہے جس نے حیوانات پر غور کیا اور بتایا کہ انسان اشرف المخلوق کیوں ہے؟ انسان کی زندگی کا ایک عظیم مقصد ہے اور وہ عظیم مقصد سعادت کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنا ہے، سعادت یعنی عمدہ اور پاکیزہ خیالات ونظریات اور اعمالِ صالحہ کو ''مکارم اخلاق'' کہتے ہیں، سعادت کی تکمیل مکارمِ اخلاق کا نام ہے۔

علم کیا ہے؟ اور طالب علم کسے کہتے ہیں؟

فارابی علم کی تعریف کرتا ہے، علم اللہ کا نور اور دل کی روشنی ہے

علم کون حاصل کر سکتا ہے؟

ایک طالب علم باکمال اور عالی دماغ اسی وقت بن سکتا ہے جب وہ اپنے دل میں سچا شوق اور سچی لگن رکھتا ہو اور وہ تندرست اور اچھے مزاج کا ہو، وہ عمدہ اخلاق وعادات کا پابند ہو، غور کرنے اور سوچنے کا دل ہو، سچا طالب علم وہ ہے جو دیانت دار، مستعد اور محنتی ہو، وہ وقت کا پابند ہو، قناعت پسند ہو، صاف ستھری سادہ اور پاکیزہ زندگی گذارتا ہو۔

فارابی آگے لکھتا ہے:

انسان علم کو روزی حاصل کرنے کا ذریعہ ہرگز نہ بنائے۔

انسان کو پورا کمالِ انسانیت صرف اچھے علم اور اچھے عمل سے ہی حاصل ہوسکتا ہے، یعنی اس کے اخلاق و عادات اچھے ہوں، شیریں زبان ہو اور عمل بھی اچھا ہو۔

عادت اور اس کا مقصد

ہم خدا کی عبادت کرتے ہیں؛ لیکن کیوں؟ فارابی عبادات پر عالمانہ اور سائنٹفک انداز میں بحث کرتا ہے، یہ اعمال جو روز ہم ادا کرتے ہیں، یہ معاشرہ یعنی سوسائٹی میں لوگوں کو متنبہ اور خبردار کرتے رہتے ہیں، یہ برائیوں سے بچالیتے ہیں اور اللہ تعالی کی خوشنودی کا باعث بنتے ہیں یہ اعمال مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوۃ یہ دیانت داری اور حسنِ اخلاق وغیرہ کی تعلیم دیتے ہیں، ان عبادات سے بندوں کے ایمان میں تازگی آجاتی ہے، ان میں اخوت، مروت اور محبت کے شریفانہ جذبات ابھرتے ہیں، ان کے خیالات اور عقائد پاکیزہ ہوتے ہیں۔

یہ سب سوسائٹی کے اجتماعی نظام کو قائم اور مستحکم رکھتی ہیں اور صحت مند معاشرہ کی نشوونما میں معاون ہوتی ہیں۔

موجوداتِ عالم

فارابی موجوداتِ عالم پر فلسفیانہ انداز میں بحث کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ: موجودات عالم یعنی یہ دنیا اور اس کی سب چیزیں، ان سب کی وہ پہلے تین قسمیں بتاتا ہے، جمادات، نباتات اور حیوانات، پھر ان کے بارے میں وہ عالمانہ انداز میں گفتگو کرتا ہے۔

فارابی حیوانات کو حیاتیات کے نقطۂ نظر سے پیش کرتا ہے (حیاتیات biology) اس حیاتیات کی وہ قسمیں بتاتا ہے اور اسے زندگی کا ارتقاء کہتا ہے کہ یہ اس کا نظریہ ہے یعنی وہ مخلوق جو جان رکھتی ہیں اور ان میں زندگی ہے، وہ جامد اور ساکت نہیں ہے، وہ متحرک ہیں، اس طرح کہ ان میں عاقل ہیں جیسے انسان اور غیر عاقل جیسے جانور۔

انسان عاقل ہے اسے اشرف مخلوق کا درجہ دیا گیا ہے، اس میں ارتقاء بھی جاری

ہے، (دماغی ارتقاء) قدرت نے اس میں ایسی صلاحیتیں رکھی ہیں، وہ غور وفکر کرے گا اور پھر آگے بڑھے گا، چنانچہ یہ عمل جاری ہے، دماغی ارتقاءاس کے تجربات کی بنیاد پر جاری ہےاور جاری رہے گا۔

اشرف مخلوق انسان کا ارتقاء

انسان عاقل ہےاوراللہ نے اسے علم جیسی عظیم ترین نعمت سے نوازا ہے، ”علم الإنسان ما لم يعلم“

انسان اپنی ضروریات کے حصول اور بہترین حالات کی تکمیل کے لئے اجتماعی زندگی گذارنے پر مجبور ہے، وہ معاشرہ اور سوسائٹی سے الگ نہیں رہ سکتا، وہ اپنی سماجی زندگی ہی میں اپنی منزل تک پہنچ سکتا ہے۔

فارابی انسانوں کی اجتماعی زندگی کے ارتقاء کی تشکیل کا تصوراس طرح پیش کرتا ہے،انسان کی سماجی زندگی کےارتقاء کی تشکیل۔

انسان اپنی اجتماعی زندگی میں طبعاً خاندان کی تشکیل کرتا ہے یہ پہلا اجتماع ہے۔

کئی خاندان مل کر جب باہم ان میں تعلقات پیدا ہوجاتے ہیں،قبیلہ کی شکل اختیار کرلیتے ہیں،خاندانوں کا دوسرااجتماع قبیلہ ہے،جوکئی خاندانوں کا مجموعہ ہےاور پھر اپنی ضرورتوں سے مجبور ہوکرکئی قبائل باہم مل جاتے ہیں تو یہ تیسرااجتماع قوم کہلاتا ہے، یہ بہت بڑااجتماع اورارتقاء کی تیسری منزل ہے۔

خاندان کی طاقت محدود ہوتی ہے،قبیلہ طاقتور ہوتا ہےاوراپنی طاقت کے ذریعہ وہ ایک خطۂ زمین پر قبضہ کرلیتا ہےاور پھر بہت سے قبائل مل کر جوایک قوم بن جاتے ہیں، ایک وسیع علاقہ پر قابض ہوجاتے ہیں، وہ اپنا ایک نظم وضبط قائم کرلیتے ہیں، یہ سب اجتماع اپنے افراد کی جملہ ضرورتوں کومہیا کرتے ہیں ان کی حفاظت کرتے ہیں، یہ فطری اورطبعی تقسیم ہے،ان کے نام یہ ہیں، پہلا اجتماع گاؤں ہے،دوسرا قصبہ اوران سب سے بڑا شہر،شہر کی اجتماعی زندگی نہایت وسیع ہوتی ہے،اس لئے وہ بڑے بڑے چشمے اور دریا کے کنارے آباد ہوتا ہے،خاندان،قبیلہ اورقوم یہ تین قسمیں آبادی کی ہوجاتی ہیں۔

قوم کامل ترین انسانی اجتماع ہے

قوم اپنا الگ اور منفرد مزاج رکھتی ہے، ہر قوم دوسری قوم سے عادات واطوار، اندازِ غور وفکر میں الگ ہوگی، ان کے خیالات ونظریات معاشرتی زندگی اور زبان سب باتیں الگ الگ ہوں گی، یہاں تک کہ شکل وصورت میں بھی اقوام عالم ایک دوسرے سے الگ الگ نظر آئیں گی۔

قوم پر آب ہوا کے ہونے والے اثرات

خاندان ابتدائی وحدت ہے، یہ معاشرہ کا ناقص اجتماع ہے، گاؤں نسبتا بڑا اجتماع ہے، مگر یہ بھی نامکمل اجتماع ہے، محدود ہے، ذرائع زندگی محدود ہیں۔

تیسرا اجتماع سب سے بڑا اور مکمل اجتماع ہے، یہ اجتماع شہر کا اجتماع ہے، مدینہ عربی میں اور انگریزی میں سیٹی (city) کہتے ہیں، اس تیسرے اجتماع میں ہر فرد کو ہر قسم کی مناسب سہولتیں حاصل ہوتی ہیں، جملہ ضروریات زندگی کی تکمیل کے سامان مہیا ہوتے ہیں، تہذیب وثقافت کے نوک و پلک یہاں سنورتے ہیں، اس لئے معاشرہ یعنی سماج کی نشو ونما اور صحت مند ترقی کے لئے شہر بہترین جگہ ہے یہ مکمل اجتماع ہے، یہاں ہر طرح کے ذرائع ہیں جن سے انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے۔

شہر کے بھی درجے ہیں، بعض شہر کے لوگ طبعا زیادہ شریف، تعلیم یافتہ اور ذرائع کے سبب زیادہ تجربہ رکھتے ہیں، اس طرح آدابِ زندگی اور اخلاق میں بھی فرق ہوجاتا ہے، زمین اور آب وہوا کے اثرات نہ ہوتے ہیں۔

شہروں میں زندگی کا ہر پہلو نمایاں اور واضح ہوتا ہے، ہر قسم کے لوگوں سے ملنے جلنے کے مواقع فراہم ہوتے ہیں، ان میں مسائل ومعاملات کے سلسلے میں خیالات کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے، ہر قسم کے تجربے ہوجاتے ہیں، صلاحیتیں ابھرتی ہیں، جدت پسند دماغ اور حوصلہ مند افراد نئے نئے نظریئے قائم کرتے ہیں، زندگی کا ہر پہلو نشو ونما پاتا رہتا ہے اور یہ ارتقاء برابر جاری رہتا ہے، جس سے انسانیت کو فروغ حاصل ہوتا رہتا ہے اور تہذیب وتمدن کو ترقی کا موقع ملتا رہتا ہے۔

فارابی گاؤں اور شہر کی تنظیم پر آگے لکھتا ہے:

''شہروں میں محلّہ ہوتے ہیں، اور یہ سب مجھے باہمی تعاون کی بنیاد پر شہری آبادی کی تکمیل کرتے ہیں، گویا یہ محلے شہر کے جزو ہیں اور انتظامی حیثیت رکھتے ہیں، شہر ایک جسم اور محلّہ دیگر انتظامات اس کے ضروری حصے اور اعضاء ہیں جن سے شہر سجانے کی تکمیل ہوتی ہے''۔

گاؤں اور دیہات کم تر درجیں کی جگہیں ہیں، دیہات شہری اجتماع کے لئے قائم ہوتے ہیں اور رفتہ رفتہ دیہات کی حیثیت اب شہر کے خادم کی حیثیت ہوجاتی ہے، جو شہری ضرورتوں کو ایک حد تک مہیا کرتے ہیں اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے۔

انسان، اعلیٰ تمدن اور معاشرت

فارابی ایک محقق اور مفکر کی طرح حیاتیات پر بحث کرتے ہوئے سماجیات پر گفتگو کرتا ہے، وہ علمِ تمدن اور معاشرت پر بحث کرتا ہے:

''انسان اشرف مخلوق ہے؛ لیکن وہ اپنے ماحول اور اپنے نفس کے حالات سے مجبور ہوکر کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہوجاتا ہے، اعلی اور ادنی تمدن رکھنے والے انسان اور ادنی تمدن کے انسان اعلی تمدن رکھنے والے بلند ترین سماج کے لوگ ہیں، وہ زندگی کا شعور رکھتے ہیں''۔

فارابی کہتا ہے:

''اعلی تمدن رکھنے والے شریفانہ اور صحت مند سماج میں وہ لوگ ہیں جو شریف، نیکوکار اور میل ملاپ رکھنے والے ہر حال میں خوش اور مطمئن ہیں، وہاں ہر شہری میں باہم محبت اور مروت کا جذبہ پایا جاتا ہے، ان کا نظریہ زندگی عام انسانی برادری کی صلاح وفلاح ہے''۔

اس اعلیٰ متمدن سماج میں صرف شریف اور نیکوکاروں کو بلند درجہ حاصل ہوتا ہے اور وہاں لوگوں کی عزت اور ان کا احترام ان کے قول وفعل کے سبب کیا جاتا ہے۔

فارابی اب کم تر درجے یعنی غیر متمدن سماج کے لوگوں کے بارے میں بیان کرتا

ہے:

''غیر متمدن اور کم تر سماج کے لوگ وہ ہیں جن میں ادب اور شائستگی کوئی چیز نہیں، ان میں زندگی کا شعور نہیں پایا جاتا، وہ لوگ صرف اپنی غرض اور اپنے مطلب ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں، ایسے سماج میں ان ہی باتوں کو اہمیت حاصل ہوتی ہے''۔

ایسے کم تر سماج کے لوگوں کی زندگی کا مقصد بس یہ ہوتا ہے کہ اپنی پوری طاقت اور قوت صرف دولت اور روپیہ حاصل کرنے اور جمع کرنے پر صرف کیا جائے، ایسے لوگ دولت اور روپیہ سے بے پناہ محبت رکھتے ہیں، اس لئے وہ بخیل بھی ہوتے ہیں، وہ لوگ اچھی شہرت کے کوئی معنی نہیں سمجھتے۔

(۳) امام غزالیؒ

آپ کا اسمِ گرامی ابو حامد محمد بن محمد بن غزالی ہے، عام طور پر آپ کو غزالی سے منسوب کرتے ہیں، آپ اپنے زمانے کے علمائے کلام میں نہایت مرتبت رکھتے ہیں اور مذہب شافعی کے ائمہ میں سے ہیں، آپ کی ولادت خراسان کے ایک شہر طوس میں ۵۴۰ھ ۱۰۵۸ء میں ہوئی، ابتداء میں آپ نے اپنے ہی شہر میں علوم کی تحصیل کی، اس کے بعد مزید تکمیل کے لئے نیشا پور کا قصد کیا، بچپن میں آپ میں اعلیٰ ذکاوت اور غیر معمولی نجابت کے آثار نمایاں تھے، علم کلام اور فنون فلسفہ میں آپ کے کمالِ تبحر کی وجہ سے سلطان شاہ سلجوقی کے وزیر نظام الملک نے آپ کی جانب خاص طور پر توجہ کی اور مدرسہ نظامیہ جس کو اس نے بغداد میں قائم کیا تھا، آپ کو تفویض کیا، اس وقت امام غزالی کا سن پینتیس برس کا تھا اور اس زمانے کے علماء میں آپ کا خاص مرتبہ تھا، کچھ برس بعد آپ نے مدرسہ نظامیہ کو چھوڑ دیا اور حج کے فریضہ کی ادائیگی کے لئے مکہ مکرمہ کا رخ کیا، اس مقدس فرض سے فارغ ہونے کے بعد دمشق و بیت المقدس اور اسکندریہ کی جامع مسجدوں میں درس دیتے رہے، جب آپ اسکندریہ میں تھے اور یوسف بن تاشقین امیر مراکش سے (جو امرائے مرابطین میں سے تھا) ملنے کے لئے مغرب کا رخ کرنے ہی کو تھے کہ ناگاہ یوسف

کے مرنے کی خبر پہنچی، اس لئے طوس کی طرف لوٹے اور حیاتِ فکری کے لئے خود کو وقف کر دیا اور صوفیانہ زندگی گذارنی شروع کی اور بہت سی کتابیں تالیف کیں، جن کی غایت دوسرے ادیان اور فلسفے پر دین اسلام کی فضیلت ظاہر کرنی تھی، اس بناء پر آپ کا لقب فخر الاسلام اور زین الدین تھا۔

آپ کی کتابوں میں سب سے مشہور ''احیاء علوم الدین'' ہے جو علمِ کلام اور اخلاق کی زبردست کتاب ہے، یہ چار ابواب پر منقسم ہے، پہلے میں شعائر مذہبی سے بحث کی گئی ہے، دوسرا ان قوانین سے متعلق ہے کہ جو حیاتِ دنیوی کے حالات سے مختص ہیں، تیسرے ان مہلکات سے بحث کی ہے جن کا ازالہ ضروری ہے اور چوتھے ان منجیات کا ذکر کیا ہے جن کا اکتساب لازمی ہے۔

اس کے بعد آپ نے تالیف کا کام چھوڑ کر نیشاپور کی طرف لوٹے، تاکہ مدرسۂ نظامیہ کی تنظیم کرسکیں، پھر طوس کا رخ کیا اور صوفیوں کے لئے ایک خانقاہ بنوائی اور آخری ایام عبادت اور غور وفکر میں گذارے اور ۵۰۵ھ، ۱۱۱۱ء میں رحلت فرمائی۔

امام غزالیؒ اور فلسفہ

امام غزالی فلسفہ اور فلسفیوں پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''دہریئے سب سے قدیم فلسفی ہیں، انہوں نے ایک ایسے صانع کا انکار کیا جو مدرسہ عالم اور ذی علم وذی قدرت ہو، ان کا خیال یہ ہے کہ عالم بنفسہ ازل سے موجود ہے، اس کا کوئی صانع نہیں''۔

ہمیشہ نطفہ سے حیوان اور حیوان سے نطفہ پیدا ہوتا ہے، اب تک ایسا ہی ہوتا رہا اور آئندہ بھی اسی طرح ہوتا رہے گا۔

دوسرا گروہ طبعیین کا ہے، اس گروہ کے مباحث زیادہ تر علمِ طبعیات اور حیوانات کی تشریح کے بجائے عجائبات سے متعلق ہوتے ہیں اور اعضائے حیوانات کی تشریح کے علم میں بھی بہت کچھ غور وخوض کرتے ہیں، ان کا خیال یہ ہے کہ روح فانی ہے اور پھر زندہ نہیں ہوتی، انہوں نے آخرت، جنت، دوزخ، قیامت اور حساب کا بھی انکار کر دیا

اور بے لگام ہو گئے اور بالکلیہ خواہشات نفسانی میں منہمک ہو گئے۔

تیسرا گروہ غزالی کہتے ہیں کہ: الٰہیین کا ہے اور یہ متاخرین سے ہیں، جیسے سقراط جو افلاطون کا استاذ ہے اور افلاطون جو ارسطو طالیس کا استاذ ہے اور ارسطو ہی نے ان کے لئے منطق کو ترتیب دیا اور تمام علوم میں کانٹ چھانٹ کی، ان میں جو خامیاں تھیں، ان کو رفع کیا اور جو علوم ابتدائی منزل میں تھے انہیں مرتبہ کمال تک پہنچایا، ان الٰہیین نے پہلے دو گروہوں (طبعیہ اور دہریہ) کی تردید کی اور ان کی کمزوریوں کو ظاہر کیا اور ان خرابیوں کو ظاہر کیا جن کی طرف دوسروں نے توجہ نہیں کی تھی، اس کے بعد ارسطو طالیس نے افلاطون اور سقراط اور ان سے قبل کے الٰہیین کی پوری پوری تردید کی؛ یہاں تک کہ ان سب سے برأت حاصل کر لی۔

یہ عجیب بات ہے کہ امام غزالیؒ نے فلاسفہ یونان خاص کر ارسطو کی فضیلت کا اعتراف کیا ہے؛ لیکن اس کے ساتھ فلاسفہ اسلام کی ان کی اتباع کی وجہ سے مذمت کی ہے اور فرمایا کہ ''فلاسفہ اسلام میں کسی نے ان دو شخصوں یعنی فارابی اور ابن سینا کی طرح ارسطو کے ترجمہ کا کام نہیں کیا اور ان کی یہ رائے ابن رشد کے ظہور سے پہلے کی ہے۔

جب امام غزالیؒ نے علوم فلسفہ پر غور و فکر کرنے سے فراغت حاصل کی اور ان میں سے جو کچھ لینا تھا لے لیا اور جن چیزوں کو چھوڑنا تھا چھوڑ دیا تو اس کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ کمال مقصود کے لحاظ سے فلاسفہ کے علوم ناکافی ہیں، پس انہوں نے مذہب تعلیمی (یعنی باطنیہ) اور اس کی خرابیوں پر بحث کی۔

بہر حال آخر میں غزالی نے اس مسلک کی جانب توجہ کی جو قدرت نے ان کی خلقت میں رکھا تھا اور وہ طریقۂ صوفیاء ہے، انہوں نے اس کی طرف اپنی پوری ہمت کے ساتھ توجہ کی، رذائل اور مذموم صفتوں سے پاک وصاف کرنے یہاں تک کہ اس کے ذریعہ اس کی ایسی حالت ہو جائے کہ قلب غیر اللہ کے خیالات کو بھلا دے، امام غزالی کے خیال کے مطابق علم عمل سے آسان ہے، پس انہوں نے صوفیاء کی کتابیں پڑھیں اور ان کے رسائل کا مطالعہ کیا جن میں سے اہم کتب ابی طالب مکی، حارث محاسبی اور جنید، شبلی

اور بسطامی کے منقولات ہیں اور جن امور کی تحصیل ممکن تھی ، ان کو غزالی نے مطالعہ اور سماع کے ذریعے سے حاصل کیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ صوفیاء کی اہم خصوصیات وہ ہیں جن کا حصول صرف مطالعے سے ممکن نہیں ؛ بلکہ ذوق ، حال اور صفات کے بدلنے پر موقوف ہے، اور دوسری صورت یہ ہے کہ وہ حقیقت میں تندرست سیر اور سرمست ہے، ان دونوں حالتوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے، جو کوئی بھی صوفیاء کی حقیقت پر بحث کرے اس کو یقینی طور پر اس امر کا علم ہوگا کہ یہ لوگ صاحبِ حال ہیں نہ کہ صاحبِ مقال۔

(۴) ابن باجہ (۵۳۳ھ)

ابن باجہ کا نام ابوبکر محمد بن یحیی اور لقب ابن صائغ یا ابن باجہ ہے، قرونِ وسطی کے مغربی علماء اسلام اس کو (ayempace) ازمپاس کے نام سے جانتے ہیں ، یہ اندلس کے مشہور علماء میں سے ہے، اس نے طب ، ریاضیات اور فلکیات میں ناموری حاصل کی ، موسیقی اور خاص کر عود کے بجانے میں کمال رکھنے کی وجہ سے وہ فارابی کے مشابہ ہے، اس کی وفات سرقصہ میں گیارہویں صدی عیسوی کے آخر میں ہوئی ، جب سن بلوغ کو پہنچ گیا تو ۱۱۱۸ء میں اس نے اشبیلہ کا رخ کیا اور یہاں سکونت اختیار کر لی اور منطق کی کتابوں کی تالیف کے لئے خود کو وقف کر دیا ، ان میں سے ایک کتاب اسکوریال کے کتب خانے (۶۰۹ عدد کے تحت) موجود ہے اور اس نے اس کی تدوین سے چوتھی شوال ۵۱۲ھ میں فراغت حاصل کی۔

ابن باجہ کے اشبیلہ منتقل ہونے کا سبب تحقیق کے ساتھ معلوم نہیں ، ممکن ہے کہ وہ فونس اول کے مدینہ سرقصہ کو (۲۱۵ء) میں فتح کرنے کے بعد اشبیلہ کی جانب ہجرت کرنے پر مجبور ہوا، بہر حال دوسرے عرب مہاجرین کی طرح ابن باجہ نے بھی ہجرت کی اور ایک عرصے تک یہاں مصروف رہا، اس کے بعد اس نے غرناطہ کا رخ کیا اور وہاں کچھ زمانے تک مقیم رہا، اسکے بعد مغرب کی طرف کوچ کیا اور امرائے مرابطین کے ہاں ایک خاص رسوخ اور عزت حاصل کر لی۔

ابن باجہ نے ۵۳۳ھ بمطابق ۱۱۳۸ء میں وفات پائی، اس وقت بالکل نوجوان تھا۔

ابن باجہ کی تالیفات کا ابن ابی صبیعہ نے ذکر کیا ہے، ان میں سے بعض طب، ریاضیات اور حکمت پر ہیں اور بعض طبعیات، حوادث پر جو ارسطو کی بعض کتابوں کی شروحات ہیں، چند کتابیں بدایہ اور نہایہ ہیں، ایک کتاب حیوانیات پر ہے، البتہ ایسی کتابیں جن کی تکمیل نہیں ہوئی اور جن کا ابن طفیل نے ذکر کیا ہے، اکثر منطق پر ہیں، اسکو ریال کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں، اس طرح اس کا ایک رسالہ نفس ہے اور ایک ''تدبیر موحد'' ہے۔

ایک رسالہ اتصال پر ہے اور ایک رسالہ وداع ہے، جن میں ان عوامل سے بحث کی گئی ہے، جو انسان پر اثر انداز ہوتے ہیں، اور عقل کو فکر کی جانب متوجہ کرتے ہیں، اس کے ساتھ وجود اور علم کی غرض وغایت کی بھی تشریح ہے اور ان دونوں مقاصد تقریب فی اللہ اور عقل فعال سے اتصال حاصل کرنا (جو خدائے تعالیٰ کی ذات ہی سے صادر ہوتی ہے) قرار دیا ہے، اس کے بعد مؤلف نے چند مبہم کلمات خلود نفس کے متعلق لکھے ہیں اور اس مذہب کی تخم ریزی کی ہے جس کی آب یاری بعد میں چل کر ابن رشد نے کیا ہے، یہ عقیدہ ''وحدۃ النفوس'' کا ہے۔

ابن باجہ نے رسالہ وداع ایک طویل سفر سے قبل لکھا تھا اور اس کو اپنے ایک شاگرد اور دوست کے ہاں بھیجا تھا کہ اہم مسائل کے متعلق جو کچھ بھی اس کے خیالات تھے وہ اس کے نزدیک واضح دلیل بن جائیں۔

رسالہ وداع کے مطالعہ کرنے والے پر ظاہر ہوگا کہ مؤلف کا علم اور فلسفے کے اصول کے احیاء کی جانب ایک خاص میلان ہے، کیوں کہ اس کے خیال کی رو سے یہ دونوں انسانوں کو اس کے طبیعی امور کے احاطہ کرنے میں رہنمائی کرسکتے ہیں اور اس میں عقل فعال سے جو اتصال ہے اس کے علم کی طرف ہدایت کرتے ہیں۔

(۵) ابن رشد (abul walid mohammad ibn rushd)

ابن رشد بمقام قرطبہ ۵۲۰ھ بمطابق ۱۱۰۶ء پیدا ہوا، ابو الولید کنیت، محمد نام اور احمد بن رشد کا فرزند تھا، باپ اور دادا دونوں اندلس میں عہدۂ قضاء پر مامور تھے، یہ

خاندان علمی اور دنیاوی حیثیت سے ممتاز تھا، اسی ذی علم وکمال خاندان میں ذہین وہونہار ابن رشد کی تعلیم وتربیت پر خاص توجہ نے اس کی خداداد صلاحیتوں اور خوبیوں کو نکھار دیا، فاضل استاذ ابی محمد بن رزق سے قرآن پاک کی تعلیم اور علم فقہ وحدیث میں کمال حاصل کیا، عقلی علوم میں استاذ ابن طفیل کے روبروزانوئے ادب تہہ کیا، کم عرصہ میں ہی نوعمر ابن رشد کے علم وفلسفہ کا شہرہ اندلس میں پھیل گیا اور علم توحید، فلسفہ طب اور ریاضیات میں وہ اپنے وقت کا بے مثل عالم تسلیم کیا گیا، نوجوانی میں مراقش اور اسپین کے درباروں میں غیر معمولی رسوخ حاصل کیا تھا۔

امام غزالی کے شاگرد محمد بن تومرت نے اندلس کی سلطنت وحشمت اپنی صلاحیتوں اور محنت سے حاصل کی تھی، اسی خاندان کے دو نہایت طاقتور فرماں رواں ابو یعقوب یوسف اور اس کا بیٹا یعقوب المنصور کے درباروں میں ابن رشد کا آفتاب علم وحکمت چمکا اور کئی اہم عہدوں پر مامور ہوا، اپنی اعلیٰ علمی صلاحیتوں کی بناء پر ۵۶۵ء میں شہر اشبیلہ کا قاضی مقرر ہوا، اس جلیل القدر عہدے پر رہتے ہوئے اور مقدمات قضاۃ کی کثرت اور دور دراز علاقوں کی دوروں کی مصروفیت کے باوجود تصنیف وتالیف کا کام جاری رہا، ارسطو کی مشہور کتاب ''الحیوان'' کی شرح لکھی اور حکیم بطلیموس کی مشہور کتاب ''مجسطی'' کا بھی خلاصہ لکھا، دنیائے اسلام کے مشہور عالم دین امام غزالی کی ڈیڑھ سو سال قبل لکھی ہوئی ''تھافۃ الفلاسفہ'' کے جواب میں ابن رشد نے کتاب ''تہافۃ الفلاسفہ'' لکھی۔

ابن رشد کے علم وکمال کا شہرہ اس کے عہد میں ہی اندلس کی سرزمین اور افریقہ کے ریگستانوں سے ہوتا ہوا ممالک شرقیہ تک جا پہنچا، عوام میں اس کی مقبولیت اور خواص میں اس کی قدر ومنزلت عروج پر تھی، اس کے عظیم کارناموں کا علمی چرچا زبان زدِ عام وخواص تھا، ایسے میں کچھ درباری علماء اور امراء میں حسد وعناد پیدا ہوا اور ابن رشد کی غیر معمولی شہرت وعزت سے اس کے دشمن ہوئے، ابن رشد کے فلسفیانہ خیالات اور عقلی دلائل ان معاصر علماء کی سمجھ میں نہ آنے پر انہوں نے کفر والحاد کا فتویٰ دیا اور سلطان المنصور کو ابن رشد کی جانب سے بدظن کیا، چنانچہ اس عظیم مفکر اور عالم کو شہر بدر کر کے ایک

گاؤں بوسنیا میں قید کر دیا۔

نظر بندی کے دوران وہ درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں مصروف رہے، مسلمانوں کے ساتھ یہودی طلباء بھی تھے، ابن رشد کی محبت علمی سے فیضیاب ہوئے، جن کے ذریعہ یورپ کے گوشوں میں ابن رشد کے علم وفن کا نور پھیلا، یہودی دانشوروں نے ابن الرشد کی کتابوں کا عبرانی اور مغربی زبان میں ترجمہ کیا، اس کی گراں قدر علمی تفصیل وتشریح سے ارسطو کے مشکل فلسفے علمائے یورپ میں معروف ہوئے، علم طب وریاضی میں اس کے معرکۃ الأراء کارنامے علم وحکمت کی دنیا میں نئے نئے انکشافات لائے، اس کی مشہور کتاب ''الکلیات'' کا عبرانی ترجمہ آج بھی یورپ میں موجود ہے۔

ابن رشد کی بے مثال اور اعلیٰ قدر علمی کاوشوں اور فلسفوں سے عہد کے چند حکمرانوں کی بدظنی اور بیزاری کے باعث علمائے مشرق اس سے فیضیاب نہ ہوسکے، جب کہ مغربی ممالک میں اس کی کتابیں مقبول ہوئیں اور اہل یورپ ابن رشد کے فلسفوں اور علمی کارناموں سے فائدہ اٹھاتے رہے۔

تقریباً سات سال قید وبند میں رہنے کے بعد ۱۱۹۸ء میں باعزت رہا ہوکہ سلطان المنصور کے دربار کی زینت بنا اور عزت وحرمت کے ساتھ مراقش میں رہنے کے بعد ۱۱۹۸ء میں باعزت رہا ہوکر سلطان المنصور کے دربار کی زینت بنا اور عزت وحرمت کے ساتھ مراقش میں اسے سابقہ رتبہ حاصل ہوا؛ لیکن زندگی کا سفر ختم ہو چلا تھا، ۱۱ر ستمبر ۱۱۹۸ء کو یہ عظیم مفکر، طبیب، علم ریاضی اور فلسفہ کا ماہر اس جہان فانی سے کوچ کر گیا۔

کہتے ہیں کہ: ابن رشد کی تصانیف بکثرت تھیں؛ لیکن زمانے کے نازیبا سلوک سے بیشتر قیمتی سرمایہ علمی ضائع ہوگیا، چند کتابوں کے عبرانی ولاطینی ترجمے باقی رہے، دانشوران یورپ کو ارسطو کا ترجمان مانتے تھے، یکے بعد دیگرے اس کو یورپی شاگردوں نے اول شہر طلیطہ آکر ابن رشد کی تصانیف کو جمع کیا، شاہ جرس نے بھی ان علمی کاوشوں کی قدردانی کی، بعد کے ادوار میں بہت سے فلسفیان یورپ ابن رشد کے پیرو ہوئے، حتی کہ اس کی غیر معمولی شہرت سے حسد کرنے والے عیسائی علماء بھی اس کی علمی قابلیت وذہانت

کے معترف تھے۔

چرچ کے اراکین نے جیسا کہ مؤرخین نے لکھا ہے کہ: کلیسا کے مروجہ طریق کی عوامی مخالفت کے پیش نظر علم وحکمت کی تعلیم کوممنوع قرار دیا، اوران عیسائی علماء کو جنہوں نے ابن رشد کے علوم سے استفادہ کیا واجب سزا قرار پائے ، ان سیاہ ایام میں بھی چند عیسائی دانش وروں نے چرچ کی ان سخت گیر نظریئے کے خلاف پروٹسٹنٹ فرقہ کی بنیاد ڈالی ، اس طرح یورپ میں ابن رشد کے فلسفوں کو دین عیسوی کے مروجہ فکر ونظر کے برخلاف حاصل کیا، اس طرح یورپ کے ایک طبقہ میں علمی بیداری پیدا ہوئی اور وہ علوم وفنون کی جانب راغب ہوئے۔

یورپ کے اکثر شعراء نے ابن رشد کو اقلیدس ، بطلیموس اور جالینوس کی طرح میدان علم وحکمت کا قابل تعظیم قرار دیا، عیسائیوں کا ایک فرقہ جس کا نام فرانسسکن تھا، ابن رشد کے خیال ونظریات علمی کا قائل اور معتقد تھا، سترہویں صدی تک کہتے ہیں کہ ابن رشد کو ارسطو سے زیادہ قدر و منزلت حاصل تھی ، بلاد یورپ کے اکثر قدیم طلباء اس کے تلمذ پر فخر کرتے تھے۔(۱)

(۵) ابن خلدون (۷۳۲ء تا ۸۰۸ء)

ابن خلدون جو مشرق ومغرب کے فلاسفۂ تاریخ کا سرتاج ہے ، بمقام تونس ۷۳۲ء پیدا ہوا اور ۸۰۸ء میں بمقام مصروفات پائی ، وہ آٹھویں صدی ہجری کے مشاہیر میں سے ہے، اس کا نام ابوزید عبدالرحمٰن بن محمد بن محمد خلدون ولی الدین التونسی الحضرمی الاشبیلی المالکی ہے۔

اس کا سلسلہ اندلسی خاندان سے ہے جو اشبیلہ سے تونس کی طرف ہجرت کی ، ابن خلدون کے اجداد نے ساتویں صدی ہجری کے وسط میں اشبیلہ سے تونس کی طرف ہجرت کی ، ابن خلدون کے اجداد کا نسب قبائل یمن سے بنی وائل تک پہنچتا ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ اس کے جد اعلیٰ نے یمن سے اندلس کی جانب تیسری صدی ہجری میں ہجرت کی۔

---

(۱) موسوعة علماء العرب والمسلمين : الموسسة العربية ، بيروت

ابن خلدون نے تونس میں نشو ونما پائی اور وہیں علوم مروجہ کی تحصیل کی، کچھ عرصے بعد ابن خلدون کو وباء کے خوف سے تونس چھوڑنا پڑا، اس نے ہوارہ کی طرف رخ کیا اور وہاں پہنچ کر اس شہر کے حاکم ابن عبدون کے ہاں اقامت اختیار کی جس نے اس کا پر جوش استقبال کیا اور بلادِ مغرب کے سفر کے لئے اس کی امداد کی، ابن خلدون نے ابن بطوطہ کی طرح اوائل عمر ہی میں اکثر ممالک کی سیاحت کی ہے، ۷۵۵ء میں سلطان ابوعنان المرینی والی تلمسان نے اس کو اپنے یہاں فارس میں طلب کیا، اس وقت اس کی عمر تقریباً تیس سال تھی، بادشاہ نے اس کی بہت کچھ قدر و منزلت کی اور عہدۂ کتابت اس کے لئے تفویض کیا، لیکن سلطان کے اس حسن سلوک سے اس کے ہم عصروں کے دل میں جو اس سے کم درجے پر تھے آتشِ حسد بھڑک اٹھی، انہوں نے سلطان کے ہاں اس کی شکایت کی اور یہ الزام لگایا کہ وہ محض اپنے مکر وفریب کے ذریعے سلطان پر حاوی ہو گیا ہے، پس سلطان نے اس کو قید کر دیا، لیکن اس طرح جیسے کہ مستعمرات میں جیسے خلفاء قید کر دیئے جاتے ہیں، بالآخر ابوعنان المرینی والی تلمسان ۷۵۹ء میں وفات پائی، اس کے بعد وزیر ابن عمر نے ابن خلدون کو نہ صرف آزاد کر دیا؛ بلکہ اس کو خلعتوں سے سرفراز کیا اور اس کے ساتھ ہمیشہ حسنِ سلوک سے پیش آتا رہا۔

۷۶۰ء میں سلطان ابو سالم المرینی نے ابن خلدون کو اپنے ہمراہ لئے ہوئے سرزمین فارس داخل ہوا اور اس کو اپنا پرائیویٹ سکریٹری بنالیا، ابن خلدون نے اس فریضے کو جو اس کے ذمے کیا گیا تھا بحسن وخوبی انجام دیا۔

۷۶۴ء میں اس نے اندلس کا رخ کیا، غرناطہ پہنچا، وہاں ابوعبداللہ حکمراں تھا، اس نے اس کا شاندار استقبال کیا اور اسے اپنے اعلیٰ محلوں میں سے ایک مکان میں رہنے دیا۔

اسی طرح مختلف بادشاہوں کے اہم مناصب پر فائز رہتے ہوئے آخر میں پھر اپنے اہل وعیال کے ساتھ تلمسان میں اقامت گزیں ہو گیا اور ان کے ساتھ بنی سلامہ کے قلعہ میں جو بنی توجین کے شہروں میں سے ہے، بودوباش اختیار کی اور وہاں چار سال تک رہا۔

اسی اثناء میں ابن خلدون نے اپنی تاریخ لکھنی شروع کی، اس نے پہلے مقدمے کی تکمیل کر لی، اس کے بعد بعض تاریخ کی فصولیں بھی لکھیں، یہ زمانہ تقریباً ۷۸۰ء اور اس کی وفات سے بیس برس قبل کا ہے، اس وقت اس کا سن پچاس برس کا تھا، اب اس کو اپنے وطن تونس جانے کا ارادہ ہوا، اس نے حاکمِ تلمسان سے اجازت چاہی اور ۷۸۰ء میں وطن پہنچا، وہاں کے بادشاہ نے اس کا خاص طور پر احترام کیا اور اس کو اپنا پرائیویٹ سیکریٹری بنالیا، اور اپنی تالیف کی تکمیل پر آمادہ کیا، پھر اس نے مصر کا قصد کیا، قاہرہ میں جامع ازہر میں مالکی فقہ کی تعلیم دینی شروع کی، جب یہ خبر سلطان مصر برقوق عظیم کو پہنچی تو اس کو اپنے ہاں بلایا اور بہت آؤ بھگت کی اور اسے ۷۸۶ء میں مالکی مذہب کا قاضی مقرر کیا، اس نے منصبِ قضاء کو بااحسن وجوہ انجام دیا۔

ابن خلدون نے اپنے اہل وعیال کو تونس بلوایا بھیجا کہ ان کے ساتھ قاہرہ میں گذارے، لیکن اثنائے راہ میں یہ تمام غرق ہوگئے، اس صدمہ جانکاہ نے اس کی کمر توڑ دی، چنانچہ اس نے منصبِ قضاء سے علاحدگی اختیار کر لی اور تدریس وتالیف کے لئے خود کو وقف کر دیا، اس حالت میں تین برس گذارے، اس نے ۷۸۹ء میں قاہرہ سے فریضہ حج کی ادائیگی کے لئے حجاز کا رخ کیا، پھر دوسرے سال مصر لوٹا اور اپنی کتاب کی تصنیف میں مشغول ہوگیا اور ۷۹۷ء میں اس کی تکمیل کر دی، اس وقت اس کی عمر ۶۵ سال تھی اور وہ پندرہ برس تک اس کام میں مشغول رہا۔

اس طرح ایک عرصہ تک مصر میں مقیم رہا، پھر بالآخر ۸۰۸ء میں اس نے وفات پائی اور وہیں کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔

ابن خلدون کی تالیفات

ابن خلدون نے علماء اور مفکرین میں نہ صرف ایک کتاب کی وجہ سے شہرت حاصل کی؛ بلکہ اس کتاب کے ایک ہی جز کی وجہ سے اور وہ اس کا مقدمہ ہے، اس کی تاریخ کا پورا نام یہ ہے، "والعبر وديوان المبتدأ والخبر في أيام العرب والعجم والبربر ومن عاشرهم من ذوي السلطان الأكبر" یہ تین کتب اور رسائل

ومجلدات پر منقسم ہے۔

کتاب اول: اس میں عمرانیات اور عوارض ذاتیہ سے بحث کی گئی ہے، جو اس میں عارضی ہوتے ہیں، جیسے ملک، سلطنت، کسب معاش، صنائع، علوم اور ان کے علل واسباب ، یہی کتاب اور اس کا وہ مقدمہ ہے جو مشہور عام ہے، یہ تقریبا (۴۰۰) صفحات پر مشتمل ہے، اسی نے ابن خلدون کو ایک نہایت اعلی مرتبہ پر فائز کر دیا؛ کیوں کہ اس نے اس میں جدید مباحث پر روشنی ڈالی ہے جس کو اس زمانہ میں علومِ اجتماعی، سیاسیات، اقتصاد سیاسی، اقتصاد اجتماعی، فلسفہ تاریخ، قانونِ عام وغیرہ سے تعبیر کیا ہے، ہمارے خیال میں ہیگل، جرمن فلسفی میکاوی، اطالوی عالم سیاسیات گبن، انگلستانی مؤرخ بلاش ہب ابن خلدون کے تلامذہ میں شمار کئے جاسکتے ہیں۔

ابن خلدون آٹھویں صدی ہجری (چودھویں صدی عیسوی) میں گذرا ہے، ان مباحث پر اس نے اس وقت اپنے زرّیں خیالات کا اظہار کیا جب کہ اہل یورپ پردۂ غفلت میں پڑے ہوئے تھے، عربوں میں سے ان مسائل پر کسی نے کچھ نہ لکھا تھا، قطع نظر ان چند منتشر خیالات کے جن کو کوئی اہمیت نہیں، برخلاف اس کے ابن خلدون نے ان مباحث پر کافی شرح وبسط کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، واقعات کا باہمی موازنہ ومقابلہ کر کے ان سے نتائج اخذ کئے اور ان علل سے بحث کی جن سے اس نے ذاتی مطالعہ یا شخصی تجربے کی بناء پر واقفیت حاصل کی تھی۔

مقدمہ ابن خلدون پر ایک نظر

مقدمے کی پہلی فصل میں زمین اور اس کے شہروں کی آبادی، انسان کے رنگ واخلاق میں آب وہوا کی تاثیر، تمول وافلاس کی وجہ سے آبادی کے حالات میں اختلاف اور ان آثار سے بحث کی گئی ہم جو انسان کے بدن اور اخلاق پر مرتب ہوتے ہیں۔

یہ بحث اس مسئلے سے بہت کچھ مشابہ ہے جس کو آج علمائے یورپ نے ابن خلدون کے پانچ سو برس بعد نشو وارتقاء کے نظریئے کی صورت میں پیش کیا ہے۔

دوسری فصل میں بدوی آبادی اور وحشی قبائل واقوام پر روشنی ڈالی گئی ہے، نیز ان

مباحث کو بھی پیش کیا ہے جو بداوۃ وحضارۃ (دیہاتی وشہری) کی طبیعتوں کے متعلق پیدا ہوتے ہیں اوران دونوں کے درمیان نسب، عصبیت، ریاست، حسب، ملک اور سیاست کے اعتبار سے امتیاز کیا ہے۔

یہ بحث نظام اجتماعی کے ان قواعد کی جنس سے ہے جس کا ظہور یورپ میں انیسویں صدی میں ہوا، جس کو ہمارے معاصرین نے سوشیالوجی (عمرانیات) سے تعبیر کیا ہے۔

تیسری فصل میں دول عامہ، ملک، خلافت، سلطانی مراتب سے بحث کی ہے اور سیادت کے اسباب کے استحکام کی توجیہ کی ہے، نیز امارت کے تحفظ کے طریقے، حکومت وخلافت کے شرائط، بادشاہوں کے خصائل، بیعت کا مفہوم، ولایت عہد، سلطان کے مراتب، سلطنت کے دواوین، فوج اور اس کے اصول، جنگ کے قواعد اور سلطنت کے عروج وزوال کے اسباب کو واضح کیا ہے۔

یہ بحث علمی اور عملی سیاسیات سے ہے، انگلستانی مؤرخ گیلن نے ایک کتاب ''دول سلطنة انخلال وسقوط'' (the decline and fall of koman mempire) کے اسباب پر لکھی ہے، اس میں اس نے اسی ملک کو اختیار کیا ہے جس کو ابن خلدون نے اپنے مقدمے میں پیش کیا تھا۔

چوتھی فصل میں شہروں، مختلف آبادیوں، ان کے تمدن اور عمارتوں اور مملکتوں سے ان کے تعلق کو واضح کیا گیا ہے، اور ان امور پر روشنی ڈالی گئی ہے جن کو بری و بحری حیثیت سے تکوین وتشکیل میں پیش نظر رکھنا ضروری ہے، نیز مساجد اور مکانوں کی تعمیر سے بھی بحث کی گئی ہے، اس بحث کا تعلق ہندسہ حربیہ سے ہے۔

پانچویں فصل میں معاش اور کسب وصنائع کے اعتبار سے اس کی مختلف صورتوں سے بحث کی گئی ہے، اس میں رزق اور کسب کے مسائل ہیں اور بتلایا گیا ہے کہ یہ اعمال بشری کا ماحصل ہیں، اسکے بعد معاش اور اس کے اقسام وطرق اور طبیعت عمران سے اس کے تعلق کو واضح کیا گیا ہے، اس میں رزق کے مختلف طریقوں مثلاً تجارت، صنعت اور ان کے مختلف اقسام کی بھی تفصیلی بحث ہے، نیز اس زمانے کے اصول صنعتوں جیسے زراعت،

تعمیرات، پارچہ بافی وخیاطی اور توالد وتناسل، طب، باغبانی، موسیقی وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے۔

یہ وہ مباحث ہیں جن کو اس دور کے لوگ اقتصادی سیاسی اور اقتصادی اجتماعی سے تعبیر کرتے ہیں، اس فصل کے اکثر مبادیات وہ بنیادی اصول ہیں جن پر کارل مارکس کی کتاب ''رأس المال'' (das capital) پر مشتمل ہے۔

چھٹی فصل علوم اوران کے اقسام، تعلیم اور اس کے طریقوں اور مختلف صورتوں پر مشتمل ہے، اس میں تعلیم کے مباحث اور حضارۃ سے اس کا تعلق بتایا گیا ہے، ہر علم سے انفرادی طور پر بحث کی گئی ہے، ہر ایک کی تاریخ اور اس کے شروط بتلائے گئے ہیں، جیسے علوم قرآن وحدیث، فقہ، علومِ لسانیہ، طبعیات، ریاضی، طب، ادب، تاریخ الہیات، علم النفس، علوم نجوم، علوم سحر۔

یہ مباحث علم تربیت کے قبیل سے ہیں، جن کے ماہرین امریکہ میں ولیم جیمس اور یورپ میں اسپنسر اور ڈنیل وغیرہ ہیں، ابن خلدون کے اسلوب کے متعلق اس کتاب میں موقع کے لحاظ سے بحث کی جائے گی۔

اس مقدمے نے مفکرین یورپ کو یہاں ایک خاص اہمیت حاصل کرلی ہے، علامہ کاترمیہ نے اس کا پیرس کے قومی کتب کے نسخے سے فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا ہے، یہ فرانسیسی ترجمہ انیسویں صدی کے نصف ثانی کے اوائل میں طبع ہوا، اس کی بعض فصول کا ترجمہ انگریزی، جرمنی، اطالوی اور ترکی زبانوں میں بھی کیا گیا، یورپ کے تمام بڑے کتب خانوں میں اس کے مطبوعہ قلمی نسخے پائے جاتے ہیں۔
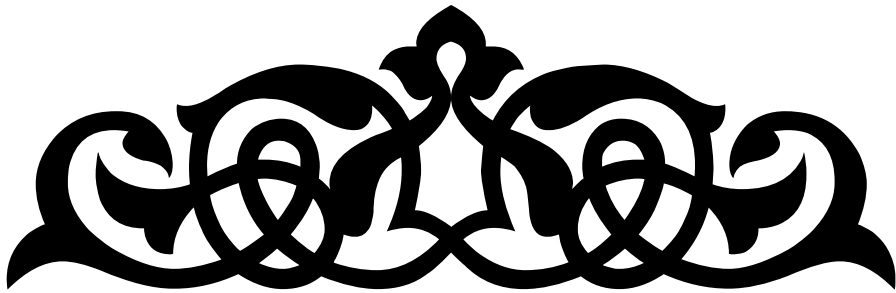
عربی کتابیں

- القرآن الکریم
- صحیح بخاری، محمد بن اسماعیل البخاری — دار ابن کثیر بیروت
- صحیح مسلم، مسلم بن حجاج القشیری — دار احیاء التراث العربی
- مسند أبی یعلی، احمد بن علی — دار المأمون للتراث، دمشق
- المستدرک، ابو عبداللہ حاکم النیشافوری — دار الکتب العلمیۃ، بیروت
- شعب الإیمان، احمد بن حسن البیہقی — دار الکتب العلمیۃ، بیروت
- طبقات ابن سعد، محمد بن سعد بن منیع — دار صادر، بیروت
- کنز العمال، علی بن حسام الدین المتقی — موسسۃ الرسالۃ، بیروت
- المعجم الکبیر للطبرانی، ابو القاسم سلیمان بن احمد — مکتبۃ الزہراء، موصل
- مرقاۃ المفاتیح، علی بن سلطان القاری — دار الکتب العلمیۃ، بیروت
- کشف الخفاء، اسماعیل بن احمد الجراحی — دار احیاء التراث العلمی
- فیض القدیر، عبد الرؤف المناوی — دار الکتب العلمیۃ
- مجموع فتاوی ابن تیمیہ — دار الوفاء، بیروت
- لفقیۃ والمتفقہ — دار ابن الجوزی السعودیۃ
- إحیاء علوم الدین — دار المعرفۃ، بیروت
- ماذا قدم المسلمون إلی العالم — د-راغب السرجانی
- موسوعۃ علماء العرب والمسلمین — د-محمد فارس

- معجم علماء العرب — د-کورکیس عود
- أخبار القضاة، ابوبکر محمد بن خلف الملقب بوکیع — المکتبة التجاریة الکبري، مصر
- عیون الأنباء فی طبقات الأطباء، ابن أبی صبیعه — دار مکتبة الحیاة، بیروت
- تهذیب الکمال، عبدالرحمٰن المزی — مؤسسة الرسالة، بیروت
- وفیات الأعیان، محمد بن أبی بکر خلکان — دار صادر، بیروت
- شذرات الذہب، عبدالحی بن احمد العکری — دار ابن کثیر، دمشق
- تہذیب التہذیب، ابن حجر العسقلانی — دار الفکر، بیروت
- تاریخ دمشق، علی بن الحسن بن العساکر
- الطرق الحکمیة، ابوعبداللہ شمس الدین المزی — مطبعة المدنی، القاہرة
- البدایة والنهایة، اسماعیل بن عمرو بن کثیر — مکتبة المعارف، بیروت
- تاریخ بغداد، ابوبکر الخطیب البغدادی — دار الکتب العلمیة، بیروت
- تذکرة الحفاظ، ابوعبداللہ شمس الدین الذہبی — دار الکتب العلمیة، بیروت
- تہذیب الأسماء، للنووی — دار الکتب العلمیة، بیروت
- مناقب الإمام الأعظم، للموفق — دائرة المعارف النظامیة، حیدرآباد
- مناقب الإمام الأعظم، للکردری — دائرة المعارف النظامیة، حیدرآباد
- معجم الأدباء، ابوعبداللہ یعقوب الرومی — دار الکتب العلمیة، بیروت
- دور الجامعات الأسلامیہ المطلوب، ابوالحسن ندوی — مجمع الإسلامی العلمی، ندوة العلماء
- تاریخ الخلفاء، علامہ جلال الدین السیوطی — مطبعة السعادة، مصر۔
- کتاب الأذکیاء، لابن الجوزی — مکتبة الغزالی
- حیاة الصحابہ، یوسف الکاندھلوی — موسسة الرسالة، بیروت

اردو کتابیں

- معارف القرآن — حضرت مولانا مفتی شفیع صاحبؒ
- ایک قرآن — حضرت مولانا قاری طیب صاحبؒ

اسلام اور سائنس	حضرت قاری طیب صاحبؒ
دین وعلم کا دائمی رشتہ	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
دین وعلم کی خدمت	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
انسانیت کے زوال کا سبب	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
خطبات مسلم پرسنلا بورڈ (مجلس تحقیقات ونشریات)	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
خطبہ استقبالیہ دینی تعلیمی کنونشن منعقدہ لکھنو	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
مسلمان غیر اسلامی ماحول میں	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
نسل نو کے ایمان وعقیدہ کی فکر کیجئے	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
نظام تعلیم کی اہمیت	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
مسلمانوں کا عروج وزوال	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
مسلمان سائنسدانوں کی علمی خدمات	محمد ابراہیم عمادی
۱۰۰ عظیم مسلم سائنسدان	محمد ابراہیم عمادی، رفیق انجم
سنہرے فیصلے	عبدالمالک مجاہد (مکتبہ دارالسلام)
سنہرے حروف	عبدالمالک مجاہد (مکتبہ دارالسلام)
سنہرے نقوش	عبدالمالک مجاہد (مکتبہ دارالسلام)
سنہری کرنیں	عبدالمالک مجاہد (مکتبہ دارالسلام)
مسلمان فلسفی	میر ولی الدین
ہمارا تعلیمی نظام	حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہ
اسلام اور جدت پسندی	حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ
جہاد	حضرت مفتی شفیع صاحبؒ
سیر الصحابہ	شاہ معین الدین ندوی

تاریخ الطب	حکیم سید حسان نگرامی
سائنسی ترقی میں مسلمانوں کی خدمات	حافظ زاہد علی، (اریب پلیکیشنز)
اسلامی عدالت	حضرت قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمیؒ
اطباء کے حیرت انگیز کارنامے	حکیم عبد الناصر فاروقی (ہمدرد نگر، دہلی)
سوانح شاہ عبد القادر رائے پوری	ابو الحسن الندویؒ (مکتبہ اسلام، لکھنو)
فتاوی رحیمیہ	مفتی عبد الرحیم لاجپوری صاحبؒ
دینی و عصری تعلیم	مولانا سید احمد ومیض ندوی مدظلہ
طب العرب	ایڈورڈ جی، براؤن
ساحل	(میگزین، پاکستان)
ذاکر نائک، ایک تجزیہ، ایک تحقیق	سمیع الحق (مکتبہ عمر فاروق، کراچی)
سب کے لئے مؤف ابن غوری	آئی جی پبلیشرس، حیدرآباد